زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

# ثـالـث

جلد ۔ ۱۰ شمارہ ۔ ۲۷

جولائی ۲۰۲۳ء تا ستمبر ۲۰۲۳ء

**مدیر اعزازی** اقبال حسن آزاد

**مدیر** ثالث آفاق صالح

**تزئین کار**: اعجاز رحمانی

**سرورق**: محمد نعیم یاد (پاکستان)

**رابطہ**: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003

email.eqbalhasan35@yahoo.com

www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔



# فہرست

| | | | |
|---|---|---|---|
| | اداریہ | اقبال حسن آزاد | ۴ |
| | حمد | اقبال حسن آزاد | ۹ |
| | نعت | ارشد عبدالحمید | ۱۰ |
| **غزلیں** | ڈاکٹر ذکی طارق، نوشاد احمد کریمی | | ۱۱۔۱۳ |
| **نظمیں** | سلیم انصاری | | ۱۴ |
| **گوشہ شموئل احمد** | | | |
| **تعزیت** | اظہار تعزیت | ڈاکٹر احسان تابش | ۱۶ |
| **نظمیں** | شموئل احمد سے دو باتیں | مرغوب اثر فاطمی | ۱۷ |
| | شموئل احمد | اقبال مسعود | ۱۹ |
| **انٹرویو** | شموئل احمد سے گفتگو | نثار احمد صدیقی | ۲۰ |
| **یادیں** | شموئل احمد، یادیں، باتیں اور فن | ڈاکٹر ابوبکر عباد | ۲۹ |
| | کچھ یادیں، کچھ باتیں: شموئل احمد | محمد پرویز | ۳۷ |
| **افسانہ** | مرگھٹ | شموئل احمد | ۴۲ |
| **تجزیہ** | شموئل احمد کا افسانہ 'مرگھٹ': تنقیدی جائزہ | ڈاکٹر ریاض توحیدی | ۴۷ |
| **مضمون** | سہیل وحید کی کتاب 'شموئل احمد کی تخلیقیت' ایک تنقیدی نظر | شگفتہ ناز | ۵۳ |
| **گوشہ ڈاکٹر منظر اعجاز** | | | |
| **نظمیں** | خراج عقیدت: ڈاکٹر منظر اعجاز | اقبال حسن آزاد | ۶۳ |
| | آہ منظر اعجاز | مرغوب اثر فاطمی | ۶۴ |
| **مضمون** | ڈاکٹر منظر اعجاز: ہم تجھے بھلا نہ پائیں گے | انوار الحسن وسطوی | ۶۵ |
| | ادیب بے نیاز: منظر اعجاز | ڈاکٹر ابرار رحمانی | ۷۰ |
| | منظر اعجاز: توانا تخلیقی اور تنقیدی ذہن | ڈاکٹر محمد حامد علی خان | ۷۴ |
| **افسانہ** | ہونہہ مسلمان | ڈاکٹر منظر اعجاز | ۸۵ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| **غزلیں** | غزلیں | ڈاکٹر منظر اعجاز | ۹۵ |
| **انٹرویو** | بات کر کے دیکھتے ہیں.....سید محمد اشرف | ڈاکٹر ریشا قمر | ۹۹ |
| **مضامین** | نیر مسعود: فریب خیال کی شعریات | ڈاکٹر اکرم پرویز | ۱۱۶ |
| | جدید انقلابی افکار کا منفرد شاعر: علی سردار جعفری | ڈاکٹر سرفراز احمد خان | ۱۲۸ |
| | اردو زبان کا بدلتا منظر نامہ اور صحافت | ڈاکٹر امام اعظم | ۱۳۲ |
| | شاہد اختر کا افسانوی کینوس | محمد غالب نشتر | ۱۴۰ |
| | نسترن احسن فتیحی کا ناول ''نوحہ گر'' | انجم قدوائی | ۱۴۹ |
| | جیلانی بانو کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی | نازیہ تبسم | ۱۵۵ |
| **افسانے** | اتلافِ عظیم | غازی۔جی۔حسین | ۱۵۹ |
| | عورت کا نشہ | اقبال حسن آزاد | ۱۶۹ |
| | پاگل | عطاء اللہ عالی | ۱۷۴ |
| | قبلہ رخ | بش احمد | ۱۷۷ |
| | آخری خواہش | نجمہ ثاقب | ۱۸۱ |
| | ایک جھوٹی کہانی | محمد یحی ابراہیم | ۱۸۹ |
| **تبصرے** | شفیع مشہدی کے افسانے ر مبصر ڈاکٹر منظر اعجاز، شہر ذات ر مبصر عبدالصمد، | | ۱۹۳ |
| | سہ ماہی عالمی فلک ر مبصر اقبال حسن آزاد، اس شہر میں ر مبصر اقبال حسن آزاد، سہ ماہی فکر و تحریر ر مبصر اقبال حسن آزاد | | ۲۰۶ |
| **ثالث پر تبصرے** | سلیم انصاری، ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، عرفان رشید | | ۲۰۷ |
| **مکتوبات** | ڈاکٹر ذکی طارق، جگ موہن سنگھ، فارحہ ارشد | | ۲۲۳ |


◄◄ ● ►►


ثالث ملنے کے پتے:

بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) 9304888739 +91

اقبال حسن آزاد، شاہ کالونی، شاہ فیملی، مونگیر ۸۱۱۲۰۱




# اداریہ

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی  تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی
(کیفی اعظمی)

شموئل احمد ایک عہد ساز فکشن رائٹر تھے۔ان کا انتقال اردو ادب کے لیے خسارہ عظیم ہے۔وہ عمر میں اور ادبی قد و قامت کے لحاظ سے بھی مجھ سے بڑے تھے اس لیے میں انہیں ہمیشہ ''بڑے بھائی'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔میرے ان سے تعلقات ''کھٹے میٹھے'' رہے۔کھٹے کم اور میٹھے زیادہ۔کبھی تو یوں ٹوٹ کر ملتے تھے گویا میں ان کا کوئی عزیز ہوں اور کبھی خفا ہوتے تو میری اور میرے رسالے کی بخیہ اُدھیڑ کر رکھ دیتے تھے۔'' ثالث شمارہ نمبر۔۶'' میں ان کے سوانحی ناول ''اے دل آوارہ'' پر صفدر امام قادری کا ایک سخت تبصرہ شایع ہوا تو وہ تلملا اُٹھے اور انہوں نے فیس بک پر لکھا کہ ''لوگ پیسے دے کر اپنا نمبر شایع کراتے ہیں، میں پیسے دے کر اپنے خلاف لکھواتا ہوں۔آپ پر تو صفی مقالہ شایع ہو تو احباب نظر انداز کر دینگے۔کوئی نہیں پڑھے گا لیکن خلاف میں ایک سطر بھی شایع ہو آپ چرچے میں ہوتے ہیں۔مجھے افسوس ہے کہ میرے چیلے نے پیسے مار لیے۔میں نے پچیس صفحات کے پیسے دئے تھے۔چیلے نے صرف پندرہ صفحات صرف کیے۔میں اس سادھوی کی طرح افسوس کر رہا ہوں جس نے مسجد میں بم دھماکہ کرایا تھا۔بم ایسی جگہ پلانٹ ہوا تھا کہ کم لوگ مرے۔سادھوی کو یہی افسوس تھا کہ اتنے کم لوگ کیوں مرے۔مجھے بھی افسوس ہے کہ اتنے کم صفحات کیوں؟'' (شموئل احمد)

جواب میں میں نے لکھا کہ:''کسی نے کسی کو پیسے نہیں دئے۔میرے اور بڑے بھائی کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا کہ وہ میرے رسالے ''ثالث'' کے خلاف پرچار کریں گے اور میں اپنے رسالے میں ان کے خلاف مضمون شایع کرونگا۔اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ منفی پرچار سے زیادہ شہرت ملتی ہے۔ (اقبال حسن آزاد) نوٹ: بڑے بھائی کی جے ہو۔یہ طریقہ مجھے انہوں نے ہی سجھایا ہے۔

ایک دفعہ رمضان کے مہینے میں انہوں نے اسٹیٹس لگایا کہ ادب نواز حضرات زکوۃ اور فطرے کی رقم اقبال حسن آزاد کو بھیج دیں تا کہ وہ ''ثالث'' کا اگلا شمارہ نکال سکیں۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود میرے دل میں ان کے خلاف کبھی کدورت پیدا نہیں ہوئی اور جن دنوں وہ مجھ سے اُکھڑے ہوئے تھے میں نے ''ثالث'' میں ان پر گوشہ شایع کرے انہیں حیران کر دیا تھا بلکہ یوں کہیں کہ میں نے انہیں رام کر لیا تھا۔اس کے بعد وہ مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوئے اور نہ ہی میرے

خلاف کبھی ایک لفظ کہا۔ بلکہ میری تعریفیں کرنے لگے۔ ایک دفعہ فرمایا ''اقبال حسن آزاد کی خوبی یہ ہے کہ ادیبوں کا پتہ اور فون نمبر بھی شائع کرتے ہیں اور نئے ادیب کی پزیرائی بھی کرتے ہیں۔ اقبال حسن آزاد فراخ دل ہیں اور بڑے آدمی ہیں۔ انتہائی اچھے ادیب اور انتہائی اچھے مدیر۔ (شموئل احمد، حیدرآباد، انڈیا)

شموئل احمد جب بھی مجھے فون کرتے یہ ضرور کہتے کہ وہ جلد ہی ''ثالث کے لیے زرتعاون ارسال کریں مگر: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

شوکت حیات بھی اسی قسم کے وعدے کیا کرتے تھے مگر وہ وعدے بھی جملے ہی ثابت ہوئے۔

انتقال سے چند روز قبل میری بڑے بھائی شموئل احمد سے فون پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آجکل وہ اپنے نئے افسانوی مجموعے ''لنگی'' کی ترتیب میں مشغول ہیں۔ وہ اسی عنوان کے افسانے کی بے پناہ مقبولیت سے بہت خوش نظر آرہے تھے۔ ان کے لہجے سے جوش ٹپک رہا تھا۔ ان کی گفتگو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب وہ کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں۔

یوں تو دنیا سے ہر نفس کو رخت سفر باندھنا ہے مگر وہ تو بس اُٹھے اور چل دئے، اچانک اور آناً فاناً۔ ظاہر سی بات ہے ان کے انتقال کی خبر سن کر ہر ادب نواز غم زدہ ہو گیا کیونکہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار، ناول نگار کے ساتھ ساتھ ایک بذلہ سنج انسان بھی تھے اور سوشل میڈیا پر از حد مقبول بھی تھے۔ ان کا تکیہ کلام ''گریٹ'' بہت مشہور تھا۔ اکثر میری پوسٹ پر بھی وہ ''گریٹ'' لکھ دیا کرتے تھے جس مجھے یک گونہ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اکثر لکھتے ''اقبال حسن آزاد کی جے ہو۔'' بہر کیف! ان کے انتقال کے بعد میں نے ''ثالث'' میں ان پر ایک گوشہ نکالنے کا اعلان کیا جس کے جواب میں کئی شعری اور نثری تخلیقات موصول ہوئیں۔ اس دوران میرے دوست احمد نثار نے ''عالمی فلک'' (دھنباد) کا شموئل احمد نمبر نکال دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جو تخلیقات ''ثالث'' کے لیے موصول ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر اس رسالے کی زینت بڑھا رہی ہیں۔ میں نے ان تمام لکھنے والوں سے معذرت کر لی اور ان کی نگارشات کو نکال دیا۔ ''عالمی فلک'' کے مذکورہ شمارے میں میرا بھی ایک مضمون شامل تھا۔ میں اس مضمون کو بھی یہاں شایع نہیں کر رہا ہوں۔ امید کہ قارئین کو میری یہ ادا پسند آئے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر منظر اعجاز میرے چھوٹے بہنوئی تھے۔ وہ چند سال قبل ہی پاٹلی پترا یونیورسیٹی، پٹنہ سے صدر شعبۂ اردو کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ایک بہترین استاد ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے شاعر اور ناقد بھی تھے۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے تھے اور ان کا ایک ناول بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ انہوں نے مظفر پور سے ''انعکاس'' نامی رسالہ بھی نکالا تھا جس کا فراق گورکھپوری نمبر بہت مشہور ہوا تھا۔ ان سب



باتوں کے علاوہ وہ ایک بہترین مقرر بھی تھے۔ وہ کثیر المطالعہ تھے اور انہیں اردو، ہندی اور انگریزی کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی عبور حاصل تھا۔ جب وہ بولنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو ہوائیں تھم جاتی تھیں اور پرندے اپنی پرواز بھول جاتے تھے۔ ان کی جادو بیانی پر وہی مصرع صادق آتا تھا کہ:

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

نومبر ۲۰۲۰ء میں جب کرونا کا قہر کچھ کم ہو گیا تھا تو میں پٹنہ گیا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ کنکر باغ کالونی میں رہتے تھے۔ سمجھ لیجئے کہ جوائنٹ فیملی کی حیثیت سے۔ ایک روز شموئل احمد کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے اور منظر اعجاز کو مسالہ ڈوسا کھانے کی دعوت دی تھی۔ وقت مقررہ پر ہم دونوں موریا لوک پہنچ گئے۔ چونکہ میں اپنی کار لے کر نہیں گیا تھا۔ لہٰذا ہم لوگ ٹوٹو سے وہاں گئے۔ منظر اعجاز کی کار تو شاذ و نادر ہی گیرج سے نکلتی تھی۔ خیر! وہاں شموئل احمد اور ڈاکٹر شاہد جمیل پہلے ہی سے موجود تھے اور ہم لوگوں کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ پہلے شموئل احمد نے پوچھا کہ جھال موڑھی کھائیے گا۔ میں نے کہا کہ وعدہ تو مسالہ ڈوسا کا تھا۔ پھر مجھے منٹو کا وہ واقعہ یاد آ گیا کہ ایک دفعہ چٹر جی نام کے ایک بنگالی بابو نے منٹو کو شراب پلانے کا وعدہ کیا مگر ہوٹل میں جا کر انہیں چائے پلا دی۔ منٹو نے کہا، یار تمہارا نام چٹر جی نہیں مُکر جی ہونا چاہیے۔ وعدہ کر کے مُکر گئے۔ تو جناب! میرے احتجاج کرنے پر وہ ہم لوگوں کو لے کر ایک ریستوراں میں پہنچے۔ ہم لوگوں نے وہاں کافی اچھا وقت گزارا۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد شموئل احمد ہم دونوں کو اپنی نئی کار میں بٹھا کر کنکر باغ چھوڑ آئے۔ انہوں نے کئی بار فخریہ لہجے میں کہا کہ یہ کار ان کے بیٹے نے انہیں تحفتاً دی تھی۔

اس واقعے کے دوسرے ہی روز میں اور منظر اعجاز دونوں ایک ساتھ کرونا کا شکار ہو گئے۔ میری بیماری کی خبر سن کر میری بیٹی ڈاکٹر فریحہ سبین رانچی سے آ گئی۔ وہ ان دنوں RIMS میں M.S کر رہی تھی۔ پہلے اس نے ہم دونوں کو کنکر باغ کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کروایا اور کرونا کی تصدیق ہو جانے کے بعد ہمیں لے کر AIIMS,PATNA میں ایڈمٹ کروا دیا۔ ہم دونوں بیک وقت ایک ہی اسپتال میں تھے مگر الگ الگ وارڈ میں۔ خیر! اللہ اللہ کر کے دونوں کو وہاں سے چھٹی ملی اور ہم لوگ اپنی جان کی خیر مناتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ اس پورے دورانیے میں میری شریک حیات نشاط پروین، بیٹی فریحہ سبین، برادر خورد فرخ حسن آزاد عرف شونی اور منظر اعجاز کی بیٹی یعنی میری بھانجی فرخندہ اعجاز عرف فرخی نے جس تندہی اور جانفشانی کے ساتھ میری خدمت کی اسے میں تا زندگی فراموش نہیں کر سکتا۔ بہر حال! میں تو کچھ دنوں تک لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا لیکن منظر اعجاز صاحب اس کے بعد کبھی مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو سکے۔ شوگر کی بیماری انہیں پہلے سے تھی۔ کمزوری از حد بڑھ گئی تھی۔ پھر اس پر ستم یہ ہوا کہ ایک روز کمرے میں پھسل کر گر

پڑے جس سے ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ کافی عرصہ تک بستر کے ہو کر رہ گئے۔ اور پھر جب لاٹھی کے سہارے چلنا شروع کیا تو پھر وہی سیمینار اور ادبی بیٹھکیں۔ لیکن ان کا جسم ان صعوبتوں کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکا۔ اور اب کے جو پڑے تو پھر اُٹھ نہ سکے۔ ان کا اُٹھ جانا بھی اردو زبان وادب کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ سو مجھ پر واجب ہوا کہ ان پر بھی ایک گوشہ نکالا جائے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے میری فرمائش پر ایک افسانہ بعنوان ''ہونہہ مسلمان'' تحریر کیا تھا۔ یہ افسانہ اس شمارے میں شامل ہے۔

☆☆☆

شموئل احمد کے سلسلے میں ڈاکٹر احسان تابش کا اظہار تعزیت، مرغوب اثر فاطمی اور اقبال مسعود کی نظمیں، نثار احمد صدیقی کے ذریعہ لیا گیا انٹرویو اور ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر ریاض توحیدی اور محمد پرویز کے مضامین شامل ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر منظر اعجاز کے فن اور شخصیت پر اقبال حسن آزاد اور مرغوب اثر فاطمی کی نظمیں اور ڈاکٹر ابرار رحمانی، انوار الحسن وسطوی اور ڈاکٹر حامد علی خاں کے مضامین شایع کیے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

سید محمد اشرف نابغۂ روزگار ہیں۔ حالانکہ وہ مجھے جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں اور نہ ہی میرا ان سے کسی قسم کا کوئی رابطہ ہے۔ لیکن میں روز اول سے ہی ان کا مداح رہا ہوں۔ ڈاکٹر ریشا قمر نوجوان اسکالر ہیں۔ انہوں نے مشاہیر ادب سے انٹرویو لینے کا ایک اہم اور دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر نظر شمارے میں ان کے ذریعہ لیا گیا سید محمد اشرف کا انٹرویو شایع کیا جا رہا۔ یہ انٹرویو نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس انٹرویو سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے لوگ کس طرح سوچتے ہیں اور زبان وادب کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔

☆☆☆

دیگر مشمولات میں اقبال حسن آزاد کی حمد، ارشد عبدالحمید کی نعت، ڈاکٹر ذکی طارق اور نوشاد احمد کریمی کی غزلیں اور سلیم انصاری کی نظمیں شامل ہیں۔ نثری حصے میں ڈاکٹر اکرم پرویز کا مضمون ''نیر مسعود ..... فریب خیال کی شعریات (مارگیر کی مظہریاتی اور تو تمی شرح)''، ڈاکٹر سرفراز احمد خاں کا ''جدید انقلابی افکار کا منفرد شاعر علی سردار جعفری''، ڈاکٹر امام اعظم کا ''اردو زبان کا بدلتا منظر نامہ اور صحافت''، محمد غالب نشتر کا ''شاہد اختر کا افسانوی کینوس''، انجم قدوائی کا ''نسترن احسن فتیحی کا ناول ''نوحہ گر'' اور نازیہ تبسم کا ''جیلانی بانو کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی'' شامل اشاعت ہیں۔

☆☆☆

افسانوں میں غازی۔ جی حسین کا ''ائتلافِ عظیم''، اقبال حسن آزاد کا ''عورت کا نشہ''، عطاء اللہ عالی کا ''پاگل''، بش احمد کا ''قبلہ رخ''، نجمہ ثاقب کا ''آخری خواہش'' اور محمد یحییٰ ابراہیم کا ''ایک جھوٹی



کہانی'' شامل ہیں۔ یہ سارے افسانے لیک سے ہٹ کر ہیں اور ایک نئی دنیا سے متعارف کراتے ہیں۔ امید کہ قارئین کو یہ افسانے پسند آئیں گے۔

☆☆☆

''ثالث'' کی ویب سائٹ کو دم تحریر چونسٹھ ہزار (۶۴۰۰۰) سے زائد بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر رسالے کے تمام شماروں کو نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

اس شمارے کی قیمت مبلغ ۲۵۰/ ہندوستانی روپے ہے جسے درج ذیل کیو آر کو اسکین کر کے بھیجا جا سکتا ہے یا درج ذیل بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا جا سکتا ہے۔

www.salismagazine.in

◂◂ ● ▸▸

**Eqbal Hasan Azad**
UPI ID: 9430667003@paytm
Paytm: 9430667003

UPI Handle - 9430667003@paytm
**Eqbal Hasan Azad**
Indian Bank، Jamalpur Branch
A/c No. 20962191966
IFSC Code-IDIB000J550
MICR-811019203

◂◂ ● ▸▸

● اقبال حسن آزاد

# حمد باری تعالیٰ

وہی ہے درد کا درماں وہی سہارا بھی
اسی کو یاد کیا ہے اسے پکارا بھی
اسی کی حمد ہے میری زبان پر جاری
اسی نے مجھ کو بنایا بھی ہے سنوارا بھی
بھنور میں جس نے مصیبت کے اس کو یاد کیا
اسے ہی ناؤ ملی اور اسے کنارا بھی
اسی کے واسطے دنیا بنائی خالق نے
اسی کے زیر نگیں ہو رہے گا عقبیٰ بھی
اسی لیے ہے فرشتوں پہ برتری ہے اس کو
وہی گناہ بھی کرتا ہے اور توبہ بھی
کسی کی آنکھ سے ٹپکے جو یہ لہو بن کر
یہ اشک، بوند ہے، موتی بھی اور تارہ بھی
اسی کے واسطے اقبالؔ خود کو وقف کرو
نبی ﷺ خدا کا تمہارا بھی ہے ہمارا بھی

◂◂ ● ▸▸

Shah Family
Shah Zubair Road, Munger
Mob: 8210498674



● ارشد عبدالحمید

# نعت پاک

آقاؐ جہاں آسودہ ہیں کب خاک ہے وہ خاک
رشکِ قمر و ثابت و افلاک ہے وہ خاک

شہروں میں امینِ درِ ایمان ہے یثرب
یثرب میں امینِ شہِ لولاک ہے وہ خاک

تاثیر میں احساس ہے آنسو ہے دعا ہے
تعمیر میں ایقان ہے ادراک ہے وہ خاک

چشمِ حقِ بے باک ہے جو ملکِ عرب ہے
اور سرمۂ چشمِ حقِ بے باک ہے وہ خاک

دعوت اسی گلزار میں تکمیل کو پہنچی
تائید گرِ آیۂ ایاک ہے وہ خاک

مٹی تو ہر اک شہر کی ہے تحفۂ یزداں
آقا کے وسیلے سے بہت پاک ہے وہ خاک

افسردہ و نمناک ہے ارشدؔ اسی غم میں
جس غم میں کہ افسردہ و نمناک ہے وہ خاک

◂◂ ● ▸▸

Plot No: 64 to 67
Firdos Nagar، Near Rajban
Tonk-304001 (Rajasthan)9079863942

## ● غزلیں

# ڈاکٹر ذکی طارق

تم اکیلے میں کبھی باتیں پرانی سوچنا
کس طرح کہتا تھا میں اپنی کہانی سوچنا

مختلف انداز کی راتیں ہیں بوڑھی نانیو
اب کے بچوں کے لیے سچی کہانی سوچنا

بے سبب راتوں کو دہرانا پرانے تذکرے
اور لفظوں کے نئے جھوٹے معانی سوچنا

رت جگوں کے شوق میں آنکھیں بصارت کھو چکیں
خشک دریا میں کہاں سے آئے پانی سوچنا

رہ گزر کے مرحلے جتنے ہیں حل ہو جائیں گے
لاکھ چھالے پاؤں میں ہوں کامرانی سوچنا

پہلے آنکھوں سے ذکیؔ خوابوں کے پیکر نوچ لو
پھر اجازت ہے تمہیں صبحیں سہانی سوچنا

◂◂ ● ▸▸

میری آشفتہ مزاجی، میرے تیور رکھ جا
گھر کی دہلیز پہ احساس کا پتھر رکھ جا

زخم یادوں کے تری پھر سے مہک اٹھتے ہیں
آج سینے پہ میرے ضبط کا پتھر رکھ جا

حادثے گزرے ہوئے یاد دلانے کے لیے
پھر نئے سال کا کمرے میں کلنڈر رکھ جا

تشنہ اظہار، کہ ہے آگ کا منظر گویا
میرے احساس میں لفظوں کا سمندر رکھ جا

تو تو سورج ہے ترے ہاتھ سفید اور سیاہ
دن کے سینے میں کھلا رات کا خنجر رکھ جا

اپنی مہکی ہوئی یادوں کے چراغ اے طارقؔ
دل کی تاریک منڈیروں پہ جلا کر رکھ جا

◂◂ ● ▸▸

564 Kela Road
Gaushala Phatak
Ghaziabad 201009(U.P)
Mobõ 9818860029



## ● غزلیں

# نوشاد احمد کریمی

قابلِ رشک ہے یہ جادو بیانی میری
نقشِ بر آب کی صورت ہے کہانی میری

میں وہ دریا ہوں جسے خود بھی یہ معلوم نہیں
اب کے کس موڑ پہ ٹھہرے گی روانی میری

میرے حصّے کے ہوئے چاند ستارے معدوم
اب کوئی رات نہیں ہوگی سہانی میری

پھر وہ تجدیدِ تعلق کو چلا آیا ہے
یاد آئی ہے کوئی بات پرانی میری

جسم کے خول سے باہر میں نکل آیا ہوں
لائقِ دید ہے یہ نقلِ مکانی میری

صورتِ شمع پگھلنا ہے مقدر میرا
ختم ہوجائے گی اب ساری کہانی میری

ہر گھڑی رہتا ہے وہ لفظ و بیاں تک محدود
اس پہ کھلتی ہی نہیں روحِ معانی میری

میرا ناقد مجھے تحریر میں لاتا ہی نہیں
کرتا رہتا ہے وہ تعریف زبانی میری

اتنا آسان ہے کیا مجھ کو بھلانا نوشادؔ
چشمِ اغیار میں روشن ہے نشانی میری

◂◂ ● ▸▸

ہر منظرِ بے رنگ مرے نام کا نکلا
وہ ماہِ پسِ ابر بڑے کام کا نکلا

کس راہ میں کھویا تھا شبِ غم کا مسافر
لوٹا ہے دمِ صبح سرِ شام کا نکلا

حسرت سے سبھی سوئے فلک دیکھ رہے ہیں
کیا کوئی ستارہ ہے مرے نام کا نکلا

کرتے ہی نہیں لوگ جو آزار کے ڈر سے
وہ کام تو میرے لیے آرام کا نکلا

آتی ہی نہیں راس اسے محفلِ یاراں
پہ دل بھی مکیں خانۂ گمنام کا نکلا

سب لوگ یہاں اپنی طرح سوچ رہے ہیں
کیا کیا نہ فسانہ مرے انجام کا نکلا

بے کار ہے یہ کارِ جنوں کارِ جہاں سب
کب کوئی نتیجہ ہے مرے کام کا نکلا

کیا کوئی نئی راہِ سفر اس پہ کھلے گی
نوشادؔ جو پابند در و بام کا نکلا

◂◂ ● ▸▸

# نوشاد احمد کریمی

اک وقت تھا کہ موجۂ فانی میں ہم بھی تھے
دریا تمہارے ساتھ روانی میں ہم بھی تھے
تکلیف تھی ہمیں بھی ترے حالِ زار پر
شہرِ ملالِ مرثیہ خوانی میں ہم بھی تھے
عمر رواں کے ساتھ بدلنا بھی چاہیے
اس راہِ شوق پر تو جوانی میں ہم بھی تھے
وہ سادہ لوح ہم سے بھی ناراض تھا کبھی
کچھ روز اس کی تلخ بیانی میں ہم بھی تھے
اب کیسے تم کو بھولنے والے بتائیں ہم
گزرے ہوئے دنوں کی نشانی میں ہم بھی تھے
سب لوگ تھے اسی کو بچانے کی فکر میں
یہ جانتے ہوئے بھی کہ پانی میں ہم بھی تھے
اب کیا کہیں کہ کیسا نشہ تھا چڑھا ہوا
اک عمر تک تو خوابِ گرانی میں ہم بھی تھے
جو معرضِ خیال سے باہر نہ آسکی
نوشادؔ اس ادھوری کہانی میں ہم بھی تھے

◂◂ ● ▸▸

کسی کی یاد ، کسی کے خیال میں کیا ہے
اب اس فسانۂ ہجر و وصال میں کیا ہے
امید و یاس میں گزری ہے زندگی میری
اے عمر رفتہ ترے ماہ و سال میں کیا ہے
جو اہلِ دل تھے کہیں اب نظر نہیں آتے
زمانہ کچھ تو بتا تیرے جال میں کیا ہے
سمجھ میں آتا نہیں ہے مرا اشارہ انہیں
وہ کہہ رہے ہیں تمہارے سوال میں کیا ہے
جب اپنے خول سے باہر کوئی نکلتا نہیں
تو کون دیکھے گا شہرِ ملال میں کیا ہے
خیال و خواب کی دنیا کے جو مسافر ہیں
انہیں بتاؤ رہِ اعتدال میں کیا ہے
سمٹنے والی ہے کچھ پل میں داستاں تیری
یہ چاند رات ، یہ حسن و جمال میں کیا ہے
کوئی تو مجھ کو بھی نوشادؔ یہ بتائے کبھی
ترے عروج تو میرے زوال میں کیا ہے

◂◂ ● ▸▸

Ganj NO. 1
Bettiah 845438
Mob: 9931068612



● **نظم**
● **سلیم انصاری**

## شکست خوردہ

جگنوؤں کے قتل میں ناکام ہوکر
جب وہ
اپنے ہاتھ میں خنجر لیے لوٹا
تو اس کے گھر کے سارے پھول
زخمی ہو چکے تھے

◂◂ ● ▸▸

## خدا کے لئے

مجھے تو اب بھی یقین ہے
کہ تو اب بھی
میری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے
مگر یہ بھی سچ ہے
کہ دشمنوں نے آج
سب سے پہلے
میری شہ رگ ہی کاٹی ہے

◂◂ ● ▸▸

## اعتراف

میں اپنی نظموں کی بے ثباتی سے آشنا ہوں
میں جانتا ہوں
کہ میرے الفاظ بے صدا ہیں
مجھے خبر ہے
کہ زخم خوردہ ہیں میرے جذبے
مجھے پتہ ہے کہ
میرے لہجے کی آگ سے کوئی اب تک جلا نہیں ہے
یہ سچ بھی پیشِ نظر ہے میرے
کہ میری نظموں سے آج تک انقلاب آیا نہیں ہے کوئی
میں اپنی نظموں کی بے ثباتی سے خوب واقف ہوں
پھر بھی تخلیق کا یہ عمل ضروری بہت ہے مجھ کو
کہ میری نظمیں ہی
میرے اندر کی کشمکش کے فشار سے
بچ نکلنے کا راستہ ہیں.....

◂◂ ● ▸▸

## ● سلیم انصاری

### فرق

پہلی عورت کے حکم کی اطاعت میں
پانچ فرمانبردار بیٹے
دوسری عورت کو
آپس میں بانٹ کر کھا گئے

◀◀ ● ▶▶

### زیاں

یہ کیسا زیاں ہے
کہ اب
فصلِ گل میں بھی پنچھی
خود اپنے پروں کو کتر کے ہی
اپنے نشیمن بنانے پہ مجبور ہیں......!

◀◀ ● ▶▶

### رات

رات جنگلوں میں اتری تھی
مگر
جگنوؤں نے اسے
شہروں کی طرف
دھکیل دیا

◀◀ ● ▶▶

### سمجھوتہ

گوندھ کر جذبوں کی مٹی
درد کے پیکر
مجھے تشکیل کرنے دو
کہ اب تو
میرے جینے کی یہی صورت بچی ہے

◀◀ ● ▶▶

HIG-3 ANAND NAGAR
ADHARTAL JABALPUR (M.P) 482004
MOB 83197415427070135643



## ● تعزیت

## ● ڈاکٹر احسان تابش

### اظہارِ تعزیت

معروف افسانہ نگار، ناول نگار، ترجمہ نگار شموئل احمد کی وفات حسرت آیات کی خبر نے دل کو غم سے پارہ پارہ کر دیا۔ دل کی کیفیت جملوں میں بیان کیسے کروں۔

انسانی نفسیات کی پرکھ اور علم نجوم کی جانکاری رکھنے والے شموئل احمد کا رنگ گورا سرخی مائل تھا۔ شموئل احمد اپنی بات ڈنکے کی چوٹ پر بیان کرتے تھے۔ شمویل احمد ملنسار اور بے باک لب و لہجے کے مالک تھے۔ خواتین سے باتیں کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ چیف انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ بھیڑ کا حصہ نہیں تھے۔

میری ان سے دوبار ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات مختصر مگر یادگار تھی۔ جنسی نفسیات پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔

بھاگل پور بہار میں پیدا ہونے والے اردو فکشن نگار شموئل احمد کے افسانے کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ایوارڈ سے بھی نوازے گئے ہیں۔ عالمی فروغ اردو ادب دوحہ قطر ۲۰۱۲ء کے ایوارڈ سے بھی انہیں نوازہ گیا۔ تجربہ کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ان کی کہانی ''سنگاردان'' نے خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

بے باک لہجے کے مالک شموئل احمد کی رحلت سے اردو بستی کے لوگ غمزدہ ہیں۔ دل کا آنگن اداس ہے۔ ذات کے اندر ذات کہہ رہا ہے بچھڑنے کا یہ دن یاد رہے گا۔

اردو دنیا اردو فکشن نگار شموئل احمد سے محروم ہو گئی۔ شموئل احمد کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقا دوام لا ساقی

◀◀ ● ▶▶

Road No 05
Near Masjid New Karimganj
Gaya Bihar 823001
Mob: 9199735137

● **نظم**

● **مرغوب اثر فاطمی**

# شموئل احمد سے دو باتیں

قسمت جاگ اٹھی، شہر دہلی کی رزمین کے اوپر والی دہلی کی نہیں
زیر زمین دہلی کی اور رد ہلی کے دل کی بھی
دہلی کا دل، جو شاداب تو ہے رمجروح بھی ہے
شموئل احمد.....تم نے اچھی جگہ چنی
مر کے بھی تم نے رکہکشاں میں ہی رہنا پسند کیا
تم ستارہ شناس جو ٹھہرے
'ندی' کے پانی میں تم نے 'گرداب' دیکھے
بھنور' سے کھیلے، جلووں سے لطف اندوز ہوئے
حد تو یہ ہے کہ تم نے رسطح آب پر 'سنگھاردان' ڈھونڈ لیا
ذرا نظر پھیری تو 'چمراسُر' کو لپیٹ دیا
'حرم' کی سیر کرادی تو 'لنگی' کو وقار بخش دیا
آمدِ مسیح کا دن، تمھاری روانگی رکچھ تو ہے
تم نے ہم سے پردہ کر کے کئی نزدیکیاں پیدا کر لیں
'موپساں' سے ملنے 'پیرس' اور 'منٹو' کے دیدار کو 'لاہور' جانے کی
زحمت ختم ہوئی اب رہبشت کے حوضِ مئے ناب وطہور کے اردگرد
سارے کے سارے مل جائیں گے رسب نگل جائے گا وہ اک عفریت
کم نہیں ہے، آثر نے ڈھونڈ لیا
آخرِ شب کے اس ستارے کو رجو ہے اب بھی حسین وتابندہ



وہیں پہ کہیں چچا غالب بھی پڑے ہونگے
اُن کو ہمارا سلام کہنا مت بھولنا تم
اور ہاں! خبر پاتے ہی 'حسین الحق' اور 'شوکت حیات'
کُل نو واردان کے ہمراہ رتمھاری گرد سفر جھاڑنے پہنچ ہی جائیں گے
زمین پر فکشن کی دنیا میں
جو مخزونی چھائی ہے، جو خلا پیدا ہوا ہے راس سے تمھیں کیا غرض!
ہم رولیں گے، پھر چُپ ہولیں گے
اور ایک دن تمھیں بھول بھی جائیں گے رتمھیں اس کا ملال کیوں ہو
تم تو سارے تماشے دیکھ کر گئے ہو!
اب تو بس یہی تمنا ہے کہ تم رخلد کی حوروں میں بھی رتا ابد مقبول ومحبوب رہو
اُنہیں اپنی قصہ گوئی کا رگرویدہ بنائے رکھّو رتا کہ وہ جان سکیں
کہ جنّت کے باہر بھی کوئی دنیا ہے
اور وہ دنیا، اتنی بُری بھی نہیں ہے
آثر نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟

◂◂ ● ▸▸

Road No;7
Mohalla Ali Gunj
Gaya-823001
9431448749

'بزرگی عمر سے نہیں عقل سے آتی ہے۔ اگر آپ چالیس پچاس برسوں سے لکھ رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بہت ''بڑے اور سینیئر'' رائٹر بن گئے ہیں۔'' **اقبال حسن آزاد**

● **اقبال مسعود**

## شمئول احمد

ستاروں سے آگے
جہاں ڈھونڈنے والا
خود ستارہ بن گیا
روشنی کا استعارہ بن گیا

اب دیکھئے اسے
چراغِ رُخِ زیبا لے کر
تلاش کیجئے
سیاہ و سفید کے درمیان
جس نے سحر کیا اعجاز کیا

وہ جو ستارہ بن گیا
ادب کا استعارہ بن گیا

◄◄ ● ►►

23-A/ 4Rajat Appartment,
BDA, Coloney, Koh e faza.
Bhopal. 462001 ( M. P)
Mob; 98270 89881



● **انٹرویو**

● **نثار احمد صدیقی**

## شمئول احمد سے گفتگو

نوٹ: انتقال سے چند ماہ قبل یہ انٹرویو لیا گیا تھا۔ صد حیف! انکی زندگی میں یہ انٹرویو شائع نہ ہو سکا۔ نثار صدیقی۔!!

نثار احمد صدیقی: اپنی ابتدائی زندگی کے ذاتی و ادبی کوائف بتایئے؟

شمئول احمد: میرے والد مجسٹریٹ تھے۔ سرکاری دورے پر جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میری عمر اس وقت سات آٹھ سال رہی ہوگی۔ میں وہاں کے تاثرات قلم بند کرتا۔ والد سنتے اور خوش ہوتے۔ اس طرح طبیعت لکھنے کی طرف مائل ہوئی۔ میری اردو کی پڑھائی باقاعدہ نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ سے اب بھی املا کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ میرے گھر میں ادبی ماحول رہا ہے۔ میں نے کرشن چندر وغیرہ کو دس سال کی عمر سے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ میں ذہین سمجھا جاتا تھا لیکن طالب علم بہت اوسط درجے کا تھا۔ مجھے نصابی کتابوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میرا زیادہ وقت شعر و ادب کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔ میں جب انیس سال کا تھا تو میرا پہلا افسانہ "چاند کا داغ" ماہنامہ "صنم" پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ افسانہ پڑھ کر والد محترم رات بھر آنگن میں چہل قدمی کرتے رہے۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے ایسا کیا لکھ دیا کہ والد کی نیند حرام ہوگئی۔ لیکن آج میں ان کے تردد کو سمجھتا ہوں۔ میں نے ان کی اخلاقی قدروں کی نفی کی تھی۔ کہانی کچھ اس طرح کی تھی کہ ایک عورت کو بچہ نہیں ہو رہا تھا۔ پھر جب گود بھری تو شوہر نے دیکھا کہ پڑوسی شوکت میاں بنجر زمین پر ہل چلا رہے ہیں۔ والد کو اس جملے پر اعتراض تھا کہ اتنی کچی عمر میں میں نے اس طرح کیوں سوچا۔ لیکن میں کہانی سوچ کر نہیں لکھتا۔ کہانی مجھے مل جاتی ہے۔ کہانی قدم قدم پر بکھری پڑی ہے۔ ہر آدمی کا چہرہ ایک کاغذ ہے جس پر اس کی زندگی کی کہانی لکھی ہوتی ہے۔ ادیب کو کتابوں سے زیادہ آدمی کو پڑھنا چاہیے۔ میرے حلقہ احباب میں خواتین کی تعداد خاصی ہے۔ ایک راحت کن عورت میری بہت اچھی دوست ہے جس سے ہر موضوع پر کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔ اس سے گفتگو میں بہت سی نفسیاتی گھتیاں سلجھتی ہیں۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا کہ بیوی کو گھر میں ہمیشہ

دائی بن کر نہیں رہنا چاہئے۔اسے کبھی عورت بن کر بھی رہنا چاہئے اور میں نے کہانی لکھی تھی ''برف میں آگ'' جسے پڑھ کر فاروقی نے مجھے خط لکھا تھا کہ کاش یہ کہانی ''شب خون'' میں شائع ہوتی۔

میں سمجھتا ہوں فن کار میں ایک ذرا آوارگی ضروری ہے۔ میں ہندی میں ایک سوانحی ناول لکھ رہا ہوں ''اے دل آوارہ'' میں نے یہاں بہت سی باتوں کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ تصنیف فی الحال ہندی میں ہی شائع ہوگی۔اس میں ہندی سماج کے لوگ زیادہ ہیں۔

نثار احمد صدیقی: آپ کا ایک افسانہ ''سنگھاردان'' اپنے وقت میں کافی مقبول ہوا اور اس پر ٹیلی فلم بھی بنی۔ اس افسانہ سے متعلق آپ کا ذاتی نظریہ کیا ہے؟ اس میں کیا خوبیاں ہیں؟ تفصیل سے بتائیے۔

شموئل احمد : بابری مسجد کا جب انہدام ہوا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ ایک فرقے کو اس کی وراثت سے محروم کر دینے کی سازش رچی گئی ہے۔ ''سنگھاردان'' اس سازش کے خلاف ایک پروٹسٹ ہے لیکن اردو کا پیشہ ور ناقد اس تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

نثار احمد صدیقی: آپ کا افسانوی مجموعہ (سنگھاردان) منظر عام پر آچکا ہے۔اس کی روشنی میں ادب کے ریسرچ اسکالر کو بتائیں کہ آپ کے افسانے دوسرے ہم عصر افسانہ نگاروں افسانوں سے منفرد کیوں ہیں؟

شموئل احمد: میں اس بات کا قائل ہوں کہ بڑا ادیب بننے سے اچھا ہے منفرد ادیب ہونا کہ انفرادیت اپنے آپ میں بڑی ہوتی ہے۔ میرے لہجے کی بے باکی مجھے منفرد بناتی ہے۔ میرے یہاں تشبیہات، استعارے، نفسیات، دروں بینی تصویر کشی اور جملے سازی میں میرا اپنا رنگ ہے۔ میری کہانی کا موضوع اپنا اسلوب خود گڑھتا ہے اور ایک دوسرے سے جدا ہے۔علم نجوم کی اصطلاحوں کو بھی میں نے اپنی کہانیوں میں پرویا ہے جو اپنی جگہ ایک دم انوکھا ہے اور اس کی مثال اردو میں کہیں نہیں ملتی۔

نثار احمد صدیقی: آپ کے ناول اور افسانے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ جنس اور سیاست سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔اس کی کوئی خاص وجہ؟۔

شموئل احمد: اردو میں جنس کا موضوع ترقی پسند جحان سمجھا گیا ہے۔آج ہم جس عہد میں جی رہے ہیں وہ پٹے اور زنجیر کا عہد ہے جہاں ہر آدمی کے گلے میں پٹہ ہے اور زنجیر سامنے والے آدمی کے ہاتھوں میں ہے۔آزادی کے بعد ہمارے سارے سپنے ایک ایک کر کے چوری ہو گئے ہیں۔ جمہوریت کی پری بالا خانے پر بیٹھ گئی ہے۔اس نے بازار میں اپنے لئے گنبد بنالیا اور اٹھائی گیرے سے ہم بستر ہوتی ہے۔آج فاشزم دبے پاؤں نہیں ڈنکے کی چوٹ پر بڑھتا چلا آرہا ہے۔آج ادب سے ہتھیار کا کام لینا ہوگا۔عہد کا تقاضہ ہے کہ ہم قارئین میں صحت مند سیاسی رجحان کی پرورش



کریں۔آج ادیب پر سماجی ذمہ داری سے زیادہ سیاسی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔آج ہم ادب میں سیاست کو اچھوت سمجھ کر نہیں کتر اسکتے۔۔

نثار احمد صدیقی : آپ کے افسانوں میں فرائیڈ کے سیکس تھیوری (sex Theory) زیادہ نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں؟ کیا یہ اردو افسانے لئے مضر نہیں ہے؟۔

سموئل احمد: میری دلچسپی نفسیات بالخصوص جنس کی نفسیات سے رہی ہے۔فرائیڈ کے علاوہ میں نے یونگ، ایڈلر، ہیولاک، ایلس اور کرافٹ اینگ کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے جنس کی جمالیات کی تلاش رہی ہے۔جنس میرے یہاں موضوع نہیں وسیلہ ہے۔آدمی نے جنس کو مذہب اور اخلاقیات کا زہر دے کر مارنے کی کوشش کی ہے۔جنس مرا تو نہیں زہریلا ہو کر زندہ ہے۔میری کہانیاں انسان کے رگ و پے میں سمائے اس زہر کی تلاش کرتی ہیں۔انسانی رشتوں کو سمجھنے کے لئے نفسیات کا جاننا ضروری ہے اور ادب انسانی رشتوں کی ہی بازیافت کرتا ہے۔انسان کی داخلیت میں اترنے کے لئے نفسیات اور خاص طور پر جنس کی نفسیات سے کام لینا ہوگا۔مغرب میں جنس نگاری کی آزادی لارنس نے دلائی ہے اور اردو میں منٹو نے۔ ہر زبان کے ادب عالیہ میں جنس کے لطیف اشارے ملتے ہیں۔میرے یہاں تو اتنی بھی جنسیات نہیں ہے جتنی ''بہشتی زیور'' میں ہے جو آپ اپنی لڑکیوں کو جہیز میں دیتے ہیں۔

نثار احمد صدیقی: آپ اپنی چند نئی کہانیوں کے بارے میں تفصیل سے بتائیے؟۔

شموئل احمد: ''عنکبوت''، ''ظہار''، ''اونٹ''، ''سراب''، ''مصری کی ڈلی''، ''القمبوس کی گردن''، ''جھاگ''، ''کایا کلپ''، میری نئی کہانیاں ہیں جن پر پیشہ ور ناقد بات کرنے سے گھبراتا ہے۔''عنکبوت'' سیکس چیٹنگ کی کہانی ہے۔جس میں سائبر کے سیکس کلچر میں تیسری دنیا کا آدمی پانی میں نمک کی طرح گھل رہا ہے۔''ظہار'' ایک مسئلہ پر ہے جس سے عام مسلمان نابلد ہے لیکن جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔اردو میں آج تک اس موضوع پر کوئی افسانہ نہیں لکھا گیا ہے۔''سراب'' کلچرل گیپ کی کہانی ہے۔''مصری کی ڈلی'' میں علم نجوم کی اصطلاحوں سے کام لیا گیا ہے۔''القمبوس کی گردن'' میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت جمہوریہ کا ایک پایہ مسلمانوں کی گردن پر ٹکا ہے جس سے خون رستا ہے۔اقتدار میں آنا ہے تو گردن کاٹو یا اقتدار میں آنا ہے تو گردن بچاؤ۔''جھاگ'' مرد عورت کے بنتے بگڑتے رشتے کی کہانی ہے۔''کایا کلپ'' میں جنسی جبلت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

نثار احمد صدیقی: بہار کے مشہور افسانہ نگار حسین الحق نے ایک جگہ تحریر کیا ہے: ''شموئل احمد بدمعاش اور بیکار افسانہ نگار ہے جو افسانہ بننے کے عمل میں مکار کی طرح پینترے بھی بدلتا ہے اور چوکنا بھی رہتا

ہے۔'' آپ اس جملے سے متعلق کیا جواب دیں گے؟

شموئل احمد: بیکار نہیں مکار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بیکار کتابت کی غلطی ہے۔ مجھ سے بڑا مکار حسین الحق ہے اور مجھ سے بہتر پینترے جانتا ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ اللہ خیر الماکرین یعنی اللہ نے تخلیق کاری کو مکر سے منسوب کیا ہے۔ حسین نے فکشن کی نئی اصطلاح ایجاد کی ہے۔ اردو کے پیشہ ور نقاد کو حسین کی پیروی کرنی چاہئے اور اس اصطلاح کو رائج کرنا چاہئے۔

نثار احمد صدیقی: آپ کے شروع کے چند افسانے علامتی و تجریدی نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں سے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

شموئل احمد: آپ نے صرف سوال کیا ہے مثال نہیں دی۔ میں نے کبھی تجریدی کہانی نہیں لکھی۔ کبھی ''شب خون'' میں شائع ہونا پسند نہیں کیا۔ علامت نگاری کوئی جدیدیت کی دین نہیں ہے۔ کرشن چندر اور منٹو نے بھی علامت نگاری کی ہے۔ کہانی کا اسلوب موضوع پر منحصر کرتا ہے۔ میں نے جو علامتی کہانیاں لکھی ہیں وہ موضوع کا تقاضہ ہے۔ اصل بات ہے کہانی میں ترسیل ہونی چاہئے۔ جدید علامت نگاروں نے پہلا علامتوں کا ایک فریم بنایا اور اس میں کہانی ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اصل علامت نگاری وہ ہے جب علامتیں کہانی کی گہرائی سے پھوٹتی ہیں اور بامعنی ہوتی ہیں۔ میں نے محسوسات کی کہانیاں بھی لکھی ہیں لیکن وہ ترسیل کی ناکافی کا شکار نہیں ہوتیں۔ میری کہانی ''سبز رنگوں والا پیغمبر'' یا ''عکس عکس'' سیریز کی کہانیوں کو آپ علامتی کہانی کہہ سکتے ہیں لیکن ان میں واقعات کا تسلسل بھی ہے اور یہ کہانیاں سماجی فریم ورک میں اپنے پاؤں ٹکاتی ہیں۔

نثار احمد صدیقی: کیا یہ سچ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ''سوار'' اور اس طرح کے کئی دوسرے افسانے لکھ کر فکشن میں نئے علامتی، استعاراتی اور تاریخی تصوف کی بلندیوں کو چھونے میں کامیابی حاصل کی ہے؟

شموئل احمد: یہ سچ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فاروقی نے مابعد جدید کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ فاروقی نے عصری مسائل سے ہمیشہ آنکھیں چرائی ہیں اور میر کے عہد میں پناہ لیا۔ میر کو ان سے چھین لیا جائے تو ان کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ فاروقی کو خود اپنی افسانہ نگاری پر کبھی بھروسہ نہیں رہا اس لئے انہوں نے فیک نام سے اپنے افسانے شائع کئے اور دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد انہیں اپنے نام سے منظر عام پر لایا۔ فاروقی کے افسانے مابعد جدید افسانے بھی نہیں ہو سکے۔ یہ لغو افسانے ہیں جو اردو افسانے میں اضافہ نہیں کہے جا سکتے۔

نثار احمد صدیقی: آپ کے ہم عصر افسانہ نگار شوکت حیات کو 'نامیاتیت پسند' افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ آپ



اسے کیا کہیں گے؟ اپنا نظریہ پیش کریں۔

شموئل احمد: نامیاتیت بکواس ہے اور ادب میں قابل قبول بھی نہیں ہے۔ نامیاتیت کہیں exist نہیں کرتی۔ شوکت خود سمجھتے ہیں یہ کھڑاگ جو انہوں نے پھیلایا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ خود کنفیوژ ہیں اور نامیاتیت کو کبھی انامیت کہہ دیتے ہیں۔ اگر یہ سنجیدہ ہوتے تو اس موضوع پر مقالہ لکھتے اور اس کے مختلف نکات کو اجاگر کرتے اور بتاتے کہ ان کا افسانہ کہاں کہاں اس پیمانے پر پورا اترتا ہے اور اردو افسانے پر اس کے کیا کیا اثرات پڑے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شوکت حیات جب اپنی بیماری کا اشتہار اخباروں میں دیتے ہیں تو اس دن بازار میں مٹی چاپ ضرور کھاتے ہیں تو ان کی انامیت یا نامیاتیت بھی کچھ اس قسم کی چیز ہے۔

نثار احمد صدیقی: آپ کا دونوں ناول ''ندی'' اور ''مہاماری'' کلاسیکی فارم سے بغاوت کرتا ہے۔ آپ اس کے متعلق کیا کہیں گے؟

شموئل احمد: فارم تو ٹوٹنا ہی چاہئے۔ ہمارا کام ہے فارم توڑنا اور نقادوں کا کام ہے چیخنا۔ جب کوئی تجربہ ہوتا ہے اور فارم ٹوٹتا ہے اور نیا فارم سامنے آتا ہے تو ناقد کو برا لگتا ہے۔ شروع شروع میں وہ اس کی تردید کرتا ہے اور پھر آگے چل کر اسے قبول کرتا ہے اور گن گان کرتا ہے۔ میرے دونوں ناولوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

نثار احمد صدیقی: آپ کا ناول ''ندی'' جنسی مسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس ناول کو مکمل کرنے کے لئے جس طرح سے علامتی و استعاراتی زبان و انداز میں پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے سر پر اس زمانہ میں جدیدیت کا بھوت سوار تھا۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر یہ انداز بیان کیوں؟۔

شموئل احمد: میں نے ہمیشہ جدیدیت کی نفی کی اور کبھی ''شب خون'' میں شائع نہیں ہوا۔ ''ندی'' جنسی مسائل پر مبنی نہیں ہے، یہاں جنس کے وسیلے سے عورت کی داخلیت میں اترنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ عورت ہے جو خود کو استعمال ہونے کی چیز نہیں سمجھتی اور فطرت سے ہم آہنگی چاہتی ہے۔ جسے مشین نما مرد سے الجھن ہوتی ہے جو عورت کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے۔ ''ندی'' مرد کے خود غرض رویے کے تئیں پروٹسٹ ہے۔ فطرت اور مشین کا تصادم بھی اس ناول کا ایک پہلو ہے۔ ''ندی'' کی زبان قطعی علامتی نہیں ہے۔ تشبیہات، استعارے اور جزئیات نگاری سے ضرور کام لیا گیا ہے جو بیانیہ کا حسن بڑھاتا ہے۔ ''ندی'' کی ہیروئن لمحہ موجود میں جینا چاہتی ہے کہ تم ایک ہی ندی میں دو بار نہیں اتر سکتے کہ دوسرے ہی لمحے ندی کی دھار بدل چکی ہوتی ہے اور وہ دوسری ندی میں بدل چکی ہوتی ہے۔

نثار احمد صدیقی: آپ کے دو ناول نئی تکنیک و نئی فکر کے ساتھ منظر عام پر آئے لیکن اردو دنیا والے نے اسے وہ

مقام نہیں دیا جو اردو کے دوسرے ناولوں کو دیا گیا۔ ایسا کیوں؟

شموئل احمد: ''ندی'' اپنا مقام بنا چکی ہے اور ''مہاماری'' پر بھی بحث ہوتی رہی ہے اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ ''ندی'' کے تو کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ پنگوئن اردو نے بھی اسے شائع کیا اور جرمنی میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ اردو کا ناقد اپنے محلے والوں پر لکھتا ہے یا ان پر جو ان کی لابی میں ہیں۔ میں کسی لابی میں نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کسی ناقد کو گھاس نہیں ڈالی، لیکن جو معتبر ہیں ان کی قدر ضرور کرتا ہوں۔ پھر بھی ''ندی'' بہتی رہی اور ''مہاماری'' کا بھی ہاہا کار رہا اور وقت خود فیصلہ کرتا ہے کہ کس فن پارے کو دوام حاصل ہے۔

نثار احمد صدیقی: ''مہاماری'' اپنے موضوع کے اعتبار سے فرسودہ ناول ہے لیکن انداز بیان اچھوتا ہے، اور یہی معیاری ناول ہونے کا ضامن ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس موضوع پر ناول لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ تفصیل سے بتائیں۔

شموئل احمد: ''مہاماری'' کا موضوع فرسودہ نہیں ہے۔ ''مہاماری'' عصری مسائل سے آنکھیں ملاتا ہے اور اپنے عہد کا دستاویز ہے۔ اگر یہ موضوع فرسودہ ہے تو پورا عہد ہی فرسودہ ہے۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے میں نے کرپشن کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ڈیموکریسی کو پل پل داغ دار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں کرپشن کا حصہ بھی رہا ہوں اور اس سے لڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میرا جینا جب دوبھر ہو گیا تو سوچا احتجاج درج کروں۔ ''مہاماری'' اس سسٹم کے خلاف احتجاج ہے جس میں رہتے ہوئے بھی آپ مر رہے ہیں اور جس سے باہر رہ کر آپ مارے جائیں گے۔ آج مہاماری ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ابھی مظفر نگر میں جو ہوا وہ مہاماری کا حصہ ہے۔ مہاماری کا ہر منظر اس داغ دار جمہوریت کا منظر ہے جس سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔

نثار احمد صدیقی: شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں''، مشرف عالم ذوقی کا ''لے سانس بھی آہستہ''، عبدالصمد کا ''بکھرے اوراق''، پیغام آفاقی کا ''پلیتہ''، غضنفر ''مانجھی''، اور حسین الحق کا ''فرات'' سے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ ان ناولوں میں آپ کو کون سا ناول زیادہ پسند ہے اور کیوں؟

شموئل احمد: فاروقی کا ناول ربر کی اس عورت کی طرح ہے جو دیکھنے میں خوش نما ہے جسے آپ شوکیس میں سجا کر رکھ سکتے ہیں لیکن کوئی حرارت جذب نہیں کر سکتے۔ یہ عورت گونگی اور بہری ہے۔ یہ ہماری زبان نہیں سمجھتی اور ہمارے مسائل سے آشنا نہیں ہے۔ باقی جن ناولوں کا آپ نے نام لیا ہے ان میں عصری حسیت ہے اور مجھے سب پسند ہیں۔



نثار احمد صدیقی: آج کل جو ناول لکھے جا رہے ہیں وہ سب تاریخ، سیاست یا فرقہ پرستی کے موضوع پر لکھے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں؟

شموئل احمد: فساد کا موضوع اردو ادیبوں کے لئے نوسٹلجیا بن چکا ہے۔ اردو ادیب فساد کے موضوع سے بچ نہیں سکتا۔ وہ ہر وقت عدم تحفظ کے احساس سے گھرا ہوا ہے۔ تاریخی ناول کا دور قاضی عبدالستار کے ''داراشکوہ'' کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آج تاریخی ناول لکھے جا رہے ہیں تو نام بتائیے۔ سیاست کے موضوع سے ہم آج بچ نہیں سکتے۔ عام آدمی کی زندگی میں آج سیاست کا عمل دخل اتنا بڑھ گیا ہے کہ تحریر میں اس کا عکس ناگزیر ہے۔

نثار احمد صدیقی: ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کے مدمقابل کوئی ناول آپ کی نظر میں ہے؟ اگر ہے تو اس کے متعلق کیا کہنا چاہیں گے؟

شموئل احمد: میں پہلے اظہار کر چکا ہوں۔

نثار احمد صدیقی: پروفیسر احمد سجاد کا یہ خیال کہ ''کئی چاند تھے سر آسماں'' ناول کو دنیا کی کسی بھی زبان کے شاہکار ناول کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس جملے سے متعلق آپ اپنی رائے دیں؟

شموئل احمد: آپ کے سر پر فاروقی کیوں سوار ہیں.....؟ گھوم پھر کر آپ اسی سوال پر آ جاتے ہیں۔ احمد سجاد کا یہ بیان غیر ذمہ دارانہ ہے۔ انہوں نے دوسری زبان کے ناول ہی نہیں پڑھے ہیں۔ یہ فاروقی کے دوست ہیں تو دوستی نبھا رہے ہیں۔

نثار احمد صدیقی: ظہیر انصاری (ایڈیٹر ''تحریر نو''، ممبئی) نے ایک سال قبل اپنے اداریہ میں بہت سارے الزامات آپ پر لگائے تھے۔ آپ ان الزامات کی تردید کیسے کریں گے۔ حقیقت واضح کریں؟

شموئل احمد: ظہیر انصاری کے رسالے میں میرا زیر قلم ناول ''گرداب'' قسط وار شائع ہو رہا تھا۔ لیکن ان کے رسالے سے لوبان اور اگربتی کی بو آنے لگی تو میں نے مزید شائع ہونا مناسب نہیں سمجھا اور قسطیں روک دیں۔ چڑ کر انہوں نے مجھ پر دلچسپ الزامات لگائے۔

نثار احمد صدیقی: ہندنژاد افسانہ نگار جتندر بلو (لندن) نے ظہیر انصاری (مدیر ''تحریر نو''، ممبئی) سے متعلق ایک خط میں تحریر کیا (جو ''نیا ورق''، ممبئی میں شائع بھی ہوا تھا) کہ ظہیر انصاری فرقہ پرست اور جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ اس جملے سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

شموئل احمد: میں جتندر بلو سے اتفاق رکھتا ہوں۔ ظہیر انصاری جن سنگھی قسم کے مسلمان ہیں۔

نثار احمد صدیقی: انتظار حسین کا ناول ''بستی''، بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، انور سجاد کا ''خوشیوں کا باغ''، انیس ناگی

کا ''دیوار کے پیچھے''، فہمیدہ ریاض کا ''کراچی'' اور ابوالفضل صدیقی کا ''ترنگ'' ان پاکستانی ناولوں سے متعلق تفصیل سے یہ بتائیں کہ ان میں کیا خامی وخوبی ہے؟

شموئل احمد: انتظار حسین کا ناول ہجرت پر مبنی ایک اچھا ناول ہے۔ بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ'' مرد کی شہوت کے خلاف احتجاج ہے لیکن یہ زیادہ سے زیادہ ایک تانیثی ناول ہے جس میں عورت کے وہ تیور نظر نہیں آتے جس میں استحصال کے خلاف غم وغصہ کا شدید رنگ ہو اور اپنی آزادی کی مانگ ہو۔ ''خوشیوں کا باغ'' جدید ناول ہے جو کلیونیکیٹ نہیں کرتا۔ میں اسے اچھا ناول نہیں مانتا۔ جو اسے اچھا ناول مانتے ہیں ان سے کہہ کر دیکھئے کہ اس کا تجزیہ کرو تو وہ بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ باقی ناول میرے مطالعہ میں نہیں آسکا ہے۔

نثار احمد صدیقی: رشید امجد، احمد ہمیش، سلام بن رزاق، شوکت حیات، مشرف عالم ذوقی اور حسین الحق کے افسانوں سے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

شموئل احمد: رشید امجد کی کہانیاں ترسیل کی ناکامی کا شکار نہیں ہوتیں۔ انہوں نے محسوسات کی بھی کہانی لکھی ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں وہ نئی معنویت ڈھونڈ لیتے ہیں۔ احمد ہمیش جدید افسانہ نگاروں میں سب سے ناکام رہے۔ ایک لمبی کہانی لکھی ''مکھی'' باقی سب کہانیاں ان کی مکھی ہی ہیں۔ سلام بن رزاق زندگی کی بھٹی سے کہانی نکالتے ہیں۔ شوکت حیات کی کہانی اوڑھے ہوئے احساس کی کہانی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں سب کچھ اوڑھا ہوا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے یہاں عصری حسیت ہے۔ حسین الحق سماج کی عکاسی میں گھر کی دہلیز سے باہر نہیں نکلتے، ان کے زیادہ کردار اماں، ابا، ماموں، بھابی، بھیا ہوتے ہیں اور کہانی کے آخر میں وہ قاری پر سوال بھی ضرور داغتے ہیں۔

نثار احمد صدیقی: کیا آپ فکشن کی تنقید سے مطمئن ہیں؟ مفصل جواب دیں۔

شموئل احمد: اردو میں فکشن کی تنقید خستہ حال ہے۔ گوپی چند نارنگ، شکیل الرحمٰن اور وارث علوی نے تخلیقی تنقید کا نمونہ ضرور پیش کیا ہے لیکن یہ پرانے لوگ ہیں اور اب تنقید کا منظر نامہ بے رنگ ہے۔ اردو کا پیشہ ور نقاد جو اردو کا استاد بھی ہے وہ اگلے ہوئے نوالے چباتا ہے اور نئے لوگوں پر لکھنے کے لئے کہئے تو بغلیں جھانکتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ اپنے محلے والوں پر لکھتے ہیں یا ان پر جو ان کے لابی میں ہیں۔ یہ بند دماغ کے لوگ ہوتے ہیں اور نئی بات نہیں سوچ سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا ذہن خاص نظام میں مرتب ہوتا ہے۔ یہ صرف اردو پڑھتے ہیں وہ بھی اردو کا اخبار جس پر شور بہ گرا ہوتا ہے۔ تخلیق کار فکشن کی بہتر تنقید کرتا ہے۔ ممتاز شیریں نے اردو افسانے پر جو مضمون لکھا اس کی اونچائی کو ابھی تک یہ ناقد چھو نہیں سکے۔ ممتاز شیریں نے بھی منٹو



کو Discover کیا۔ ان کی باتوں کو بھی اردو کے استاد سمینار میں دہراتے ہیں۔

نثار احمد صدیقی: آج پندرہ سالوں میں ہندو پاک میں بہت سارے ناول لکھے گئے۔ آپ ان ناولوں میں کن کن ناول نگار کے ناول پسند کرتے ہیں اور کیوں؟ خوبیاں بیان کریں۔

شموئل احمد: گزشتہ پندرہ سالوں میں اچھے ناول لکھے گئے لیکن بڑا ناول نہیں لکھا گیا۔ ایسا کوئی ناول نہیں لکھا گیا جو شوکت صدیقی کے ''خدا کی بستی''، عزیز احمد کے ''گریز''، خدیجہ مستور کے ''آنگن''، جمیلہ ہاشمی کے ''تلاش بہاراں'' اور عینی کے ''آگ کا دریا'' سے آنکھیں ملاتا ہو۔

نثار احمد صدیقی: قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' کو جدیدیت کی دین سمجھتے ہیں، کیوں کہ ''آگ کا دریا'' میں فلسفے کی جس نہج سے موشگافیاں ہوئی ہیں ان سے یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ یہ ناول جدیدیت اور وجودیت کی وکالت کر رہا ہے۔ آپ اس پیرگراف کے متعلق اپنا نظریہ پیش کریں؟

شموئل احمد: جدیدیت کا مطلب فلسفہ کی موشگافیاں نہیں ہے۔ جدیدیت کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔ خود فاروقی نے جدیدیت پر کوئی مضمون نہیں لکھا اور اس کے نکات کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ جدیدیت کی جامع تعریف نہیں ہوسکتی۔ ''آگ کا دریا'' میں ہندومت کو جس انداز میں برتا گیا ہے اس میں وجودی رنگ ہے۔ وجودیت کی جڑیں اپنی شد میں ملتی ہیں۔ ''آگ کا دریا'' میں وقت خود ایک کردار ہے۔

نثار احمد صدیقی: اردو افسانہ کا مستقبل؟

شموئل احمد: ہندوستان میں اردو کی نئی نسل تیار نہیں ہو رہی ہے۔ نئی نسل کا کوئی افسانہ نگار آپ کے ذہن میں ہے تو مجھے بتائیے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو کیریئر سے جڑی نہیں ہے اس لئے نئی نسل ہندی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ لیکن پاکستان میں نئے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ عالمی سطح پر اردو افسانے کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Muslim Abad, Gobardhan Maidan
Haspurah 824120
Aurangabad (Bihar)
Email: nasiddiqui2011@gmail.com
9546308801

● یادیں

● ڈاکٹر ابوبکر عباد

# شموئل احمد: یادیں، باتیں اور فن

شموئل صاحب کو سگریٹ پینے والی عورتیں پسند ہیں، ذہنی الجھن اور جنسی نفسیات ان کے محبوب موضوعات ہیں، مذہب سے کم لگاؤ کے باوجود انھیں مذہبی صحیفے بھاتے ہیں، زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی غزل الغزلات کی قرات ان پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے، گیتا بالخصوص اس کے وہ اشلوک انھیں ایک نوع کے رومانی سحر میں مبتلا کرتے ہیں جہاں شری کرشن جی کہتے ہیں کہ: ''میں تجسّوی کا تیج ہوں، یشسّوی کا یش ہوں، درختوں میں پیپل ہوں۔'' اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا کیا ہوا قران کریم کا اردو ترجمہ انھیں روحانی سرور بخشتا ہے۔ اور ان سب کا وہ حاصل نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ ''میں سمجھتا ہوں ایسے صحیفوں کا مطالعہ تخلیقیت کو جلا بخشتا ہے۔''

شموئل صاحب کا شمار ہمارے عہد کے اہم اور اچھے اور مقبول فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''بگولے''، ''سنگھاردان''، ''القمبوس کی گردن''، ''عنکبوت'' اور ''کوچۂ قاتل کی طرف'' مجھے یاد آتے ہیں۔ ناولوں میں ''ندی''، ''مہاماری''، ''اے دل آوارہ''، ''گرداب'' اور ''چمراسر'' پڑھ رکھے ہیں۔ شموئل صاحب کو علم نجوم اور علم جفر سے بھی خاصی مناسبت ہے اور انھیں عملی طور پر بروئے کار بھی لاتے ہیں۔ عرب، ایران اور ہندوستان میں علم جفر کی قدیم روایت رہی ہے اور ماضی میں ان پر کافی تحقیق بھی ہوئی ہے۔ علم جفر کے موضوع پر کتاب لکھنے والوں میں منصور ابن حلاج بغدادی، محی الدین ابن عربی، بایزید بسطامی، مولانا احمد رضا خاں اور امام خمینی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ قدیم زمانے میں فلسفی، سائنسداں، حکیم اور عالم دوسرے علوم کے ساتھ نجوم سے بھی واقفیت رکھتے تھے، اردو شاعری میں اس کی معروف مثال حکیم مومن خاں مومنؔ کی ہے۔ اردو فکشن نگاروں میں یہ شرف وامتیاز شموئل صاحب کو حاصل ہے، اور ان کی کتاب ''کشف الاعداد'' اس کی شہادت دیتی ہے۔ انھوں نے اس کا مسودہ جب این۔ سی۔ پی۔ یو۔ ایل میں جمع کیا تو ان کے پاس جواب گیا کہ اسے شائع کیسے کیا جاسکتا ہے، ہمارے پاس اس علم کا جاننے والا کوئی اکسپرٹ نہیں ہے جو اس کی ویٹنگ کر سکے۔ شموئل صاحب نے کہا اسے آپ ابوبکر عباد کے پاس بھیج دیجیے۔ چنانچے ایسا ہی ہوا۔ میں نے فون پر



ہنستے ہوئے شموئل صاحب کو بتایا کہ آپ نے کونسل والوں کو صحیح نام کی نشاندہی کی ہے، اسے پڑھنا میرے لیے دلچسپ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں مجھے بھی علم نجوم سے کسی حد تک دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور کیرو کی پامسٹری کے علاوہ کئی ایک کتابیں پڑھ ڈالی تھیں، نتیجتاً ہاتھوں کی بناوٹ، اس کی پشت، ہتھیلیوں کی لکیروں، انگلیوں کی ساخت اور ناخن کے رنگ وغیرہ سے صاحب دست کی صحت، مزاج، شوق، کیریر اور نفسیات کا علم کسی حد تک پلّے پڑنے لگا تھا۔ بہر حال شموئل صاحب اس موضوع پر ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں ممکن ہے مکمل ہو چکی ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شموئل صاحب کے فکشن کو انفرادیت اور انھیں امتیاز بخشنے میں علم نجوم سے ان کی واقفیت اور بیانیے میں اس کے برمحل اور ہنرمندانہ استعمال کا بھی حصہ ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے ''مصری کی ڈلی'' او ''رچھگمانس'' اور ناول ''گرداب'' اور ''چمراسر'' عمدہ مثالیں ہیں۔

دلچسپ بات ہے کہ شموئل صاحب نے اردو کی تعلیم باقاعدہ یا باضابطہ حاصل نہیں کی ہے۔ سائنس کے طالب علم تھے مگر شوق شعر وادب اور نفسیات کے مطالعہ کا تھا اور عشق فکشن سے کر بیٹھے۔ سعادت مند بیٹے کی مانند والد محترم کی خواہش کے مطابق بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد سول انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی، واٹر سپلائی نیٹ ورک اور ٹاور ڈیزائننگ کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی، لیکن وہ تانے بانے اردو افسانے اور ناولوں کے بُنتے رہے۔ مجبوراً حاصل کیے ہوئے علم کی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر وہ چیف انجینیر کے عہدے سے تو ریٹائر ہوگئے، البتہ پسند کیے ہوئے معشوقِ طرحدار فکشن سے اب تک عاشق صادق کی مانند دل لگائے بیٹھے ہیں۔ معشوق طرحدار کو چڑانے، جلانے، ستانے اور مارنے کے وہ جارحانہ انداز سکھائے ہیں کہ سیاسی و مذہبی ٹھیکہ دار، بیوروکریٹس، لٹیرے، محبوب، محبوبہ اور پروفیسرز تک تلملا اٹھے، اور آپ ہیں کہ ان سب کے طعنوں، کوسنوں، گالیوں اور غصوں سے خوش ہو رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، سگریٹ چوم رہے ہیں۔ ادیبوں سے بھی انھیں بذریعہ فون اور تحریر کے وسیلے سے لڑنا بھڑنا پسند تھا۔ کئی دوستوں نے بتایا کہ بعض دفعہ نوبت گالی گلوج اور دھمکیوں تک جا پہنچتی۔ ایک آدھ دفعہ تو معاملہ روبرو پیش آیا، بلکہ دوبدو کی حد میں بھی داخل ہوگیا۔

ایک بار فون کیا کہ جے۔ این۔ یو سے دعوت ملی ہے۔ افسانہ ''لنگی'' سنانا ہے، آپ آجائیے۔'' عرض کیا شموئل صاحب افسانہ پڑھ چکا ہوں کیا کروں گا آکر؟ کہنے لگے۔ ''بہت سے پروفیسر ہوں گے، آپ آئیں گے تو تقریری اور تخریبی حملوں کا دفاع آسان ہوگا، کوئی معرکہ پیش نہ آیا تو سگریٹ پئیں گے۔'' شموئل صاحب نے وہاں افسانہ سنایا، اردو ہندی اور دوسری زبانوں کے متعدد اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور نئے لکھنے والے خاصی تعداد میں موجود رہے اور افسانے پہ مختلف حوالوں سے گفتگو بھی کی۔ پروگرام خوشگوار ماحول میں کافی کامیاب رہا۔ چند دنوں پہلے فون کیا کہ ایک افسانہ لکھا ہے ''پروفیسر کا حرم''، چاہتا ہوں اس کے کچھ حصے آپ سن لیں۔ میں نے کہا

میری خوش بختی۔ انھوں نے ابتدائی حصہ سنایا۔ عرض کیا پورا ہی سنا دیجیے۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد کہنے لگے ''گالیاں بہت سننی پڑیں گی۔'' ان سے کہہ نہیں سکا کہ جس طرح آپ دل کا غبار تخلیقی وسیلے سے نکالتے ہیں، دوسروں کو بھی اپنی بھڑاس نکالنے دیجیے۔ پھر بسا اوقات آپ تو لکھتے بھی اس لیے ہیں کہ 'آ بیل مجھے مار'۔

شموئل صاحب سے پہلی شناسائی ان کے افسانوی مجموعے ''سنگھاردان'' کے ذریعے تب ہوئی جب میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا۔ علی گڑھ کی ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ کوئی عمدہ افسانہ، ناول، یا مضمون کہیں شائع ہوتا تو اساتذہ اور طلبہ مختلف جہات سے ان پر ہفتوں گفتگو کرتے۔ اس سے پڑھنے کا شوق جاگتا اور فن کے اسرار و رموز سمجھنے کی تربیت ہو جاتی۔ کیا پتہ ہمارے اساتذہ کی اپنے طلبہ کی تربیت کے لیے یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی، یا غیبت اور فضولیات سے پرہیز کا جائز طریقہ؟ اس غائبانہ طویل ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کافی عرصے بعد پٹنہ میں ہوئی۔ وہاں قومی کونسل کا کتاب میلہ چل رہا تھا اور مجھے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر کی حیثیت سے چند دن گزارنے تھے۔ سو ایک رات کسی ثقافتی پروگرام کے اختتام پر ان سے سرسری ملاقات ہوئی۔ ساتھ میں عبدالصمد صاحب، پروفیسر اسلم آزاد صاحب اور کئی دوسرے شاعر و ادیب بھی تھے۔ لیکن یقین ہے کہ شموئل صاحب کو یہ ملاقات یاد نہ ہوگی۔ اس کے بعد کی بہت سی ملاقاتوں میں سے کئی ایک مجھے بھی یاد نہیں ہیں۔ ہاں فون پر ہمیشہ گفتگو ہوتی رہی اور ملاقاتیں بھی۔

نکلتے قد کے گورے چٹے، جامہ زیب انسان، چشمے کے پیچھے سے چمکتی آنکھیں، لمبے بال اور کلین شیو چہرہ انھیں ایک وقار عطا کرتے ہیں۔ دھیمے لہجے میں دلچسپ گفتگو، انگلیوں میں پھنسی سگریٹ، کش لینے کا انداز اور اساطیر، عالمی ادب، ملکی سیاست اور سائنس و نجوم کی باتیں انھیں ان کی ذات سے اٹھا کر فنکارانہ شخصیت کی مسند پر لا بٹھاتی ہیں۔

ملاقات کے مواقع کم ملتے ہیں، فون پر مہینے میں ایک دو بار ضرور گفتگو ہو جاتی ہے اور بالعموم انتہائی مختصر۔ صاحب سلامت، فکشن، تنقید یا سیاست کے حوالے سے دوڈھائی باتیں، معاصرین میں سے ایک دو کا ذکر اور بس۔ کبھی کبھی معاصرین فکشن نگاروں یا ان کے فن کے تعلق سے ایسے لہجے میں کوئی ایسا اسٹیٹمنٹ دیتے جس سے مخاطب اپنی رائے، دراصل منفی رائے کا اظہار کرے۔ رائے منفی ہوتی تو بات لنگڑاتے ہوئے کچھ آگے بڑھتی، مثبت ہوتی تو اور بھی مختصر تر ہو جاتی۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا اکثر ذکر آتا، پوچھتے کیا خیال ہے، اب کی بار کس کو ملے گا؟ جواب دیتا: ''یہ تو نہیں معلوم کس کو ملے گا، البتہ یہ اندازہ ہے کہ معیاری ناول کو نہیں دیا جائے گا۔'' فوراً کہتے: ''سنا ہے.....کو ملے گا، یا.....کو ملے گا۔'' انداز ایسا ہوتا جیسے کہہ رہے ہوں خراب تو یہی لوگ لکھتے ہیں۔ بارہا احساس ہوا کہ انھیں اس ایوارڈ کی خواہش ہے، خدا جانے کیوں؟ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ



ذاتی گفتگو میں انھوں نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا، اپنی یا اپنے فکشن کی تعریف نہیں کی۔ خواتین کے ذکر سے انھیں یک گونہ دلچسپی تھی۔ ایک بار فون کیا ''فلاں تاریخ کو نوئیڈا آ جایئے، مل بیٹھیں گے، ایک خاتون سے بھی ملواؤں گا، فلاں جگہ سے آ رہی ہیں، کافی.....۔'' عرض کیا ''شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کے درمیان رہنے اور گوسپ بننے والی خواتین سے مذبح کی سی بو آتی ہے، لگتا ہے آس پاس گدھ منڈلا رہے ہیں، ایسی مجلسوں میں کراہیت ہوتی ہے، برداشت نہیں کر سکوں گا۔ یہ سن کر خوب ہنسے۔ پھر پوچھا کیسی خواتین پسند ہیں؟ جواب دیا: جو بولڈ ہوں، معصوم صورت کے بجائے چنگیز صفت ہوں، پھولوں میں جیسے کٹار ہوں، جن سے فرسٹیٹ حضرات گھبرائیں، کترائیں، پیٹھ پیچھے برا بھلا کہیں۔ سن کر دیر تک ہنستے رہے، کہنے لگے آپ کی شاعری بہت اچھی ہوتی ہے۔ بات بدل گئی، پلان کا سراگم ہو گیا۔

باور کیجیے کہ شموئل صاحب جیسا معصوم، بے ضرر، بے ریا، بچوں سا شرارتی، حسن و خوبی کا عاشق اور زندہ دل تخلیق کار فی زمانہ بہت ہی کم ہیں۔ وہ اپنے اندرون و بیرون اور اپنی تحریروں میں بھی ایک جیسے ہیں، بالکل کھلی کتاب کی طرح۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول و افسانے بھی ویسے ہی واضح، شفاف، گل و شبنم سے پُرکشش اور اُن کی ہی شخصیت کی مانند دل میں اتر جانے والے ہیں۔ وہ بالعموم سماج، سیاست، سسٹم اور نفسیات پر اپنے فکشن کی بناء رکھتے اور مختلف موضوعات پر بیانیہ خلق کرتے ہیں۔ حسن، عشق، کشش اور کرپشن ان کے یہاں پلاٹ، مکالمے اور ماحول کی فضا سازی میں اہم وسیلے کے طور پر آتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے یہاں جنس بھی ہے، شعر و ادب میں رنگ، خوشبو اور کشش اسی سے پیدا ہوتے ہیں، اور انسان کی چار بنیادی ضرورتوں میں سے ایک جنس بھی ہے۔ لیکن یقین کیجیے کہ شموئل صاحب کے بیانیے میں بھی جنس تقریباً منٹو کے افسانوں کی مانند ہی کہانی کے تقاضے اور نفسیات کی ناگزیریت کی بنا پر آتا ہے۔ یہ جنس 'جنسِ ممنوعہ' نہیں 'جنسِ مباح' ہے۔ جس کی وکالت مولانا حسرت موہانی نے ادب میں جنس کے خلاف ترقی پسندوں کے پاس کیے ہوئے ریزولیوشن کی مخالفت کرتے ہوئے کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ناقدوں کی ایک جماعت جنس، عریانیت، فحاشی اور آرٹ کے تعلق سے کافی کنفیوژ ڈ رہی ہے اور کئی زمانے بیت جانے کے بعد وہ آج بھی نواب مرزا شوق اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے عہد سے نکلنے کو تیار نہیں ہیں۔ سو، منٹو اور عصمت کے بعد ہمارے عہد میں ناقد اور قاری کی جانب سے تمام فکشن نگاروں میں سب سے زیادہ شموئل احمد، یا غالباً صرف انھی پر جنسی اظہار اور فحاشی کے الزامات لگے۔ اور یقین جانیے کہ مجھے ناقد اور قاری کے بجائے حیرت بھی سب سے زیادہ قاری اور ناقد کو باؤنڈری لائن پر رکھنے والے شموئل صاحب پر ہوتی ہے، کہ وہ انٹرنیٹ کے موجودہ زمانے میں بھی عصمت اور منٹو کی طرح دفاعی پوزیشن میں آ جاتے ہیں، جنس کی توضیح و تعبیر کرنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ اردو ناقدین اور

قاری کا ایک بڑا طبقہ فکشن کی نئی حسیت، نئے تقاضوں اور نئے طور کے علاوہ جنسیت، جنسی حس اور جنس کی جمالیات سے واقف ہو چکا ہے۔ درسی نقادوں اور روایتی قاری کی بات الگ ہے۔

آیئے کچھ باتیں شموئل صاحب کی بھی سن لیں جو انھوں نے صدف اقبال کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی ہیں۔ صدف اقبال نے جب ان سے سوال کیا کہ آپ افسانوں میں جنس اور جنسی نفسیات کو بطور چٹخارہ استعمال کرتے ہیں ایسا کیوں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ: ''میں نے اپنی زندگی میں کل تیس افسانے لکھے ہیں جن میں مشکل سے پانچ ایسے افسانے ملیں گے جن میں جنس کا رنگ گہرا ہے۔ کچھ افسانوں میں جنس کی ہلکی سی آمیزش ہے اور زیادہ تر افسانے ایسے ہیں جن میں جنس کیا عورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ لیکن میرا قاری ان افسانوں کو یاد رکھتا ہے جہاں جنس کا رنگ ہے، اور چٹخارے لیتا ہے۔ 'بہرام کا گھر، القمبوس کی گردن، چھگمانس، کاغذی پیراہن، باگمتی جب ہنستی ہے، ایسے افسانے ہیں جہاں عورت دور دور تک نظر نہیں آتی، لیکن ناقد بھی آنکھیں موندے رہتا ہے۔'' شموئل صاحب کو اردو کے درسی ناقدین سے یہ شکایت ہے کہ وہ علاقائی اور عالمی ادب نہیں پڑھتے اور فکشن کے فنی رچاؤ، اس کی نزاکت اور اس کے ٹریٹمنٹ سے کافی حد تک ناواقف ہیں۔ وہ جنس اور افسانے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے جنس کی توضیح اور افسانوں میں اس کے بیان کے تعلق سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں: ''اصل میں نام نہاد دانشوروں نے اخلاقیات کا زہر دے کر سیکس کو مارنے کی کوشش کی ہے۔ سیکس مرا تو نہیں زہریلا ہو کر زندہ ہے۔ میرے افسانے اسی زہر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایک لڑکی اگر چست لباس میں سامنے سے گزر جاتی ہے تو نگاہیں اس طرف اٹھ جاتی ہیں اور جذبات بھی مشتعل ہو سکتے ہیں لیکن آپ کی بہن جب اس طرح کا لباس پہنتی ہے تو آپ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی۔ قصور چست لباس کا نہیں ہے، قصور اس زہر کا ہے جو آپ کی رگوں میں پھیل چکا ہے جسے چست لباس اجاگر کرتا ہے۔ میرے افسانے بھی یہی کام کرتے ہیں۔ قاری کے اندر اگر جنسی گھٹن ہے تو ''ظہار'' اور ''اونٹ'' جیسے افسانوں سے گزرتے ہوئے اس کی جنسی بدعنوانیاں سامنے آنے لگتی ہیں، اور وہ خود کو پارسا ثابت کرنے کے لیے چیخنے لگتا ہے، اور مجھے برا بھلا کہنے لگتا ہے۔'' شموئل صاحب کو یہ شکایت بھی ہے کہ لوگ ان کے سنجیدہ افسانوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اسی انٹرویو میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے فرقہ پرستی، دہشت گردی، سیاسی اور سماجی بدعنوانیوں پر بھی افسانے لکھے ہیں، ان افسانوں پر ٹیلی فلمیں بھی بنی ہیں، لیکن لوگ مجھے بدنام کرتے ہیں کہ میں صرف سیکس پر لکھتا ہوں۔'' صدف اقبال کے یہ سوال پوچھے جانے پر کہ کیا آپ منٹو کے مقلد ہیں شموئل صاحب نے سختی سے انکار کیا اور خود کو بڑا ادیب کہلانے کے بجائے اپنی انفرادیت پسندی کے اعتراف پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ جنس میرے افسانوں کا موضوع نہیں وسیلہ ہے جس کے ذریعے میں انسان کے باطن کی بازیافت کرتا ہوں۔ اپنے اور منٹو کے افسانوں



میں جنس کی پیش کش کے فرق کی توضیح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ منٹو جنس کی جمالیات کے بجائے اسے کروڈ شکل میں پیش کرتے ہیں، جب کہ میں جنس کی جمالیات سے کام لیتا اور جسم کا حسن بیان کرتا ہوں۔ شموئل صاحب کے خیال میں ہر فنکار اپنے عہد کا اسیر اور اپنے عہد کے مسائل کا نباض ہوتا ہے۔ ان کی رائے یہ بھی ہے کہ ہر عہد کے تخلیق کار کا بیانیہ اس کے عہد کی فکر، اس کے مزاج اور اس کے سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کے اثرات کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ وہ منٹو اور اپنے عہد کا تقابل و توازن کرتے ہوئے ان نتائج پر پہنچتے ہیں کہ: ''منٹو تو منگو کوچوان کے ہاتھوں انگریز کو پٹوا سکتا تھا لیکن ہم اپنا غبار کس پر نکالیں؟ ہمارا تو رہبر ہی رہزن بن گیا ہے۔ منٹو کے لیے جمہوریت کا مسئلہ نہیں تھا، لیکن آج جمہوریت اٹھائی گیروں سے ہم بستر ہوتی ہے۔ کرپشن کی مہاماری ہر طرف پھیل گئی ہے اور ہم کتے کی طرح زنجیر سے بندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ منٹو کے زمانے میں فرقہ وارانہ فسادات ایک حادثہ تھا، آج فساد ایک منصوبہ ہے جو نافذ کیا جاتا ہے۔ آج ہم اپنی وراثت سے محروم کیے جا رہے ہیں۔ منٹو کے زمانے میں فساد پر جو کہانیاں لکھی گئیں ان میں خوں ریزی اور بربریت کا ذکر ملتا ہے، اور آج جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان میں فساد کے بعد پیدا شدہ حالات اور مسائل کے ذکر کے ساتھ اپنی وراثت سے محروم کیے جانے کا خدشہ ہے۔ بابری مسجد جب ٹوٹی تو ایک فرقہ خوش تھا کہ دوسرے فرقے کو اس کی وراثت سے محروم کر دیا گیا۔''

شموئل صاحب افسانہ نگار کے لیے خارجی مشاہدے اور مطالعے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، کہ افسانوں کے موضوعات، واقعات، کردار، کردار کے حالات اور فضا تو ڈرائنگ روم سے باہر کی دنیا میں پائے جاتے ہیں جن کی تھوڑی سی تزئین اور تربیت کر کے تخلیق کار اسے افسانوی دنیا کا باسی بناتا ہے، بیانیہ قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے سوانحی ناول 'اے دل آوارہ' میں تحریر کرتے ہیں کہ: ''افسانہ لکھنے کے لیے گھر سے باہر زمین پر چلنا پڑتا ہے۔ جس نے سڑکوں پر مٹر گشتی نہیں کی، اپنے شہر کو ہر رنگ میں نہیں دیکھا، نہ اس کا اجالا نہ اندھیرا، نہ رات کا سناٹا، نہ میلے نہ ٹھیلے، نہ گلیاں نہ ریلیاں وہ کہانی کیا لکھے گا؟ بہت محفوظ زندگی جینے والوں کی تخلیقیت آہستہ آہستہ مرنے لگتی ہے۔ کہانی لکھنے کے لیے کتابوں سے زیادہ آدمی کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی کا چہرہ ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر اس کی زندگی کی کہانی لکھی ہوتی ہے۔ ادیب اپنی دور رس نگاہوں سے اسے پڑھتا ہے اور لفظوں کے دھاگے میں موتی پروتا ہے۔'' اسی ناول میں ''سنگھاردان'' کو حقیقی واقعے پر مبنی بتاتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ: ''کہانی سنگھاردان مجھے راحت کیمپ میں ملی۔ بھاگلپور فساد میں طوائفوں کا بھی راحت کیمپ لگا تھا۔ وہاں ایک طوائف نے رو رو کر مجھے بتایا تھا کہ دنگائی اس کا موروثی سنگھاردان لوٹ کر لے گئے..... یہی تو ایک چیز آبا و اجداد کی نشانی تھی..... کہانی یہاں پر تھی۔ موروثی سنگھاردان کا لٹنا..... اپنی وراثت سے محروم ہو جانا..... پہلے جان و مال کے لٹنے کا خوف تھا..... اب وراثت سے محروم ہونے کا خدشہ.....'' ان

کے افسانے 'چھگمانس' کی اساس بھی بھاگلپور فساد کا وہ واقعہ ہے جس میں ایک فرقے کے لوگوں کو قتل کر کے لاشوں کو کھیتوں میں دبا دیا گیا تھا اور انھیں چھپانے کے لیے کھیتوں میں گوبھی کی کاشت کی گئی تھی۔

فکشن میں تخلیقی اور ادبی زبان کی اپنی ایک الگ اہمیت و معنویت ہوتی ہے، اس کا حسن اور وقار ہوتا ہے، تہہ داری ہوتی ہے۔ لیکن شموئل صاحب اس کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فکشن میں بہت ہی سہل، سادہ، شگفتہ، عام فہم اور بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں، گو کہ وہ افسانوی زبان میں تشبیہ و استعارے سے انکار نہیں کرتے، تاہم ان کے مطابق فکشن کی زبان کو اک ذرا کھردری اور بول چال سے قریب ہونی چاہیے۔ علاقائی اثرات کو بھی وہ فکشن کا ناگزیر حصہ مانتے ہیں۔ ناول کے مقابلے میں افسانے کو وہ مشکل فن مانتے ہیں جس میں فنی ریاضت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور ایجاز و ایمائیت اس کی جان۔ بقول ان کے ایک اچھا افسانہ موضوع سے ہٹ کر کچھ بھی قبول نہیں کرتا۔ وہ ناول و افسانے کی ضخامت کے حوالے سے قدیم روایتی تعریف کا انکار کرتے، اور کہتے ہیں کہ جس طرح ساٹھ صفحات پر مشتمل بیانیہ بھی کامیاب ناول ہو سکتا ہے، اسی طرح ساٹھ صفحات پر مشتمل افسانہ بھی طویل مختصر افسانہ ہو سکتا ہے ناول نہیں۔

اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ شموئل احمد صاحب نے فکشن کی دنیا میں ایک نئی راہ بنائی ہے، ملک اور سماج کے اہم مسائل کو انھوں نے بڑی خوبصورتی اور اثر انگیز طریقے سے اپنے ناول و افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ وہ ایسی سہجتا، سجلتا اور شگفتگی سے کہانیاں بیان کرتے ہیں کہ داستان کے سحر جیسا احساس ہوتا اور قاری کو اپنی ہی، یا جانے پہچانے، دیکھے بھالے لوگوں کی روداد معلوم ہوتی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں اور ناول سماج، سماجی انسان اور انسانی شعور و نفسیات کے خمیر سے نمو کرتے، ارتقا پذیر ہوتے اور حتمی انجام پر ختم ہوتے ہیں۔ فکشن کے بیانیے کو سائنس، نجوم، ہیئت اور اساطیر کی آمیزش سے دھنک رنگ بنانے کی ان کی کوشش کامیاب رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غیر ملکی اور متعدد علاقائی زبانوں میں ان کی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ان کے فن پر اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور پنجابی زبانوں کے ناقدین بھی لکھ رہے ہیں، ان کی فنی کاوشوں کی ستائش کر رہے ہیں۔

پندرہ دسمبر کو شام کی چائے بنا رہا تھا کہ موبائل کی کوئل کوکنے لگی۔ اسکرین پر شموئل صاحب کا نام ابھرا۔ کان سے لگایا تو وہی مانوس لہجے کی آواز سنائی دی: ''عباد صاحب کیسے ہیں؟'' فوراً محسوس ہوا کہ شموئل صاحب کی آواز میں ایک نہیں کئی سُر کم ہیں۔ زندگی کی تابانی، خوشی اور لہک غائب ہیں۔ حسب سابق جواب دیا: خدا کا شکر ہے اچھا ہوں، مست ہوں۔ آپ بتائیں کیسے ہیں؟ ''عباد صاحب میں اچھا نہیں ہوں۔'' انھوں نے کمزور آواز میں کہا۔ چند ثانیے وہ خاموش رہے، میں بھی خاموش رہا، کہ دل زور زور سے دھڑک



رہا تھا۔ ''میں بیمار ہوں۔'' بالکل بچوں کے سے لہجے میں انھوں نے اپنی بات مکمل کی۔ محسوس ہوا خاموشی کو چاک کرنے والی یہ آواز گھنٹے بھر بعد سنائی دی۔ ''حد کرتے ہیں شموئل صاحب! آپ نے تو ڈرا ہی دیا۔ میں نے انھیں تسلی دینے سے پہلے حیرت انگیز طور پر پہلے خود کو سنبھالا، اور کہا اچھے ہو جائیں گے، سب بیمار ہوتے ہیں اور اچھے ہو جاتے ہیں، آپ بھی انشاء اللہ جلد اچھے ہو جائیں گے۔'' دوسری طرف سے بے حد مایوسی میں ڈوبی ہوئی آواز آئی: ''عباد صاحب مجھے کینسر ہو گیا ہے۔'' اب مایوسی نے میرے حواس کو گرفت میں لے لیا تھا، پھر بھی میں نے انھیں حوصلہ دلایا، کینسر سے اچھے ہونے والے مریضوں کی انھیں ایک لمبی فہرست سنائی، ان سے اچھی اچھی باتیں کیں، لیکن شاید شموئل صاحب جو دیکھ رہے تھے، میں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ دو دن بعد فون کیا تو بند آ رہا تھا، تیسرے، پانچویں، ساتویں دن بھی یہی صورت رہی اور پھر چند دنوں بعد وہ خبر سنائی دی جو دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے دلوں کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔

یقین ہے آئندہ شموئل احمد صاحب کے فن اور ان کی شخصیت کا زیادہ، سنجیدگی، زیادہ توجہ اور باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے گا، کہ وہ اچھے دوست، زندہ دل انسان اور اہم تخلیق کار تھے۔

◀◀ ● ▶▶

Department of Urdu
Faculty of Arts,University of Delhi
Delhi -110007
(M)9810532735
bakarabbad@yahoo.co.in

نام کتاب: تعاقب زرد موسم کا
صنف: افسانے
مصنف: راجیو پرکاش گرگ ساحر
سن اشاعت: ۲۰۲۳ء
صفحات: ۳۷۵
قیمت: ۶۰۰/روپئے
ملنے کا پتہ:
Matterling Publishers
1870, 1st Floor Lekhraj Dollar,
India Nagar
Lucknow

نام کتاب: راستے خاموش ہیں
صنف: افسانہ
مصنف: مکرم نیاز
سن اشاعت: ۲۰۲۲ء
صفحات: ۱۹۲
قیمت: ۳۰۰/روپئے
ملنے کا پتہ:
Tameer Publications
New Malakpet, Hyderabad
(India)

- **یادیں**
- **محمد پرویز**

# کچھ یادیں، کچھ باتیں: شموئل احمد

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی میرے استاد تھے۔ جب میں ایم۔اے کر رہا تھا، اس وقت وہ شعبہ اردو بھاگل پور میں ہی پروفیسر تھے۔ ان کا گھر میرے گھر سے بالکل قریب تھا۔ ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کے پاس نئی نئی کتابیں آتی رہتی تھیں۔ میں ایک شام ان کے پاس بیٹھا تھا، تو دیکھا ان کی میز پر افسانوی مجموعہ ''عنکبوت'' رکھا ہے۔ اسے اُٹھا کر سرسری طور پر نظریں دوڑانے لگا۔ میری نظر مجموعہ میں شامل افسانہ ''ظہار'' پر ٹھہر گئی۔ اس لئے کہ میں وکیل بن چکا تھا۔ مسلم لاء میں ''ظہار'' لفظ تھا۔ میں نے سوچا سر سے کہوں، سر یہ مجموعہ مجھے پڑھنے کو دیں۔ اس سے پہلے ہی انہوں نے کہا کہ میرے پاس دو کاپیاں ہیں۔ آپ ایک رکھ لیں۔ پھر شموئل احمد صاحب کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ مناظر صاحب نے ان کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا۔

''سر! شموئل احمد صاحب پٹنہ کے ہیں۔'' انہوں جلدی سے کہا۔

''نہیں نہیں وہ تو یہیں کے ہیں اور شرجیل احمد خاں کے بھائی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہی شرجیل احمد خان جنہوں نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے؟''

انہوں نے کہا۔

''ہاں وہی ہیں۔'' میں شرجیل احمد خان سے ایک بار ملا تھا، کچھ کام سے ان کے پاس گیا تھا۔ اس وقت میرے پاس 'تعمیر ہریانہ' کی ایک کاپی تھی۔ شرجیل صاحب نے دیکھا تو انہوں نے کہا۔

''بابو یہ رسالہ مجھے دوگے؟'' میں نے کہا۔

''جی سر! لے لیجیے۔'' رسالے کے قیمت دو روپے تھی۔ وہ پیسہ دینے لگے تو میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تک میں یہ نہیں جانتا تھا کہ شموئل احمد ہمارے ہی محلے کے ہیں اور اسی محلے میں ان کا مکان ہے۔

میں نے ''عنکبوت'' میں شامل سبھی افسانے پڑھے اور خاص طور سے ''ظہار'' کو پڑھا۔ کہانیاں تو سبھی اچھی ہی تھیں لیکن مجھے ''مصری کی ڈلی'' اور ''منرل واٹر'' زیادہ اچھی لگیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر



محسوس ہوا کہ ان کا سلوب دوسرے افسانہ نگاروں سے کچھ الگ ہے۔

وہ سال دو سال میں بھاگل پور آتے رہتے تھے۔ سوچتا ان سے ملوں۔ جب بھی ملنے جاتا معلوم ہوتا وہ آج ہی شام میں چلے گئے۔ کئی بار ملنے کی کوشش کی مگر ملاقات نہیں ہوئی۔

شاعر جوثر ایاغ صاحب اور شہزور اختر صاحب شموئل احمد صاحب سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر قنبر علی جو دور جدید کے نامور شاعر و ادیب ہیں، شموئل احمد صاحب کے رشتے دار تھے اور ڈاکٹر قنبر علی کے جوثر ایاغ اور شہزور اختر سے اچھے مراسم تھے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا وہ آنے والے ہیں یا آ کر چلے گئے۔

نومبر ۲۰۱۹ء کی بات ہے جوثر ایاغ صاحب سے راستے میں ملاقات ہوئی۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے بتایا کہ شموئل احمد آئے ہوئے ہیں اور دو تین دن رہیں گے۔ میں نے جوثر ایاغ سے کہا کہ کل ہی صبح ان سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی رات میں نے ایک دوست ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن سے بات کی اور ان سے کہا کہ کل صبح آئیں۔ انہوں نے دریافت کیا۔

''کل دعوت ہے کیا؟'' میں نے کہا۔

''آپ کے لئے دعوت ہی ہے۔ دور جدید کے ایک بڑے فکشن نگار سے ملنا ہے۔ وہ اپنے گھر آئے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''صبح نو بجے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر آ گئے اور ہم لوگ شموئل احمد سے ملنے نکلے۔ جب ہم ان کے گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ کچھ دیر قبل ہی وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملنے گئے ہیں۔ سوچنے لگا کس رشتے دار کے یہاں گئے ہوں گے؟ جوثر بھائی نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر قنبر علی کے یہاں جاتے ہیں۔ میں ان کے ہی گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں پہلے بھی ڈاکٹر قنبر علی خاں صاحب کے یہاں جا چکا تھا اور انکا بھتیجہ میرا دوست تھا۔ دروازے پر ڈاکٹر قنبر علی کے بڑے بھائی فخر علی خان (مرحوم) بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا شموئل احمد صاحب آپ کے یہاں ہیں؟''

''ہاں وہ یہی ہیں۔'' یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ان سے شموئل احمد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد شموئل احمد آ گئے۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔، ان کی تصویر دیکھ رکھی تھی۔ ہم لوگوں نے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ہاتھ ملایا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے وقت کہا۔

''جہنم کی ایک وادی ہے جس سے خود جہنم سو بار پناہ مانگتی ہے اور اس میں ایسے علماء داخل ہوں گے

جن کے اعمال دکھاوے کے ہیں۔'' پھر میں نے کہا۔

''بانجھ عورت سے بہتر گھر کے کونے میں رکھی چٹائی ہوتی ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ مسکراتے ہوئے اپنے پاس بیٹھا لیا۔ انہوں نے میرا نام اور گھر کا پتہ پوچھا۔ میں کیا کرتا ہوں ایسے کئی سوالات پوچھ ڈالے۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ اس وقت بحیثیت مہمان لکچرار ایس۔ ایم کالج بھاگل پور اور بھاگل پور یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا اور وکالت بھی کر رہا تھا۔ میری بات سن کر انہوں نے کہا کہ پرویز صاحب آپ نے اپنے آپ کو کئی حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پھر انہوں پوچھا کہ شموئل احمد کو آپ نے کتنا پڑھا ہے۔

میں نے کہا۔'' سر آپ کا اصل نام شموئل احمد خان ہے۔ آپ شموئل احمد کے نام سے لکھتے ہیں۔ ۴/مئی ۱۹۴۳ء کو یہیں بھیکن پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۸ میٹرک کیا، ۱۹۶۰ میں انٹر، ۱۹۶۸ء میں سول انجینئرنگ رانچی یونیورسٹی سے کیا پھر بوکارو میں بحیثیت انجینئر بحال ہوئے اور ۲۰۰۳ء میں چیف انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کی پہلی کہانی ''چاند کا داغ'' تھی جو رسالہ صنم ۱۹۶۳ء پٹنہ سے شائع ہوئی تھی۔ آپ کو علم نجوم سے گہرا لگاؤ ہے شاید یہی وجہ ہے کہ آپکی کئی کہانیوں میں علم نجوم کی جھلک ملتی ہے۔ آپ کی کتابوں میں ''سنگھاردان''، ''بگولے''، ''القموس کی گردن''، ''چمرا سر''، ''عنکبوت''، ''ندی''، ''مہاماری''، ''گرداب''، '' اے دل آوارہ'' وغیرہ ہیں۔ آپ کے جو افسانے مجھے پسند ہیں ان میں ''سنگھاردان''، '' ظہار''، '' مصری کی ڈلی''، ''جھاگ''، ''باگمتی جب ہنستی ہے''، ''آخری سیڑھی کا مسافر''، '' آدمی اور مین سوئچ''، '' بگولے''، ''آنگن کا پیڑ''، ''برف میں آگ''، ''بہرام کا گھر''، ''منرل واٹر''، '' کہرے''، ''بدلتے رنگ''، ''نملوس کا گناہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کے کئی افسانوں کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ کو ۲۰۱۲ء میں فکشن کے لئے فروغ اردو ادب دوحہ قطر کا عالمی اعزاز حاصل ہوا۔ آپ کے افسانے ''کاغذی پیرہن''، '' آنگن کا پیڑ'' اور ''سنگھاردان'' وغیرہ پر ٹیلی فلمیں بھی بن چکی ہیں۔''

میں نے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا تھا۔ فخر علی خان جو بیٹھے میری باتیں سن رہے تھے، خوب ہنسے اور کہا کہ آپ نے تو حافظ کی طرح سبق ہی سنا دیا۔ شموئل احمد بار بار کہہ رہتے ''کیا بات ہے۔'' انہوں نے ہم لوگوں کو دو گھنٹوں سے زیادہ وقت دیا۔ بہت سارے ادبی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ میرا موبائل نمبر بھی لیا۔ ہمیں چھوڑنے گیٹ تک آئے اور کہا آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ آتے وقت انہوں نے پوچھا۔

'کیا کل آپ سے ملاقات ہو سکے گی؟'' میں نے کہا۔''

کیوں نہیں سر۔''

میں دوسرے دن ان سے ملنے گیا۔ وہ گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے ہی گیٹ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔



''ارے پرویز! کیسے ہیں آپ؟''

میں نے سلام کیا۔ پھر ہم ایک روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ چائے ناشتے کا سلسلہ چلا۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہی۔ میں اردو افسانے پر کام کر رہا تھا۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔

''سر! آپ کے پاس آپ کا پہلا افسانہ ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''نہیں پرویز صاحب پہلا افسانہ تو نہیں ہے۔''

ان کے پاس اس دن بہت دیر تک رکا۔ میں اپنا ایک افسانہ ساتھ لے گیا تھا۔ وہ میں نے انہیں پڑھنے کے لئے دیا۔ انہوں نے افسانہ پڑھا اور کہا۔

''اچھی کہانی ہے اور منظر نگاری بہت اچھی ہے۔ آپ تو کہانی اچھی لکھتے ہیں۔ اسی طرح لکھتے رہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جی سر!'

'انہوں نے اپنے بہت سارے تجربے شیئر کیے۔ اردو افسانے کی تکنیک کے بارے میں بھی بتایا۔ اردو کی جانب لوگوں کے کم ہوتے رجحان کے بارے میں باتیں کی۔ ادب سے متعلق بھی کئی نیک مشوروں سے نوازا۔ آنے لگا تو انہوں نے اپنے ساتھ کئی تصویریں لیں۔ میں نے بھی ان سے بہت سارے سوالات کئے۔ آتے وقت انہوں بتایا کہ میں آج ہی شام جا رہا ہوں۔ زیادہ تر پٹنہ یا پھر حیدرآباد میں رہتا ہوں۔ مجھے شموئل احمد سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

دو تین دن گذرنے کے بعد ان کی کال آئی اور بتایا کہ وہ خیریت سے پٹنہ پہنچ گئے ہیں۔ مہینے میں ایک دن ان سے ضرور بات ہو جاتی۔ میں خود بھی اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ کبھی کبھی ان کی کال نہیں اٹھا پاتا تو رات میں ان سے ضرور بات کرتا۔ انہوں نے مجھ پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ اکثر اپنے افسانے واٹس ایپ پر بھیجتے رہتے تھے۔

ایسے ہی باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ وقت گذرتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ ایک دن میں نے انہیں کال کیا کہ سر آپ کا پہلا افسانہ مل گیا ہے۔ پہلا جملہ جو انکی زبان سے نکلا وہ یہ تھا۔

''پرویز صاحب آپ تو جادوگر ہیں۔'' انہوں نے کہا کہ آپ مجھے افسانہ بھیج سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سر! کتاب آپ کو دوں گا جس میں یہ افسانہ شامل ہوگا۔'' انہوں نے پوچھا۔

''کب تک؟'' میں نے کہا۔

''سر! بہت جلد۔''

''اردو کے ۱۲۳ افسانہ نگار اور انکا پہلا افسانہ'' کے نام سے یہ کتاب منظر عام پر آ چکی ہے جس میں شموئل احمد کا افسانہ ''چاند کا داغ'' بھی شامل ہے۔ میں ان کو کتاب دینا چاہتا تھا۔ ان کے آنے کا انتظار کرتا

رہا۔وہ کہتے رہے جلد ہی آؤں گا ،مگر۲۲ دسمبر۲۰۲۲ء کو ایک بری خبر ملی کہ شموئل احمد ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مجھے ذاتی طور پر بہت افسوس ہوا۔ایک اور ادبی گارجین میرے درمیان سے چلے گئے ۔ مجھے اس بات کا دکھ رہا کہ ان کو اپنی کتاب نہیں دے پایا۔ وہ بہت ہی دلفریب ، پر بہار شخصیت کے مالک تھے اور نثری میدان کے ایک بڑے کھلاڑی بھی۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔آمین ثم آمین!

◂◂ ● ▸▸

Sombert Barahpura
Bhagalpur. Bihar
7870304445

**اقبال حسن آزاد**

کی تنقیدی کتاب

**نثری اصناف ادب**

**اور**

**طنز و مزاح کی روایت**


| | | |
|---|---|---|
| نام رسالہ: دبستان ہمالہ، رجوری، جموں<br>سہ ماہی رسالہ<br>ترتیب وتہذیب: فاروق مضطر<br>سن اشاعت: اپریل تا جون ۲۰۲۳ء<br>صفحات: ۶۲<br>قیمت: مفت | | نام رسالہ: ادبی جرنل ۲۰۲۳ء<br>سالانہ<br>مدیر: ڈاکٹر ہمایوں اشرف<br>سن اشاعت: ۲۰۲۳<br>صفحات: ۵۵۲<br>قیمت: ۵۰۰/روپے |




## ● شموئل احمد

# مرگھٹ

لاش اٹھالی گئی تھی.....

اونٹ کے گھٹنے کی شکل کا وہ آدمی اب بھی وہاں موجود تھا۔اس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور گال قبر کی طرح اندر دھنسے ہوئے تھے۔لگتا تھا کسی نے چہرے کی جگہ ہڈیاں رکھ کر چمڑی لپیٹ دی ہو۔آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور کنپٹیوں کے قریب آنکھ کے گوشے کی طرف کوّوں کے پنجوں جیسا نشان بنا ہوا تھا۔وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ٹک خلا میں کہیں گھور رہا تھا.....

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھر چلنے کی بات کی تو اس نے مری ہوئی آنکھوں سے ایک بار میری طرف دیکھا اور ایک لمبی سی سانس لی جیسے تازہ ہواؤں کو پھیپھڑوں میں بھرنا چاہتا ہو.....لیکن بارود کی بو اس کے نتھنوں میں سرائت کر گئی اور بارود کے ذرّات جیسے حلق میں پھنس سے گئے.....

وہ کھانسنے لگا اور مسلسل کھانسنے لگا، یہاں تک کہ گلے کی رگیں پھول گئیں۔آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگیں۔ چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ میں جلدی جلدی اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔مسلسل کھانسنے سے اس کے منھ میں بلغم بھر آیا تھا۔کسی طرح کھانسی رُکی تو آستین سے منھ پونچھتے ہوئے اس نے کہا:

''اب تو سانس لینا بھی.....''

تب میں نے پوچھا کہ مرنے والا اس کا رشتہ دار تو نہیں تھا۔ میری اس بات پر اس کی مُردہ آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چنگاری سی سلگی تو مجھے لگا میرا یہ سوال یقیناً بے تکا تھا۔ جہاں روز کا یہ معمول ہو وہاں یہ بات واقعی کیا معنی رکھتی تھی کہ کون کس کا.....

دراصل اس علاقہ میں ایک مدت سے آسمان کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ ہر طرف آگ برستی ہے۔ ہواؤں میں سانپ اڑتے ہیں۔ان کا سر کچلنے کے لئے راجہ کے سنتری بکتر بند گاڑیوں میں گھومتے رہتے ہیں ،لیکن زمین سخت اور آسمان دور ہے اور کب کون کس موڑ پر زد میں آجائے کہنا مشکل ہے۔

ابھی ابھی ایک آدمی زد میں آگیا تھا۔اور سب کچھ حسب معمول چشم زدن میں ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ایک دکان سے سبزیاں خرید رہا تھا کہ ایک گاڑی رکی تھی.....دو سوار اترے تھے.....ایک دھماکہ ہوا

تھا.....اور سبزیاں خریدنے والا اسی پل.....

دونوں سوار دیکھتے دیکھتے نگاہوں سے کہیں اوجھل ہو گئے تھے۔تب گشت لگاتے ہوئے راجہ کے سنتری بکتر بند گاڑیوں میں آئے تھے اور لاش اٹھالی گئی تھی۔وہاں پر گرا ہوا خون دھوپ کی پیلی روشنی میں اب بھی کہیں کہیں جم کر تازہ کلیجی کی مانند چمک رہا تھا۔اور بھیڑ چھٹنے لگی تھی، دکانوں کے شٹر گرنے لگے تھے اور دیکھتے دیکھتے سنّاٹا چھا گیا تھا۔

ہم خاموشی سے سر جھکائے ایک طرف چلنے لگے۔سڑک دور تک سنسان تھی۔دونوں طرف وحشت زدہ عمارتیں گم سم سی خاموش کھڑی تھیں.....یکا یک دور کہیں کسی کتے کی رونے کی آواز ایک لمحہ کے لئے فضا میں چیخ بن کر ابھری اور ڈوب گئی۔اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

پھر اس نے آہستہ سے کہا تھا:

''یہ مرگھٹ ہے.....ہم مرگھٹ کے لوگ ہیں.....''

''ہاں.....یہ مرگھٹ ہے.....یہاں سب اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں.....'' میں نے بھی جواب میں ٹھنڈی سانس لی۔

ایک بکتر بند گاڑی زنّاٹے بھرتی ہوئی قریب سے گذر گئی۔

''بچارے راجہ کے سنتری.....'' وہ ہنسنے لگا۔

''راجہ کیا کرے.....؟''

''وہ کر بھی کیا سکتا ہے.....''

''راجہ خود جانتا ہے وہ کچھ نہیں کر سکتا.....''

''اس طرح جینے کا کیا مطلب ہے.....؟''

''اور اس طرح مرنے کا بھی کیا مطلب ہے.....؟''

ہم نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

سامنے الکٹرک پول کے قریب ایک خارش زدہ کتا پیٹ میں منھ چھپائے سو رہا تھا۔ناگہاں کسی مکان میں زندگی کے آثار نظر آئے.....ایک کھڑکی کھلی۔کسی نے باہر تھوکا اور کھڑکی بند ہو گئی۔کتّے نے ایک بار سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا اور پھر سو گیا۔

سنّاٹا یکا یک پُر ہول ہو گیا تھا، ہوائیں سہمی سہمی سی گذر رہی تھیں۔درختوں کے پتّے کسی مریض کی طرح کروٹ بدل رہے تھے۔سنتری کی گشت لگاتی ہوئی گاڑیاں کبھی پاس معلوم ہوتی تھیں.....کبھی



دور.....مستقل گھوں گھوں کی ان کی آواز سنّاٹے کا حصہ سی بن گئی تھی۔

یکا یک وہ چلتے چلتے رک گیا اور خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔پھر اس نے اپنی مُردہ نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور اپنی کانپتی ہوئی سرد انگلیوں سے مجھے چھوا تو میں سہم گیا۔مجھے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔

''کتنا کریہہ اور بھدّا ہے یہ منظر.....خوف سے کانپتے ہوئے ہم.....''

''کیا ہم موت سے لڑ رہے ہیں.....؟''

''ہم ہر لمحہ.....ہر پل.....زندگی کی بھیک مانگ رہے ہیں.....اور دونوں میں فرق ہے.....''

پھر اس نے اپنی سرد انگلیوں کی گرفت میرے بازوؤں پر سخت کرتے ہوئے کہا:

''جانتے ہو کیا ہوتا ہے جب موت منھ پر تھوک کر زندگی بخش دیتی ہے.....''

میں خوف اور حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

لمحہ بھر توقف کے بعد دور جیسے خلا میں گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

''میرے ساتھ یہی ہوا ہے.....''

''کیا.....؟''

''اُس بس میں میں بھی سوار تھا.....''

وہ خاموش ہو گیا اور تھکی تھکی سی سانسیں لینے لگا.....جیسے دور سے چل کر آ رہا ہو.....اس نے اپنی بے جان نگاہوں سے ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھا۔اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔میں نے محسوس کیا کہ کچھ کہتے ہوئے وہ بے حد اذیت سے گذر رہا ہے۔آواز اس کے گلے میں پھنس رہی ہے۔کچھ دیر مجھے اسی طرح گھورتا رہا پھر پھنسی پھنسی سی آواز میں گویا ہوا۔

''سب کچھ اچانک ہوا تھا۔ایک موڑ پر بس رکی تھی اور انھوں نے بندوقیں تان لی تھیں۔میں اپنی سیٹ میں دبک گیا تھا.....وہ تڑاتڑ کھوپڑیوں میں سوراخ کر رہے تھے۔موت بالکل میرے سامنے کھڑی تھی اور میں کونے میں دبکا ہوا موت سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا.....''

''اور تم بچ گئے.....!''

''اور میں بچ گیا.....موت میرے منھ پر تھوک کر چلی گئی۔اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکی.....''

''ہم کیوں نہیں یہ علاقہ چھوڑ دیں.....'' میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا.....؟''

''پھر.....؟''اس نے ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ ابھی ابھی اس موڑ پر جو آدمی مرا ہے وہ کوئی اور نہیں خود تم ہو.....؟''

میں خاموش رہا۔

''تم نہیں سمجھو گے.....اس لئے کہ تم ان لوگوں میں ہو جو علاقہ چھوڑنے کی بات کرتے ہیں.....''تب میں نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور مارنے والا.....کیا مارنے والا دوسرا ہے.....؟''

''آہ.....!''وہ تڑپ کر خاموش ہو گیا۔

''یہی بنیادی فرق ہے میرے دوست.....''

''ہاں یہی بنیادی فرق ہے.....ہم یہی نہیں سمجھتے۔''

''مرنے والے بھی ہم ہیں اور مارنے والے بھی ہم ہیں۔''

''پھر.....؟''

''پھر کیا.....؟''

''ہم کیا کریں.....؟''

''ہم کیا کر سکتے ہیں.....؟''

''اور راجہ.....؟''

''راجہ بھی کیا کر سکتا ہے.....؟''

''ہاں راجہ بھی کیا کر سکتا ہے.....؟''وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

''شاید ہماری طرف آسمان کا رنگ اسی طرح سرخ رہے گا۔''

''اور ہواؤں میں سانپ اڑتے رہیں گے.....''

''اور فضا میں بارود کی بو رچی رہے گی.....''

''اور راجہ کے سنتری بکتر بند گاڑیوں میں گھوما کریں گے.....''

''ہم روئے زمین کے انتہائی کریہہ اور بھدّے لوگ ہیں.....''

''خوف سے کانپتے ہوئے لوگ.....''

''ہر لمحہ.....ہر پل زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے.....''

''ہماری باری کب آئے گی.....؟''



''ہماری باری.....؟''اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر زہریلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کبھی بھی آ سکتی ہے.....ابھی اس وقت بھی.....یہ مرگھٹ ہے.....یہاں سب اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں.....''

یکا یک سامنے سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔دو سوار تھے۔گاڑی قریب رکی تو میں سکتے میں آ گیا۔یہ وہی لوگ تھے،ان کے کندھے سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔مجھے لگا اب یہ بندوق تان لیں گے.....میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔خون کی گردش تیز ہو گئی دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا.....

یکا یک ایک دھماکہ ہوا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گذر گئی۔میں اچھل کر دور ہٹ گیا۔موت میرے منھ پر تھوک کر چلی گئی تھی۔خوف سے کانپتے ہوئے ان لمحوں میں میں نے محسوس کیا کہ میری ہیئت تیزی سے بدل رہی ہے اور خود میں بھی جیسے اونٹ کے گھٹنے میں.....

پھر دوسرا دھماکہ ہوا اور اور اونٹ کے گھٹنے کی شکل کا وہ آدمی.....

لاش اٹھالی گئی تھی وہاں پر گرا ہوا خون دھوپ کی مری ہوئی روشنی میں کہیں کہیں جم کر تازہ کلیجی کی مانند چمک رہا تھا.....

بھیڑ چھٹنے لگی تھی.....دکانوں کے شٹر گرنے لگے تھے.....تب کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھر چلنے کی بات کی تھی اور پوچھا تھا کہ مرنے والا میرا رشتہ دار تو نہیں تھا؟

◀◀ ● ▶▶


| | |
|---|---|
| نام کتاب: خواب نما | نام کتاب: کیسا انتظار |
| صنف: افسانے | صنف: افسانہ |
| مصنف: غیاث الرحمٰن سید | مصنف: پروفیسر افسانہ خاتون |
| سن اشاعت: ۲۰۲۳ء | سن اشاعت: ۲۰۲۳ء |
| صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۲۰۰/روپئے | صفحات: ۱۳۲ قیمت: ۲۰۰/روپئے |
| ملنے کا پتہ: | ملنے کا پتہ: |
| ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی | ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی |

● تجزیہ

● ڈاکٹر ریاض توحیدی

# شموئل احمد کا افسانہ ’’مرگھٹ‘‘......تنقیدی جائزہ

افسانہ ’’مرگھٹ‘‘ (شموئل احمد۔ بہار) کا ایک علامتی افسانہ ہے۔افسانے کا عنوان یعنی ’’مرگھٹ‘‘ (Burning Ghat) علامتی تفہیم کی عکاسی کر رہا ہے، کیونکہ افسانے کی قرأت کے بعد یہ لفظ اپنے اصلی معنی یعنی شمشان گھاٹ (وہ جگہ جہاں ہندو اپنے مردوں کو جلاتے ہیں) کو پھلانگ کر علامتی مفہوم کی سطح پر آ جاتا ہے اور عصری دور کی پُر انتشار زندگی کو مرگھٹ کے استعارے میں پیش کرتا ہے۔معاصر اردو فکشن کے بیشتر متون سماجی سطح پر سیاسی بیانیات (Political Narratology) کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں، چونکہ ان کا بیانیہ (Narrative) سماج کے ان حالات و واقعات پر استوار ہوا ہوتا ہے جو سیاست زدہ ماحول کی وجہ سے رونما ہوتے رہتے ہیں اور پھر یہ افراد مذہبی و ثقافتی یلغار کی صورت میں سماج کے اقلیتی طبقہ یا معصوم ومحکوم لوگوں کو سیاسی ،سماجی اور نفسیاتی طور پر زیر کرنے کو اپنی فکر و نظریے کی کامیابی سمجھتے رہتے ہیں۔ یہاں پر سیاسی بیانیہ صرف اقتدار یا ووٹ بینکنگ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ معاشرتی وسیاسی عوامل (Socio political Factors) کا وہ بیانیہ ہے جو اب ہر چیز کو سیاسی نظریہ کی طرح دیکھتا ہے۔پیش نظر افسانہ بھی فنی ،فکری اور موضوعاتی طور پر عصر حاضر کے پُر آشوب حالات کا ایک ایسا تخلیقی بیانیہ ہے جو نظریاتی خوف کی صورت میں ہر بشر کی نفسیات پر قابو پا چکا ہے۔یہ خوف نہ تو اقتدار کے زوال کا خوف ہے اور نہ ہی اقتصادی بدحالی کا ڈر ہے بلکہ یہ عزرائیل خصلت انسانوں کا وہ خوف ہے جو زندگی کو کہیں پر بھی موت میں تبدیل کر دیتا ہے۔مجموعی طور پر افسانے میں اسی قسم کی خوف ناک صورت حال کو فکشنا ئز کیا گیا ہے۔نفسیاتی تناظر میں افسانے کا جائزہ لیں تو اس میں ان پُر آشوب حالات کے نفسیاتی پہلو پر بھی ارتکاز کیا گیا ہے کہ یہ گھٹن زدہ فضا نفسی تناؤ (Psychic tention) کا ایسا ماحول بنا دیتی ہے کہ انسان اچھے برے کی پہچان تک بھول جاتا ہے۔افسانے کا پہلا ہی جملہ استفہامیہ انداز سے قاری کے اندر استعجاب انگیز کیفیت (Astonishing Condition) پیدا کر دیتا ہے:



’’لاش اٹھالی گئی تھی.....‘‘ ’لاش‘ کا لفظ سن کر ہی انسان کے اندر تحیر خیز سنسنی پھیل جاتی ہے۔ افسانہ کا یہ جملہ اس تحیر خیز سنسنی کو خلق کر رہا کہ ’لاش اٹھالی گئی تھی۔ابھی لاش کے بارے میں راوی (Narrator) ہی اطلاع دے رہا ہے کہ اٹھالی گئی۔لیکن یہاں پر قاری کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ کس کی لاش اور کس نے اٹھالی......؟ کون مرا تھا، کیسے مرا تھا، خود مرا تھا یا کسی نے مار دیا تھا۔اس کے بعد راوی، جو خود بھی واحد متکلم کی حیثیت سے افسانے میں موجود ہے، مرکزی کردار کا حلیہ اور ذہنی کیفیت یوں دکھا رہا ہے:

> ’’اونٹ کے گھٹنے کی شکل کا وہ آدمی اب بھی وہاں موجود تھا۔اس کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور گال قبر کی طرح اندر دھنسے ہوئے تھے۔لگتا تھا کسی نے چہرے کی جگہ ہڈیاں رکھ کر چمڑی لپیٹ دی ہو۔آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور کنپٹیوں کے قریب آنکھ کے گوشے کی طرف کوّوں کے پنجوں جیسا نشان بنا ہوا تھا۔وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ٹک خلا میں کہیں گھور رہا تھا......‘‘

یعنی ایک ایسا عمر رسیدہ شخص جو جسمانی طور پر کافی کمزور تھا، لاش اٹھانے کے بعد بھی وہیں پر موجود ہے اور حیرانی کے عالم میں اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے خلا کو گھور رہا ہے۔تو اس کا اشارہ اس جانب بھی ہو سکتا ہے کہ غالباً لاش کے ساتھ اس شخص کا قریبی تعلق ہے اور وہ اس کی موت پر حیران ہے کہ یہ کیوں مرا یا اسے کیوں مار دیا گیا......؟ اس کے بعد راوی پھر کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے سامنے آتا ہے اور اس آدمی کو دلاسہ دیتے ہوئے گھر چلنے کے لئے کہہ رہا ہے یعنی شاید ان دونوں میں کوئی رشتہ یا تعلق موجود ہے یا انسانیت کے ناطے وہ اس کی ڈھارس بندھا رہا ہے اور ساتھ ہی مرے ہوئے شخص کی موت کی وجوہات کو بھی اشاروں کنایوں میں ظاہر کر رہا ہے:

> ’’میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھر چلنے کی بات کی تو اس نے مری ہوئی آنکھوں سے ایک بار میری طرف دیکھا اور ایک لمبی سی سانس لی جیسے تازہ ہواؤں کو پھیپھڑوں میں بھرنا چاہتا ہو......لیکن بارود کی بو اس کے نتھنوں میں سرائت کر گئی اور بارود کے ذرّات جیسے حلق میں پھنس سے گئے......وہ کھانسنے لگا اور مسلسل کھانسنے لگا ، یہاں تک کہ گلے کی رگیں پھول گئیں۔آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگیں۔‘‘

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ مرا ہوا شخص دہشت کی بھینٹ چڑھ گیا ہے کیونکہ ماحول میں بارود کی بو پھیلی ہوئی ہے۔مرکزی کردار جب تھوڑا بہت سنبھل گیا تو راوی اسے سوال کرتا کہ کیا مرنے والا اسکا کوئی رشتہ دار ہے لیکن یہ سوال سنتے ہی مرکزی کردار کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھوں میں چنگاری سی سلگ اٹھتی ہیں۔اسے یہ بھی اشارہ مل رہا ہے کہ غمگین کردار مرنے والے کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے بلکہ اس کے دل

میں اپنی کمیونیٹی ،قوم یا ان افراد کا درد موجود ہے جو بلا مقصد مارے جا رہے ہیں۔اب راوی اپنے سوال پر پشیماں ہو رہا ہے کہ اس وقت یہ بے تکا سا سوال مناسب نہیں تھا اور پھر خود ہی کہتا ہے کہ ان پُر آشوب حالات میں یہ سوچنا بھی بے معنی ہے کہ کون یا کس کا رشتہ دار مارا گیا ہے کیونکہ یہاں تو سب آہستہ آہستہ مرتے جا رہے ہیں:

''تب میں نے پوچھا کہ مرنے والا اس کا رشتہ دار تو نہیں تھا۔میری اس بات پر اس کی مُردہ آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چنگاری سی سلگی تو مجھے لگا میرا یہ سوال یقیناً بے تکا تھا۔جہاں روز کا یہ معمول ہو وہاں یہ بات واقعی کیا معنی رکھتی تھی کہ کون کس.....

اس دہشت زدہ ماحول میں سرکاری میشنری کی کیا حالت ہے،افسانہ نگار اس کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

''دراصل اس علاقہ میں ایک مدت سے آسمان کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ ہر طرف آگ برستی ہے۔ ہواؤں میں سانپ اڑتے ہیں ۔ان کا سر کچلنے کے لئے راجہ کے سنتری بکتر بند گاڑیوں میں گھومتے رہتے ہیں ،لیکن زمین سخت اور آسمان دور ہے اور کب کون کس موڑ پر زد میں آ جائے کہنا مشکل ہے۔''

اس کے بعد مرکزی کردار مرے ہوئے شخص کی موت کا حال بیان کرتا ہے' جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ صورتحال دیکھ کر غم زدہ ہے نہ کہ لاش کے ساتھ اس کا کوئی خونی رشتہ ہے:

''ابھی ابھی ایک آدمی زد میں آ گیا تھا۔اور سب کچھ حسب معمول چشم زدن میں ہوا تھا۔کچھ دیر پہلے وہ ایک دکان سے سبزیاں خرید رہا تھا کہ ایک گاڑی رکی تھی .....دو سوار اترے تھے.....ایک دھماکہ ہوا تھا.....اور سبزیاں خریدنے والا اسی پل.....''

اس کے بعد کہانی کا بنیادی ڈسکورس شروع ہو جاتا ہے یعنی اس دور دہشت میں زندگی کی بے معنویت، دہشت پسندوں کی سنگدلی ،خوف کے سائے تلے ہچکی لے رہی انسانیت ،قانون کی بے بسی وغیرہ مایوس کن صورتحال کا ڈسکورس شروع ہو جاتا ہے۔یہ ڈسکورس راوی اور مرکزی کردار کے مابین ہو رہے مکالمے کی صورت میں سامنے آتا ہے:

''اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔پھر اس نے آہستہ سے کہا تھا: یہ مرگھٹ ہے.....ہم مرگھٹ کے لوگ ہیں.....''

''یہ مرگھٹ ہے .....ہم مرگھٹ کے لوگ ہیں.....'' یہ جملہ افسانے کا تھیم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔کیونکہ یہ مرگھٹ ہے یعنی یہ دنیا ہمارے لئے موت بن چکی ہے اور ہم مرگھٹ کے لوگ ہیں، یہاں پر سبھی لوگوں کی بجائے صرف 'ہم' کا ضمیر آیا ہے یعنی ایک مخصوص طبقہ یا قوم ،خیر یہ تو بعد میں بھی پتہ چلتا ہے



کہ ہم سے مراد کون لوگ ہیں جو کہ راوی اور مرکزی کردار کے مابین ہو رہی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔راوی مرکزی کردار کے ہیبت ناک حلیہ سے اس وقت ڈر جاتا ہے جب وہ اس کو اپنی انگلیوں سے چھو لیتا ہے اور خود پر گزرے ہوئے حادثہ کا وحشت ناک لہجے میں ذکر کرتا ہے:

''سب کچھ اچانک ہوا تھا۔ایک موڑ پر بس رکی تھی اور انھوں نے بندوقیں تان لی تھیں۔میں اپنی سیٹ میں دبک گیا تھا.....وہ تڑاتڑ کھوپڑیوں میں سوراخ کر رہے تھے۔موت بالکل میرے سامنے کھڑی تھی اور میں کونے میں دبکا ہوا موت سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا.....''

حادثہ کی ہوش اڑا دینے والی کہانی سن کر مرکزی کردار پوچھ بیٹھتا ہے کہ کیوں نہ وہ اس علاقے کو چھوڑ کر چلے جائیں۔اسے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ مرکزی کردار بھی بوڑھے کی قوم سے تعلق رکھتا ہے اور ان حالات سے پریشان بھی ہے۔لیکن اس کی تجویز سن کر بوڑھا طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ کیا اسے نہیں لگتا ہے کہ ابھی اس موڑ پر جو آدمی مرا تھا وہ کوئی اور نہیں خود تم ہو.....؟اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ تم نہیں سمجھو گے،اس لئے کہ تم علاقہ چھوڑنے والوں کی طرح سوچتے ہو:

''ہم کیوں نہیں یہ علاقہ چھوڑ دیں.....''میں نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا.....؟''

''پھر.....؟''

اس نے ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ ابھی ابھی اس موڑ پر جو آدمی مرا ہے وہ کوئی اور نہیں خود تم ہو....؟''

میں خاموش رہا۔

''تم نہیں سمجھو گے.....اس لئے کہ تم ان لوگوں میں ہو جو علاقہ چھوڑنے کی بات کرتے ہیں.....''

اس مکالمے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس قوم کے لئے دنیا میں بچاؤ کی کوئی جگہ موجود نظر نہیں آتی ہے اگرچہ ان حالات میں متاثر طبقہ اپنی جان بچانے کی خاطر سب کچھ چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔یہ مکالمہ ایک اہم مسئلہ پر فوکس کرتا ہے کہ مرنے والے اور مارنے والے سبھی ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ غیر قوم سے،اور یہی وہ تورایخی المیہ (Historical tragedy) ہے،جس کی طرف افسانہ اشارہ کر رہا ہے:

تب میں نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور مارنے والا.....کیا مارنے والا دوسرا ہے.....؟''

''آہ.....!'' وہ تڑپ کر خاموش ہوگیا۔

''یہی بنیادی فرق ہے میرے دوست.....

''ہاں یہی بنیادی فرق ہے.....ہم یہی نہیں سمجھتے۔''

یہ سن راوی اسے پوچھتا ہے کہ اب ان حالات میں وہ کیا کریں؟ تو وہ مایوس کن لہجے میں کہتا ہے کہ کچھ بھی نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ بھی بے بس ہیں اور راجہ بھی بے بس۔اس کے ساتھ ہی اپنی گمراہ شدہ کمیونٹی کے بارے میں کہتا ہے کہ آسمان والا بھی ہم سے ناراض ہے کیونکہ ہم اپنے خودساختہ نظریات اور برے اعمال کی وجہ سے دنیا کے ناپسندیدہ لوگ بن گئے ہیں:

''شاید ہماری طرف آسمان کا رنگ اسی طرح سرخ رہے گا۔''

''ہم روئے زمین کے انتہائی کریہہ اور بھدّے لوگ ہیں.....''

اس کے بعد راوی نفسیاتی طور پر اتنا ڈپرس ہوجاتا ہے کہ وہ بوڑھے سے پوچھتا ہے کہ ان کی باری کب آئے گی اور بوڑھا پُرتشدد صورتحال کے زیر اثر کہتا ہے کہ کسی بھی وقت آسکتی ہے۔اس کے ساتھ ہی راوی موت کے سوداگروں کی آمد کا منظر پیش کرتا ہے اور بوڑھے کی موت کا خاکہ کھینچتا ہے:

''یکا یک سامنے سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔دو سوار تھے۔گاڑی قریب رکی تو میں سکتے میں آگیا۔یہ وہی لوگ تھے،ان کے کندھے سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔مجھے لگا اب یہ بندوق تانلیں گے.....میں خوف سے تھرتھر کانپنے لگا۔خون کی گردش تیز ہوگئی دل زور زور سے دھڑکنے لگا.حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا.....یکا یک ایک دھماکہ ہوا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کی قریب سے گذر گئی۔میں اچھل کر دور ہٹ گیا۔موت میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی تھی.خوف سے کانپتے ہوئے ان لمحوں میں میں نے محسوس کیا کہ میری ہیئت تیزی سے بدل رہی ہے اور خود میں بھی جیسے اونٹ کے گھٹنے تیزی سے بدل رہی ہے اور خود میں بھی جیسے اونٹ کے گھٹنے میں ..... پھر دوسرا دھماکہ ہوا اور اور اونٹ کے گھٹنے کی شکل کا وہ آدمی.....لاش اٹھالی گئی تھی وہاں پر گرا ہوا خون دھوپ کی مری ہوئی روشنی میں کہیں کہیں جم کر تازہ کلیجی کی مانند چمک رہا تھا.....''



اس اقتباس سے ظاہر ہورہا ہے کہ ایک تو دہشت کے دماغوں کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ ہر طرف ان کی دہشت کا دبدبہ قائم رہے اور دوسرا یہ کہ جو بھی ان کی دہشت ناک پالیسیوں کے خلاف زبان کھولے یا بوڑھے کی طرح مایوسی کا اظہار کرے، وہ سب واجب القتل ہیں، چاہئے اس کے لئے کسی بھی مذہبی یا قومی نظریہ کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے۔افسانے کا کلائمکس پوری کہانی کا احاطہ کررہا ہے کہ راوی جب لاش کے سامنے بیٹھے مایوس بڑھے کی ڈھارس بندھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا تھا کہ کیا مرنے والا اس کا رشتہ دار ہے اور دوسری جگہ یہی بوڑھا کہتا ہے کہ یہ مرگھٹ ہے؛ ہم سب مرگھٹ کے لوگ ہیں؛ تو یہ صورتحال راوی کے ساتھ بھی اس وقت پیش آتی ہے جب بوڑھا دہشت کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے:

''بھیڑ چھٹنے لگی تھی.....دکانوں کے شٹر گرنے لگے تھے.....تب کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھر چلنے کی بات کی تھی اور پوچھا تھا کہ مرنے والا میرا رشتہ دار تو نہیں تھا؟''

اس طرح سے یہ افسانہ تشدد برپا کرنے والے اور تشدد کی بھینٹ چڑھنے والے لوگوں کے ذہنی و نفسیاتی خلفشار کو علامتی پیرائیہ میں فکرانگیز ڈسکورس بنا رہا ہے۔ایک باشعور تخلیق کار اپنی تخلیق میں سماج کی مشترک محسوسات (Common Sensibles) کو مخصوص محسوسات (Special Sensibles) میں ڈھال دیتا ہے تاکہ تخلیق کا فنی رچاؤ برقرار رہے نہ کہ صحافتی انداز سے سماجی صورتحال بیان کی جائے؛ یہی ایک کامیاب افسانے کی خوبی ہوتی ہے اور پیش نظر افسانہ ''مرگھٹ'' میں فنی اور موضوعاتی طور پر یہ خوبی صاف نظر آتی ہے، کیونکہ افسانے میں عصر حاضر کے ایک اہم ایشو کو دو کرداروں کے مکالمے اور کہانی کے منظرنامے میں اسطرح سمویا گیا ہے کہ آج کے ہر حساس انسان کی مشترک محسوسات کو مخصوص محسوسات میں پیش کیا گیا ہے۔اب اگر بنیادی موضوع کی بات کریں تو افسانے میں اگرچہ یہ علامتی انداز میں ڈسکس ہوا ہے تاہم اگر متن کی ردتشکیل کرکے فوکس کریں تو یہ ان دہشت پسند لوگوں کی خوں آشام کہانی کا بیانیہ ہے جو مختلف جگہوں یا ملکوں میں مذہب یا سیاست کے نام پر اپنے ہی لوگوں یا عام معصوم لوگوں کو قتل کرتے جارہے ہیں؛ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جس مقصد کے لئے وہ یہ انسانیت سوز کام انجام دے رہے ہیں کیا وہ صحیح ہیں.....؟

◀◀ ● ▶▶

Wadipora Handwara
Kashmir 193221
Cell:9906834877

● شگفتہ ناز

# سہیل وحید کی کتاب 'شموئل احمد کی تخلیقیت': ایک تنقیدی نظر

معروف افسانہ نگار اور اردو ہندی کے صحافی سہیل وحید شموئل احمد کی زندگی میں اُن کی خدمات کے حوالے سے ایک کتاب یا مخصوص گوشہ شائع کرنا چاہتے تھے لیکن ۲۵ دسمبر ۲۰۲۲ء کو اُن کی وفات کے بعد اُن کی خواہش نے ۲۰۲۳ء میں اپنی تکمیل کے وسائل تلاش کیے اور یہ کتاب 'شموئل احمد کی تخلیقیت' کے نام سے سامنے آئی ۔اِس کتاب میں چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اعتراف کے طور پر شموئل احمد کے فکشن پر مختلف معتبر نقادوں کے گیارہ مضامین شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں شموئل احمد کے تین خاکے ہیں۔ تیسرے حصے میں انتخاب کے طور پر اُن کی تین کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ آخری اور چوتھے حصے میں ان کے دو انٹرویوز شامل ہیں۔ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ان کی زندگی اور خدمات سے متعلق ہر پہلو کو سامنے لانے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

بیسویں صدی میں ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جنھوں نے اردو ادب بالخصوص فکشن میں اپنی پہچان قائم کی ہو۔ شموئل احمد اردو کے ایسے ادیب ہیں جو ہر شخص یا موضوع میں ستاروں کی سرگرمیوں کی سیر میں آخر کار انجام تک پہنچ گئے۔ پیشے سے انجینئر تھے۔ لیکن انھوں نے ابتدا ہی سے ادب میں دل چسپی دکھائی ۔ادب میں قدم رکھتے ہی یہ بات زیرِ بحث آنے لگی کہ اُن کی تخلیقات پر منٹو کا اثر ہے یا اُن کی اپنی نفسیات کا ۔سہیل وحید نے یہ اچھا کیا کہ اس کتاب میں نفسیات کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی گنجایشیں پیدا کر دیں۔ کسی نے اُن پر منٹو بننے کے الزامات لگائے ہیں، کسی نے فحاشی کا تو کسی نے ان کی نفسیات میں موجود لذتیت کو بھی واضح طور پر پہچاننے کی کوشش کی ہے۔

شموئل احمد سے ہندی ادیب ارون نارائن نے ایک انٹرویو میں جب اُن سے منٹو بننے کی کوششوں کے سلسلے سے سوال پوچھا تو انھوں نے یہ کیا جواب دیا تھا:

> ''مجھے کتے نے نہیں کاٹا ہے کہ میں منٹو بننے کی کوشش کروں گا۔ اصل تخلیق کار ہونا عظیم تخلیق کار بننے سے بہتر ہے۔ اصلیت اپنے آپ میں عظیم ہے۔ ہر آدمی اپنی جگہ منفرد ہے۔ اگر وہ وہی بن جاتا ہے جو وہ ہے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ منٹو بن جاؤں تو کوئی بڑی بات نہیں، شموئل احمد بن جاؤں تو بڑی بات ہوگی۔'' (ص۔۱۹۷)



وہاب اشرفی نے اس حوالے سے اپنی رائے اِس طرح پیش کی ہے:

> ''شموئل احمد کے افسانوں کی تفہیم میں ان کا منٹو سے رشتہ قائم کر کے ایک غلط صورت پیدا کی جا رہی ہے۔ میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان کے ایسے افسانے جنھیں جنسی کہا جا سکتا ہے، وہ منٹو کی راہوں سے قطعی الگ ہیں۔ اس لیے علیحدہ طور پر ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔'' (بہ حوالہ 'شموئل احمد کی تخلیقیت' ص۔۱۰۵ ؛افسانے کا فن اور شموئل احمد۔ رسالہ مژگاں، کولکاتا، شمارہ ۴۳۔۴۴۔ ص ۳۲۴)

شموئل احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ 'بگولے'، ناولٹ 'ندی' سے لے کر اُن کا آخری ناول 'گرداب' تک ؛اس درمیان جتنے بھی افسانوی مجموعے، ناول یا خودنوشت سامنے آئے، اُن تمام پر نفسیات کا موضوع حاوی معلوم ہوتا ہے۔ اُن پر جنسیت زدگی کے الزامات لگتے رہے لیکن وہ ہر بار ایک قدم اور آگے بڑھ کر اُس موضوع پر تفصیل سے باتیں سامنے لاتے دیکھے گئے۔ اُن کے پہلے ناولٹ 'ندی' میں انھیں ان کے حسب خواہ شاید قبولیت نہیں ملی تو انھوں نے اس سے زیادہ بولڈ ناول 'گرداب' لکھ دیا جس میں نفسیات سے آگے بڑھ کر وہ فحش نگاری کی طرف گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے اپنے مضمون 'شموئل احمد کے فکشن کی انفرادیت' میں کہا ہے:

> ''گرداب حقیقی معنوں میں ایک جذباتی جنسی ناول ہے۔ اس میں رومانس آگے بڑھ کر فحاشی اور جنسیت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔'' (ص۔۶۸)

شموئل احمد کو اگر عورت اور اس کی نفسیات سے الگ ہٹ کر کچھ لکھنے کو کہا جائے تو شاید اُن کے پاس لکھنے کو علم نجوم کے معاملات رہ جائیں گے۔ کے افسانوں اور ناولوں میں بیشتر عورتیں دھوکے باز نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ ان کے افسانے 'بگولے' کی لتیکا رانی ہو، اونٹ کی سکینہ ہو، مصری کی ڈلی کی راشدہ ہو یا گرداب کی ساجی۔ اُن کی تخلیقات میں کسی حد تک سچائی بھی ہے لیکن وہ واقعات بیان کرتے کرتے لذت کوشی اور فحاشی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ شموئل احمد کی نفسیات کے حوالے سے اس کتاب میں کئی ادیبوں نے جگہ جگہ لکھا ہے۔ اسلم جمشید پوری کا کہنا ہے:

> احمد جنسی موضوعا ''شموئل ت کا استعمال ہنرمندی سے کرتے ہیں۔ جنس پر آج بھی مسلم سماج میں کھلے طور پر بات نہیں ہوتی، لیکن یہ زندگی کی ایک ضرورت تو ہے۔'' (صفحہ:۶۲)

خورشید اکرم اپنے مضمون ''شموئل احمد: ایک جری نفس افسانہ نگار'' میں کہتے ہیں:

> ''شموئل احمد کی جراءت مندی اس بات میں نہیں کہ انھوں نے جنس پر افسانے لکھے۔ انھوں نے شہوانی جبلت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اس کو کامیابی سے برتا ہے۔ شہوانی جبلتوں کو اُجاگر کرتے ہوئے ان کا قلم لذتیت کو بھی ساتھ رکھتا

ہے لیکن بالکل باہری کنارے پر۔'' (صفحہ:۵۹)

صفدر امام قادری نے اپنے مضمون ''اے دِل آوارہ'' میں اُن کے تعلق سے کہا ہے :

''خواتین کی صحبتوں کی نمک مرچ کے ساتھ تفصیل پیش کرنے میں شموئل احمد کا دل لگتا ہے۔ یہ ان کے افسانوں سے بڑھ کر اس خودنوشت میں بھی موجود ہے''۔ (ص۔۳۳)

اُن کے افسانوں کے تعلق سے عرش منیر اپنے مضمون ''شموئل احمد کے افسانوں کی عورتیں'' میں کہتی ہیں:

''شموئل احمد نے جنس کے استعارے کے طور پر اونٹ اور رسّی کا استعمال کیا ہے ۔کہانی میں سکینہ کی مجبوریاں اور پھر مولوی کے ساتھ ساتھ سکینہ کی بھی جنسی کج روی کا اظہار بڑے کھلے انداز میں شموئل احمد نے کیا ہے۔ یہاں بیشتر مقامات پر لذتیت کا رجحان غالب ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے افسانہ نگار اپنے جذبۂ تلذذ کا بکھان اپنے اور قارئین کے چٹخارے کے لیے کر رہا ہے۔'' (ص۔۱۱۲)

■ بہ قولِ عتیق اللہ ''شموئل احمد کے ناولوں سے زیادہ ان کے افسانوں میں جنس وجسم کو متشدد تجربوں سے جس طرح گزارا گیا ہے، ان کا چشمہ نئے تناظرات ہی سے پھوٹ رہا ہے۔'' (عتیق اللہ:ص۔۲۷)

شموئل احمد کی افسانہ نگاری یا ناول نگاری جب جب کوئی نقّاد غور وفکر کرنا چاہے گا، اس کے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی نفسیاتی توجہ اور جنس زدگی کے معاملات پر اپنی رائے پیش کرے۔ سہیل وحید صاحب نے یہ اچھا کیا کہ اس کتاب میں ایسے مضامین شامل کیے جن میں اس انداز کے سوالات بہ خوبی احتساب کی منازل سے گزر رہے ہیں۔ چند بے حد ضروری اقتباسات اس سلسلے سے یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

■ ''اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ شموئل احمد صاحب نے فکشن کی دنیا میں ایک نئی راہ بنائی ہے، ملک اور سماج کے اہم مسائل کو انھوں نے بڑی خوبصورتی اور اثر انگیز طریقے سے اپنے ناول وافسانے کا حصہ بنایا ہے۔ وہ ایسی سجتا، سجلتا اور شگفتگی سے کہانیاں کرتے ہیں کہ داستان کے سحر جیسا احساس ہوتا اور قاری کو اپنی ہی، یا جانے پہچانے، دیکھے بھالے لوگوں کی روداد معلوم ہوتی ہے۔ [شموئل احمد: رمتا جوگی کی سحر بیانی: ابوبکر عباد (ص۔۹۶)]

■ ''جہاں گنجائش ہوتی ہے، شموئل احمد کی طرح ہی لذت کوشی میں بھی مبتلا ہونے سے منٹو کو کوئی گریز نہیں لیکن سیاسی اور سماجی بصیرت یا ملک اور اقوام عالم کے مسائل پر منٹو کے مضامین یا افسانوں میں جو اشارے ہیں، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ وہ باخبر ذہن



رکھنے والا تخلیق کار تھا لیکن شموئل احمد کا مطالعۂ کائنات اتنا سمٹا ہوا ہے کہ کوشش کر کے اگر وہ اس سے باہر بھی نکلتے ہیں تو انھیں منہ کی ہی کھانی پڑے گی (صفدر امام قادری:ص۔۴۵)۔''

شموئل احمد اُن الزمات کا اقرار کرتے ہوئے ارون نارائن کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں:

''مجھے حیرت ہے کہ تخلیق کار یا مصنف جنسی تعلقات سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ لوگوں نے جنس کے نام پر اخلاقیات کا زہر دے کر قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جنس مردہ نہیں ہوتا، زہر بن کر زندہ ہوتا ہے۔ میری کہانیاں انسان کے اندر پھیلے اس زہر کو بے نقاب کرتی ہیں اور پڑھنے والا ششدر رہ جاتا ہے۔'' (ص۔۱۹۷)

جہاں ان پر اس طرح کے الزامات لگتے ہیں، وہیں ان کی مختلف عادتوں اور طرح طرح کے علمی اور غیر علمی شوق کی طرف نظر ڈالیں جس کا ذکر صفدر امام قادری کے مضمون 'اے دلِ آوارہ: شموئل احمد کی عمر گذشتہ کی کتاب' میں موجود ہے تو ایک الگ معنوی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے:

''مجھے سگریٹ پینے والی عورتیں اچھی لگتی ہیں۔۔۔ ایسی عورتوں میں ایک طرح کا کھلا پن ہوتا ہے۔ آپ اُن سے بہت نجی باتیں شیئر کر سکتے ہیں۔ کسی رستراں کے نیم اندھیرے گوشے میں مشروبات کی ہلکی ہلکی چُسکیوں کے ساتھ ان سے گفتگو کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ میرے افسانوں میں اگر صنفِ نازک کے لطیف احساسات کی دروں بینی ہے تو اس کی وجہ میری اُن سے والہانہ گفتگو ہے جہاں اُن کے ذاتی تجربات سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔''

شموئل احمد کے افسانوں کے موضوعات کی اگر بات کی جائے تو اس میں عورتوں کی نفسیات، علم نجوم اور کچھ حد تک سیاسی امور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ خورشید اکرم کہتے ہیں:

■ ''سیاسی سماجی موضوع پر ان کی کئی کہانیاں مثلاً چھگمانس اور القمبوس کی گردن بھی خاصی اچھی ہیں لیکن ان کا ناول 'مہاماری' اس باب میں بہت اہم ہے۔ اسّی اور نوّے کی دہائی [میں] بہار کی سیاست کیا تھی، اس کو سمجھنے میں یہ ناول بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس موضوع پر اردو میں شاید اس پایے کا دوسرا ناول نہیں لکھا گیا۔'' (ص۔۵۷)

■ ''بہار کی سیاسی وسماجی واقتصادی صورتحال کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں جس کامیابی سے برتا ہے، اس طرح شاید بہار کے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں۔ گویا اب

ان کا قلم دو میدانوں میں رواں تھا۔ایک جنس کی نفسیات تھی اور دوئم سیاسی سماجی حقیقت نگاری کی کہانیاں۔'' (ص۔۵۷)

علم نجوم شموئل احمد کا پسندیدہ موضوع ہے جہاں تھوڑی گنجائش پیدا ہوتی ہے، وہ اُس کا بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں:

''مجھ میں ایک خرابی ہے.....''میں آدمی میں فوراً اس کے ستارے ڈھونڈنے لگتا ہوں'' (ص۔۱۴۳)

کتاب کے مرتّب ڈاکٹر سہیل وحید خود کہتے ہیں:

''شموئل احمد پہلے افسانہ نگار ہیں یا پہلے نجومی؟ یہ فیصلہ وہ خود نہیں کر پائے ہیں اور اکثر ان کے اندر کا نجومی خود آگے بڑھ کو ان کا قلم پکڑ لیتا ہے۔'' (ص۔۸۱)

سہیل وحید نے اپنی کتاب کا آغاز شموئل احمد کے اس خطبے کے اقتباس سے کیا ہے جو انھوں نے مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا انعام حاصل کرنے کے بعد ۲۰۱۲ء میں دیا تھا

''جناب عتیق احمد کی خندہ پیشانی میں ستارہ زہرہ کی کارفرمائی ہے۔جناب نارنگ کی شخصیت کا استحکام زحل کا عطیہ ہے اور جناب فہیم احمد کی آنکھوں کی چمک عطارد کی چمک جان پڑتی ہے۔'' (ص۔۱۱)

اسی طرح ساجد رشید کے خاکے 'مریخ کا جگر' میں شموئل احمد نے علم نجوم کے سلسلے سے شخصیت میں ستارے کی پہچان کیسے کی جاسکتی ہے، اس کے کچھ واضح اصول بتائے ہیں:

■ ''بے خوفی اور بے باکی ستارہ مریخ سے عبارت ہے۔مریخ کا اثر ہے تو سالک بے باک ہوگا اور زحل کا اثر ہے تو دبّو ہوگا اور زہرہ کارفرما ہے تو مند مند مسکرائے گا جیسے طارق چھتاری مند مند مسکراتے ہیں اور مشتری کا ہوگا تو داڑھی بڑھالے گا جیسے شمس الحق عثمانی نے بڑھالی اور را ہو ہے تو احمق ہوگا''۔ (ص۔۱۳۱)

اردو کے دوسرے نقادوں سے الگ یہ ایک سچّائی ہے کہ یہاں سہیل وحید نے بھی علمِ نجوم میں اپنے ہاتھ آزمائے ہیں۔انھوں نے اپنے مضمون 'برجیس و ناہید کا مرکّب : شموئل احمد' میں شموئل احمد کے ستاروں کی چال سمجھ کر ان کے حوالے سے ان کی شخصیت پر پڑتے ہوئے اثرات کو دکھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔آپ بھی ان کے تجزیے سے محظوظ ہوں:

■ ''مریخ کے چوتھے گھر میں ہونے کی وجہ سے ہی شموئل احمد زبردست قسم کے منگلی



ہو گئے جس کے نقصانات انھیں تاحیات ہوتے رہے۔'' (ص۔۸۲)

■ ''مریخ اور زہرہ ایک دوسرے کو سیدھے دیکھ رہے ہیں۔یعنی زندگی میں نین مٹکے کی گنجائشوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔جیوتیش کے مطابق جس زائچے میں مریخ اور زہرہ کا کوئی بھی جوڑ بیٹھ گیا ہوگا، تو طے ہے کہ ایسے مرد عورت دو تین چار سے کم پر مانتے ہی نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کا جسمانی تعلق ادھر اُدھر ہو ہی جاتا ہے۔زائچے کے مطابق شموئل احمد کی زندگی میں بھی عورتوں کی آمد کا سلسلہ کم و بیش بیس پچیس سال تک چلا ہوگا۔'' (ص۔۸۳)

■ ''عطارد اور مشتری نے ہی انھیں لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا اور زہرہ نے عطارد کے ساتھ مل کر تخلیقیت کے لیے سازگار فضا تیار کی۔'' (ص۔۸۳)

■ ''مشتری کے آٹھویں گھر میں جا کر براجمان ہو جانے سے ہی وہ نجوم، ٹیروکار ڈ اور علم الاعداد، مختلف دیومالا اور صوفیانہ علوم کی طرف مائل ہو کر رمز کشائی میں ماہر ہو گئے۔'' (ص۸۵)

■ ''انھوں نے اپنے ناول اور افسانوں میں علم جیوتش کی اصطلاحوں کا بڑا ماہرانہ استعمال کیا ہے اور یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھیں جنس اور جیوتش کی ایک نئی جمالیات کا اختراع کرنے کا بھی شرف حاصل ہے۔'' (ص۔۷۹)

سہیل وحید کا یہ مضمون غالباً اردو میں شموئل احمد کے سلسلے سے لکھا گیا وہ پہلا مضمون ہے جس مُں ان کے حوالے سے علمِ نجوم کی معلومات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔شموئل احمد کو اس بات کی ہمیشہ شکایت رہی کہ ان کے علم نجوم کی اصطاحوں سے لیس افسانوں کو اردو میں سنجیدگی سے سمجھا ہی نہیں گیا۔سہیل وحید نے پس از مرگ بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔شموئل احمد علمِ نجوم کی دھاک جماتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے بھٹو کی موت کی پیشین گوئی پہلے ہی کر دی تھی اس سے انھیں مزید شہرت ملی لیکن وہاب اشرفی نے اپنی خودنوشت ''قصہ بے سمت زندگی کا'' میں ان کی پیشین گوئی کے حوالے سے ایک قصہ پیش کیا جو انھوں نے ان کے حوالے سے ایک واقعہ پیش کیا اور شموئل احمد کی اختر شناسی پر اپنے تاثرات پیش کیے ہیں:

''ایک زمانے میں رانچی میں شموئل احمد نے حساب کتاب کر کے مجھے بتایا کہ میں پانچ سال تک وہاں سے نہیں نکل سکتا۔اتنی مدت کے بعد ہی وہ جگہ چھوڑ سکوں گا، تب ہی دوسری جگہ جانے کی صورت نکلے گی۔عجیب اتفاق کہ اس پیشن گوئی کے دو ماہ بعد مجھے ہمیشہ کے لیے رانچی کو خیر باد کہنا پڑا۔وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے علم کا

نقص نہیں بلکہ میں نے ہی تاریخ پیدائش غلط بتائی ہوگی''۔[قصہ بے سمت زندگی کا: بہ حوالہ اے دِل آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۴۱)]

اس کتاب میں تنقیدی مضامین کے بعد شموئل احمد کے تین خاکے شامل ہیں۔ ساجد رشید، علقمہ شبلی اور عبدالصمد کے خاکوں کو پڑھ کر اُن کی شخصیت کے بارے میں کم اور علم نجوم سے متعلق زیادہ جاننے کو ملتا ہے۔ یہیں کچھ حد تک شموئل احمد کے بارے میں بھی بہت کچھ جاننے کو ملتا ہے۔ اُن کے خاکوں کے حوالے سے منی بھوشن (کمار) کا ایک مضمون بھی اِس کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

■ ''اس خاکے (عطارد کا آدمی: عبدالصمد) کی تمام تر گفتگو کا مدار شیطان پر ہے لیکن یہ شیطان کون ہے؟ شاید پٹنہ شہر کا کوئی قلم کار۔ خاکہ نگار نے شیطان کا نام واضح کرنے سے گریز کیا ہے۔ مگر اس خاکے میں شیطان کا ورداس قدر ہوا ہے کہ اس کا دوسرا عنوان 'عبدالصمد بنام شیطان' رکھ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چاند تاروں کی کیفیات اور ان کے اثرات صاحب خاکہ یعنی عبدالصمد پر شموئل احمد نے دکھاتے ہوئے شیطان کی شخصیت کی وضاحت زیادہ کی ہے۔ پورے خاکے کو اگر آپ غور سے دیکھیں تو بہ مشکل عبدالصمد کی پانچ چھ خصوصیات آپ کے سامنے آسکیں گی۔ سطر در سطر اور صفحہ در صفحہ آپ آگے بڑھتے جایئے، ستارے سیارے کے علاوہ آپ کو شیطان اور خود شموئل احمد کی شیطانیاں مل جائیں گی مگر عبدالصمد کا ذکر برائے نام آئے گا۔'' (ص۹۸)

■ ''شموئل احمد نے جس شرافت کے ساتھ اپنی شیطانیاں گنوائی ہیں، اسے دیکھ کر زبیر رضوی کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو انھوں نے پہلی دفعہ ذہنِ جدید میں شموئل احمد کی تحریر شائع کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ ہمیں بہار کی ادبی سیاست سے باخبر کرتے ہیں۔ صاف سمجھ آتا ہے کہ شموئل احمد بذات خود اس ادبی سیاست کے فعال رکن تھے۔ پورے خاکے میں انھوں نے علم نجوم کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ (ص۔۹۹)

عبدالصمد کا خاکہ 'عطارد کا آدمی' میں شموئل احمد نے خود سے یہ قبول کیا ہے:

''اصل میں، ایک شیطان میں بھی ہوں۔ اِدھر کی بات اُدھر کرنے میں مجھے لطف آتا ہے۔ میں شیطان کو اکساتا تھا اور وہ حسد کی آگ میں جلتا تھا۔'' (ص۔۱۴۳)

اس کتاب میں شموئل احمد پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں اور ان کے ناول، افسانے اور اسلوبِ بیان کے حوالے سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، وہ بڑے معرکے کے ہیں۔ اس سے شموئل احمد کی زندگی شخصیت



اور کارناموں کے اچھے اور بُرے تمام احوال سلیقے سے سامنے آجاتے ہیں۔ اِس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سہیل وحید نے صرف محبت و عقیدت تک اس کتاب کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ انھوں نے ایک معروضی نقطۂ نگاہ سے شموئل احمد کو پرکھنے والوں کی باتوں کو بھی خاص اہمیت دی ہے ورنہ اس کتاب میں آسانی سے ایسے اقوال میں آسانی سے ایسے اقوال کیسے آتے:

''اُن کے بعض ناولوں کو پڑھنے کے بعد یہ خیال گزرتا ہے کہ اسے تراشنے کی ابھی اور ضرورت تھی۔ تراشنے سے مراد حاطہ گیر بنانے کی جہد میں جن غیر ضروری معلومات اور جزئیات سے اسے پھیلا دیا جاتا ہے، ان کی چھٹی کر دی جائے تو کل ملا کر اسے زیادہ بہتر شکل میں دی جا سکتی ہے۔'' [شموئل احمد کا گزرگاہ 'گرداب': عتیق اللہ (ص۔۱۹)]

■ ''اسی طرح اگر آپ فکشن کے اصولوں کو بنیاد بنا کر جانچ پرکھ کرنا چاہیں تو مصنف کے لیے زرہ کے طور پر پہلے ہی سے خودنوشت کا اعلان موجود ہے۔ سختی سے اس کیفیت کا جائزہ لیں تو کہنا چاہیے کہ کتاب پیش کرتے ہوئے مصنف کے پاس شاید وہ اعتماد نہیں جس کی طاقت پر وہ ڈنکے کی چوٹ کے ساتھ اپنی کتاب کے نفسِ مضمون یا صنف کا اعلان کرتا ہے۔'' [اے دلِ آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۳۱)]

■ ''شموئل احمد اپنے ہم عصروں میں خود سے بعض بہتر لکھنے والوں سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ تھوڑے سے افسانے، ایک ناول، ایک ناولٹ، چند مضامین اور مٹھی بھر تراجم۔ غور کریں تو ان کی ادبی زندگی کے طول کے مقابل مختصر پونجی یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔'' [اے دلِ آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۳۲)]

■ ''یوں بھی ابتدائی زمانے میں وہ گنڈے دار افسانہ نگار تھے۔ کہیں کوئی چیز چھپ گئی اور پھر برسوں کسی نئی تحریر کا پتا نہیں جب کہ ان کے دیگر ہم عصروں میں یہ کیفیت نہیں تھی۔ شوکت حیات، سلام بن رزاق، ساجد رشید، حسین الحق، عبدالصمد، شفق وغیرہ کے یہاں تواتر کے ساتھ لکھنے کا ایک انداز قائم رہا ہے۔'' [اے دلِ آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۳۲)]

■ ''۱۹۹۰ء کی دہائی میں شموئل احمد اچانک اہم لکھنے والے کے طور پر ابھرنے لگے۔ خاص طور سے زبیر رضوی 'ذہن جدید' سے اور راجندر یادو 'ہنس' کی معرفت کچھ اس اہتمام سے شموئل احمد کی ادبی پشت پناہی کرنے لگے جیسے آنے والا وقت اب اسی

فنکار کا ہوگا۔'' [اے دلِ آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۳۲)]

''شموئل احمد کا مطالعۂ کائنات اتنا سمٹا ہوا ہے کہ کوشش کر کے اگر وہ اس سے باہر بھی نکلتے ہیں تو انھیں منہ کی ہی کھانی پڑے گی۔'' [اے دلِ آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۴۱)]

■ ''شموئل احمد کے افسانوں اور ناولوں میں نجوم، عورت اور جنس کے ساتھ ایک اور خصوصیت ہے وہ ہے زبان۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہی انھوں نے ہمیشہ اپنی بات کہی ہے۔ کبھی بھی طول طویل جملہ نہیں۔ وہ بولتے بھی اختصار کے ساتھ تھے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے: ''انجینئرنگ ڈزائن میں اشیاء کی کفایت شعاری پہلی شرط ہوتی ہے۔ افسانے کی کرافٹ میں میں نے الفاظ کی اکانامی پر زور دیا۔'' [برجیس وناہید کا مرتّب: شموئل احمد: سہیل وحید (ص۔۸۷)]

■ ''ان کی زبان میں رچاؤ تو ہے لیکن اس میں جو فطری بہاؤ ہونا چاہیے، وہ نہیں ہے۔ پختہ نثر نہیں لکھ پائے ہیں وہ اور ان کی زبان میں جو ایک مقامی اوگھڑ پن بھی ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے اردو باقاعدہ نہیں سیکھی۔ اس کا اقرار انھوں نے اپنی سوانح 'اے دل آوارہ' میں بڑی ایمانداری سے کیا بھی ہے۔ ان کے مطابق وہ سائنس اور انجینئرنگ پڑھتے تھے۔ گھر میں کوئی خط آتا تو کوئی اسے پڑھ کر سناتا، اس سے انھوں نے اردو سیکھی۔'' [برجیس وناہید کا مرتّب: شموئل احمد: سہیل وحید (ص۸۸۔۸۷)]

''اپنے ادبی معاملات میں چاق و چوبند اور دوسروں سے ہزار شکایتیں۔'' [اے دلِ آوارہ: صفدر امام قادری (ص۔۳۳)]

شموئل احمد کی یہ شکایت تھی کہ ''مجھ پر کون لکھے گا''۔ ''مجھ پر بہت کم لوگوں نے لکھا''۔ ''میں نے کبھی کسی سے لکھنے کی فرمائش نہیں کی''۔ اسی حوالے سے سہیل وحید کہتے ہیں:

''ان سے جب بھی بات ہوتی تھی تو وہ دبے دبے لہجے میں کہتے تھے کہ ستاروں کی چال کے استعاروں کے پیرہن میں تخلیق کی گئی ان کی کہانیوں پر کون لکھے گا؟ یہاں تو سب لکیر کے فقیر ہیں۔'' (ص۔۸)

شموئل حمد کے حوالے سے اقبال حسن آزاد کہتے ہیں:

''بڑے بھائی شموئل احمد نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے افسانے



اس لیے قابل توجہ نہیں ٹھہرتے کہ ان سے کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوتا''۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں رقم کرنے کی کوشش کرتے تھے جن سے تنازعات پیدا ہوں، Controversy کی گنجائشیں بنیں۔ یہ وہ حکمتِ عملی ہے جو ہندستانی سنیما میں ہر فلم کے Release ہونے سے پہلے دیکھنے کو ملتی ہے۔ رحمان عباس کے انٹرویو میں کچھ اِس طرح شموئل احمد کی یہ بات سامنے آتی ہے:

''میرا ناول 'گرداب' شائع ہوا تو ایک عورت نے مجھے فون کیا کہ کیوں نہ آپ کو زندہ دفن کر دیا جائے؟ یہ ایک شان دار ردعمل تھا۔ اس ردعمل سے ایک بات ظاہر ہوئی کہ ناول میں کردار نگاری کامیاب ہے اور وہ مرکزی کردار قاری کے دل میں نفرت جگانے میں کامیاب ہے۔'' (ص۔۱۹۲)

شموئل احمد انجینئرنگ کر کے ادب کے میدان میں آئے تھے۔ جب وہ کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو وہ بھول جاتے ہیں کہ کہاں تک آ کر ٹھہر جانا ہے۔ نفسیات پر لکھتے ہیں تو اُس کی حد بھول جاتے ہیں۔ خاکے میں جب علم نجوم سے متعلق بات کرتے ہیں تو خاکہ کے اصل معنی بھی جاتے رہتے ہیں۔

سہیل وحید کی یہ کتاب شموئل احمد کی شخصیت اور کارناموں کا ایک مکمّل آئینہ ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے سے قاری نہ صرف شموئل احمد کی شخصیت اور کارناموں کی مثبت جہات سے آشنا ہوتا ہے بلکہ ان کے تعلق سے منفی باتوں اور کمیوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ اس سے انصاف پسند قاری کے ذہن کی ہر کش مکش دور جاتی ہے۔ اِس کتاب میں سہیل وحید نے اکثر نئے مضامین شامل کیے ہیں اور ہر نسل کے نقادوں کو چنا ہے۔ اس کتاب میں سہیل وحید نے شموئل احمد کی ہر صنف سے متعلق مضامین شامل کیے ہیں لیکن جس طرح انھوں نے خصوصی طور سے افسانے اور خاکوں پر مضامین شامل کیے ہیں، اُسی طرح ایک مضمون اُن کے باقی ماندہ ناولوں (ندی، مہاماری اور چمراسر وغیرہ) سے متعلق بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شموئل احمد کے سلسلے سے ایسی کتاب کی ضرورت تھی جسے سہیل وحید کی اس کتاب نے بروقت پوری کی ہے۔

◄◄ ● ►►

Research Scholar,
Department of Urdu, Patliputra University, Patna
Email:shaguftanaaz5852@gmail.com
Mobile No. 7991179510

## ● اقبال حسن آزاد

# خراج عقیدت: ڈاکٹر منظر اعجاز

وہ ایک شخص جو ہیرے کی کھان جیسا تھا
کشادہ دل کے کشادہ مکان جیسا تھا

اسی کے سائے میں ملتی تھیں راحتیں سب کو
غضب کی دھوپ میں وہ سائبان جیسا تھا

اسی کے دم سے معطر تھی محفلِ یاراں
ادب کے طاق پہ وہ عطردان جیسا تھا

جنھیں طلب تھی فلکِ علم و شعر و حکمت کی
وہ ان کے واسطے اک آسمان جیسا تھا

ہر ایک آنکھ شناسا تھی اس کے چہرے سے
وہ ایک رخ جو رخِ مہربان جیسا تھا

شہد کی بوند ٹپکتی تھی اس کے ہونٹوں سے
ادب کے دہن میں شیریں زبان جیسا تھا

لو آج اُٹھ گیا محفل سے یوں اچانک ہی
وہ آدمی جو کہ محفل کی جان جیسا تھا

◀◀ ● ▶▶



## ● مرغوب اثر فاطمی

# آہ! منظر اعجاز

چلتے چلتے لڑکھڑائی جب حیات
تھام لینے کو بڑھی آگے ممات

بھیڑ میں سایوں کی، آتی ہے نظر
منظرِ اعجاز کی تابندہ ذات

پیکرِ اخلاص و اُنسِ باہمی
عازمِ دستِ مدد در مشکلات

مردِ میدانِ تحقُّق اور نقد
تھا یگانہ ماہرِ اقبالیات

درکِ اعلا اُس کو تھا تنقیح کا
بے سند کہتا نہیں تھا کوئی بات

اُس کی نُدرت مائلِ پرواز تھی
اُس پہ وا تھا آسمانِ ممکنات

خود نمائی سے وہ کوسوں دور تھا
خادمِ کاغذ قلم دن ہو کہ رات

اس کی تحریروں میں 'پٹنہ' تھا مگر
تھے 'مظفرپور' کے بھی واقعات

تبصروں میں غیر جانب دار تھا
کیسے رکھ دیتا کسی کے سر پہ ہات !

سامنے لاتا تھا ساری خوبیاں
چھانٹ دیتا تھا وہ لیکن مہملات

نثر کے معیار کو ارفع کیا
ڈال کر شیرینیِٔ قند و نبات

لطفِ قرأت کے تھے ضامن برملا
فکر کو مہمیز کرتے فقرہ جات

جدّتِ افکار کیوں محدود ہو
تھی کشادہ اس کی ادبی کائنات

پردۂ صنعت سے چھَن کر بالیقیں
سامنے آتی تھی قلبی واردات

درمیانِ قِصّہ قحط الرِّجال
اس کی تقریریں تھیں گنجِ کیفیات

مرکے وہ ہم سب کو حیراں کر گیا
کھُل نہ جائے اُس پہ کیوں بابِ نجات

ہو اثر فردوسِ میں منظر مُقیم
کاوشیں بھی اس کی پاجائیں ثبات

◀◀ ● ▶▶

## ● انورالحسن وسطوی

# پروفیسر منظراعجاز: ہم تجھے بھلانہ پائیں گے

پروفیسر ڈاکٹر منظر اعجاز کا انتقال اردو دنیا کے لیے کسی سانحہ سے کم نہیں ہے۔موصوف اردو کے مشہور ومعروف ادیب و ناقد، نامور محقق اور ماہر اقبالیات کے علاوہ شاعر، صحافی اور ایک مشفق وجیّد استاد تھے۔ وہ اردو کے کثیر المطالعہ اور کل وقتی ادیب تھے۔ ادب پڑھنا اور ادب لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مرتّب تھے۔ان کی اہم تصانیف میں ''اقبال اور قومی یکجہتی'' (تحقیق وتنقید)، ''اقبال عصری تناظر میں'' (تجزیہ وتنقید) ''فیض احمد فیضؔ اور صلیبیں میرے دریچے میں'' (تجزیہ وتنقید)، ''اعجازِ نظر'' (تجزیہ وتنقید)، ''قومی وطنی شاعری کا منظر نامہ'' (تجزیہ وتنقید)، ''ورق ورق اُجالا'' (مجموعۂ غزل)، ''ظفر عدیم: ایک سخن ساز اور معاصر غزل کا منظر نامہ'' (تجزیہ وتنقید)، ''فراق اور غزل کا اسلوب'' (ترتیب)، ''تاثرات وتجزیے'' (تجزیہ وتنقید)، ''متن سے مکالمہ'' (تجزیہ وتنقید) اور ''تجزیاتی مطالعے'' (تجزیہ وتنقید) کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔موصوف کی تقریباً نصف درجن کتابیں ابھی زیرِ طبع وزیر ترتیب تھیں۔فی الوقت وہ اردو ڈائریکٹوریٹ کی دعوت پر ''پروفیسر عطا کاکوی'' پر مونوگراف لکھنے کا کام کر رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ پروجیکٹ پایۂ تکمیل کو پہنچ پایا یا نہیں؟ کالج کی ملازمت میں آنے سے قبل موصوف کا زیادہ تر قیام مظفر پور میں ہی ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں وہ مظفر پور سے ایک رسالہ ''انعکاس'' نکالتے تھے۔۱۹۸۳ء میں انہوں نے ''انعکاس'' کا ''فراق گورکھپوری نمبر'' نکالا تھا جو بہت ضخیم تھا۔آج بھی ادبی حلقے میں اس نمبر کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

پروفیسر منظر اعجاز کی پیدائش ۱۲دسمبر ۱۹۵۳ء کو ضلع ویشالی کے ''اَسوئی'' موضوع میں ہوئی جو ان کا آبائی وطن ہے۔ فی الوقت یہ موضع بھگوان پور بلاک (ویشالی) کے تحت آتا ہے۔ پہلے یہ گورول بلاک (ویشالی) کا حصہ تھا۔راقم السطور کے آبائی وطن موضع حسن پور وسطی ''مہوا'' سے ''اَسوئی'' تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میرے موضع سے ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر موضع ''چک قاضی نظام'' ہے، جہاں ایک مشہور ومعروف طبیب حکیم سید حسن عسکری صاحب تھے جو پروفیسر منظر اعجاز صاحب کے خالو ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر منظر اعجاز صاحب کے بڑے بھائی عبدالمنّان صاحب ایک سیاسی لیڈر تھے۔ان کا تعلق انڈین



یونین مسلم لیگ سے تھا۔میرے دادا مرحوم جناب محبوب حسن صاحب اور والد گرامی جناب داؤد حسن صاحب ''مہوا'' رجسٹری آفس میں وثیقہ نویسی کے پیشے سے منسلک تھے۔لہذا رجسٹری آفس کے کام سے جناب عبدالمنّان صاحب کا اکثر میرے یہاں آنا جانا ہوا کرتا تھا۔منظر اعجاز صاحب کی فیملی سے میری فیملی کے گہرے مراسم تھے۔موصوف کے خالو سید احسن عسکری اور میرے دادا مرحوم گہرے دوست تھے۔ یہ دونوں بزرگ جب اکٹھا ہوتے تو ان دونوں کی گفتگو اکثر فارسی میں ہوا کرتی تھی جس کا میں عینی شاہد ہوں۔

ڈاکٹر منظر اعجاز کی ابتدائی تعلیم اپر پرائمری اسکول موضع بہاری اور مڈل وہائی اسکول کی تعلیم بھگوان پور (ویشالی) میں ہوئی۔کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مظفر پور میں ہوئی۔کالج کی تعلیم کے زمانے میں ہی ان کے علمی جوہر نکھر چکے تھے۔منظر اعجاز صاحب معروف استاد، ادیب نقاد اور اردو تحریک کے قافلہ سالار پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ پروفیسر ہاشمی کو اپنے جن شاگردوں پر فخر تھا ان میں نمایاں نام منظر اعجاز صاحب کا بھی تھا۔انہوں نے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کی نگرانی میں ہی پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس طرح ایک عرصے تک ان کا قیام مظفر پور میں رہا۔مظفر پور میں ہی ان کا تعلق معروف شاعر قیصؔر صدیقی سمستی پوری سے ہوا جس کے نتیجے میں قیصؔر صدیقی کے مجموعۂ غزل ''صحیفہ'' کی ترتیب کا کام انہوں نے انجام دیا۔منظر اعجاز صاحب کی پہلی تقرری ہلسہ (نالندہ) ڈگری کالج میں ہوئی۔بعد میں تبادلہ ہو کر وہ اے۔این۔کالج، پٹنہ آئے جہاں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پاٹلی پترا یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہ یہاں بھی صدر شعبۂ اردو رہے۔تقریباً پانچ سال قبل وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔انہوں نے ایک استاد کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔ ہزاروں طالب علموں کو علم کی روشنی سے آراستہ کیا۔کلاس روم کے اندر اور باہر انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت کچھ اس انداز میں کی کہ آج ان کے متعدد شاگرد درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔

پروفیسر منظر اعجاز اردو محفلوں کی آبرو تھے۔ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے یا کسی محفل میں اظہار خیال کے لئے کھڑے ہوتے تو علم کا سمندر لگتے۔اردو شعر وادب کی اتنی قد آور شخصیت ہونے کے باوجود انہوں نے خود کو کبھی نمایاں کرنے یا دوسروں پر اپنے علم کا رعب طاری کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نام ونمود اور شہرت حاصل کرنے کی انہیں کبھی خواہش نہیں رہی۔موصوف ایک قلندر صفت انسان تھے۔وہ زندگی بھر خاموشی کے ساتھ اردو شعر وادب کے گیسو سنوارنے میں منہمک رہے۔کسی محفل میں ان کا کلیدی خطبہ ہوتا یا وہ صدارتی تقریر فرماتے تو سامعین دلجمعی کے ساتھ ان کی باتیں غور سے سنتے اور ان کے اندر علم کا خزانہ موجود پاتے۔ان کے علم کی گہرائی کے معترف اور قائل ان کے معاصرین بھی تھے اور بزرگ بھی۔

اللہ تعالی نے انہیں بلا کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔ ان کی یادداشت خداداد تھی۔ اردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار انھیں ازبر تھے۔ ان کی انفرادیت یہ بھی تھی کہ وہ بہت ساری ادبی محفلوں میں صدر مجلس یا مہمان خصوصی نہ ہونے کے باوجود بحیثیت سامعین شریک محفل ہوتے اور عام سامعین کے ساتھ ہی بیٹھتے۔ یہ ان کی خاکساری اور ان کی منکسر المزاجی کی عمدہ دلیل تھی۔ موصوف فطرتاً منکسر المزاج، شریف النفس اور ایک مخلص انسان تھے۔ انہوں نے بے شمار لوگوں کی کتابوں پر ''مقدمہ''، ''تقریظ'' اور ''پیش لفظ'' لکھا۔ عموماً ان کی ان تحریروں کی سرخی ''حرفِ اعجاز'' ہوتی تھی۔ ان کی ان تمام تحریروں کو اگر جمع کر دیا جائے تو کتاب کی کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ موصوف نے مجھے ایک ملاقات میں یہ بتایا تھا کہ میں ایسی تمام تحریروں کو کتابی شکل دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اپنے لکھے تمام تبصروں کو بھی یکجا کرنے کا ان کا منصوبہ تھا۔ لیکن موت نے ان کاموں کو انجام دینے کی انہیں مہلت نہیں دی۔ ان کے کوئی لائق شاگرد یا ان کے برادر نسبتی معروف شاعر وادیب جناب اقبال حسن آزاد (مونگیر) اگر چاہیں تو منظر اعجاز صاحب کی تمام بکھری تحریروں کو کتابی شکل میں یکجا کرار دو ادب کے سرمائے میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ موصوف نے راقم السطور کی بھی دو کتابوں پر تبصرے لکھے جو ''اردو بک ریویو'' نئی دہلی میں شائع ہوئے۔ موصوف کے زیادہ تر تبصرے اسی رسالے میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''اردو بک ریویو'' کا شاید ہی کوئی ایسا شمارہ ہو جس میں پروفیسر منظر اعجاز کے تبصرے شامل نہ رہے ہوں۔ اپنے انتقال سے تین ماہ قبل انہوں نے میری کتاب ''قمر اعظم ہاشمی ''(مونوگراف) پر تبصرہ لکھ کر ''اردو بک ریویو'' کو روانہ کیا تھا جو غالباً ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ موصوف نے میرے بیٹا ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی مرتبہ کتاب ''گرامی نامے'' (خطوط بنام انوار الحسن وسطوی) کے لئے بھی ایک مفصل تحریر بعنوان ''حرفِ اعجاز'' عنایت فرمائی تھی۔ یہ کتاب ابھی طباعت کی منتظر ہے۔

ڈاکٹر منظر اعجاز سے اکثر پٹنہ کی ادبی محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کبھی اردو ڈائرکٹوریٹ کی کسی یادگاری تقریب اور محفل سخن میں تو کبھی بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے سیمینار ہال میں منعقد کسی تقریب میں یا پھر گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ میں منعقدہ کسی پروگرام میں۔ جب بھی ملتے نہایت خلوص اور اپنائیت سے ملتے۔ حال احوال دریافت کرتے۔ لکھنے پڑھنے کے تعلق سے پوچھتے کہ آج کل کیا ہو رہا ہے؟ موصوف نے ہم لوگوں (ڈاکٹر ممتاز احمد خان اور راقم السطور) کی دعوت پر کئی دفعہ حاجی پور کی ادبی محفلوں کو اپنی شرکت سے رونق بخشی اور ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ ڈاکٹر منظر اعجاز صاحب پہلی دفعہ ۲۱ اپریل ۱۹۹۶ء کو انجمن ترقی اردو، ویشالی کے زیر اہتمام منعقدہ ''یوم اقبال'' میں بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے اور اپنی عالمانہ گفتگو سے سامعین کو محظوظ و مسرور کیا۔ دوسری دفعہ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۵ کو ڈاکٹر



ممتاز احمد خاں کی رہائش گاہ ''ساجدہ منزل'' میں چار کتابوں کی تقریب اجراء میں شرکت کی اور معروف شاعر، ادیب، صحافی وانشاپرداز جناب قیوم خضر مرحوم کی خودنوشت ''محاسبہ'' پر سیر حاصل تبصرہ پڑھا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر منظر اعجاز صاحب کے استاد گرامی اردو شعر وادب کے نابغۂ عصر پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب، سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی، مظفر پور نے فرمائی تھی۔ تیسری دفعہ ۲۶ اپریل ۲۰۱۵ کو اردو کونسل (ہند) ضلع شاخ ویشالی کے زیر اہتمام ضلع کے مرکزی مقام ''مہوا'' میں مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کی مرتبہ کتاب ''دیوانِ اوج'' اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی تصنیف ''اردو میں مرصّع نثر کی روایت'' کا اجرا فرمایا۔ اس تقریب اجرا کی صدارت معروف شاعر حسن نواب حسن نے فرمائی تھی۔ ''دیوانِ اوج'' پر ڈاکٹر منظر اعجاز نے اپنے عالمانہ و فاضلانہ تبصرہ پڑھا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ ''اردو میں مرصّع نثر کی روایت'' کے تعلق سے ڈاکٹر منظر اعجاز نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی یہ تصنیف ایک اچھوتے موضوع پر ہے جس پر اب تک کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی ہے۔

اپنی تحریر کے اخیر میں پروفیسر منظر اعجاز کی ایک فکر انگیز صدارتی تقریر کا ذکر کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں جس سے اردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ موقع تھا ''اکبر رضا جمشید ایوارڈ'' ۲۰۱۷ کی تقسیم کا۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے اس موقع پر اکبر رضا جمشید کو اپنی ذات میں انجمن اور ان کے نام سے قائم ایوارڈ کو دنیا کا معتبر ترین ایوارڈ قرار دیتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں اردو کی موجودہ صورتحال کی نشاندہی ان الفاظ میں کی تھی:

> ''زبانیں تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہیں۔ جس پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ جب کہ زبان ہی تعلیم وترقی کی اصل بنیاد ہے۔ اردو زبان کی بھی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اردو آبادی اس کے لیے بہت حد تک ذمہ دار ہے، جسے اپنی مادری زبان کی تحفظ وفروغ کی کوئی فکر نہیں ہے۔ صرف بڑی بڑی باتیں کرنے سے کوئی بات نہیں بنے گی بلکہ عملی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے تحفظ اور فروغ کے لئے اردو کی بنیادی تعلیم کا نظم پھر سے قائم کیا جانا چاہئے۔ آج حالت یہ ہے کہ اردو اور ہندی زبان میں ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کرنے والے لوگوں میں تذکیر وتانیث، واحد وجمع اور جملہ واملا کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ لکھنے کا نظام بھی ترقی کے موجودہ دور میں ختم ہوتا جارہا ہے۔ یہ بھی زبانوں کے لئے خطرے کی علامت ہے۔ (قومی تنظیم، پٹنہ: ۱۹ ستمبر ۲۰۱۷)

پروفیسر منظر اعجاز ذیابیطس (Diabetes) کے پرانے مریض تھے۔وہ اکثر بیمار ہوجایا کرتے تھے۔کبھی آنکھ کی تکلیف سے پریشان رہتے جس سے لکھنا پڑھنا موقوف ہوجاتا۔کبھی کسی دوسرے مرض میں گرفتار ہوجاتے۔سال ۲۰۲۰ء میں ''کورونا'' مرض کے بھی شکار ہوئے۔کافی علاج ومعالجے کے بعد ٹھیک ہوگئے،لیکن اس موذی مرض کے بداثرات نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور بالآخر انہوں نے پندرہ دنوں کی علالت کے بعد ۱۹ مارچ ۲۰۲۳ء کی شب میں ''جگدیش اسپتال''، کنکڑ باغ، پٹنہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر ڈاکٹر منظر اعجاز کے انتقال سے اردو دنیا ایک صالح فکر ادیب وشاعر، ایک جیّد ناقد، مصنف، محقق، مبصر اور ایک شفیق استاد سے محروم ہوگئی ہے۔ایسی قدآور ادبی شخصیت کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا واقعی ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ان کی شخصیت اتنی البیلی تھی کہ ان کی یاد برسوں آتی رہے گی اور عرصۂ دراز تک ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔بہت دنوں تک عظیم آباد کی ادبی محفلیں ان کی غیر موجودگی میں سونی نظر آئیں گی۔ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت کے لئے یہ مصرع صادق آتا ہے :

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

Hasan Manzil, Ashiyana Colony,
Sanchi patti P. O. Hajipur
District. VaishaliPin. 844101
9430649112

| | |
|---|---|
| نام کتاب: اس شہر میں | نام کتاب: بے جان پہچان |
| صنف: ناولٹ | صنف: افسانہ |
| مصنف: غیاث الرحمٰن سید | مصنف: عبدالصمد |
| سن اشاعت: ۲۰۲۳ء | سن اشاعت: ۲۰۲۳ء |
| صفحات: ۱۷۶ | صفحات: ۲۱۶ |
| قیمت: ۳۰۰/روپئے | قیمت: ۳۵۰/روپئے |
| ملنے کا پتہ: | ملنے کا پتہ: |
| ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی | ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی |



● ڈاکٹر ابرار رحمانی

# ادیب بے نیاز: منظر اعجاز

اب کوئی معجزہ ہوگا اور نہ ہی کوئی اس معجزے کا منظر نامہ۔اس ایک معجزے کو اللہ نے اس کے منظر کے ساتھ اپنے پاس بلالیا۔منظر اعجاز میرے کرم فرما تھے مگر میرے دوست تھے۔وہ پروفیسر ہونے کے باوجود پڑھے لکھے تھے اور اب بھی پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔یعنی پہلے خود پڑھتے تھے پھر اپنے طلبہ کو پڑھاتے تھے۔میں نے ان کی بیشتر تحریروں کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور مجھے کوئی بھی خالی ڈبہ نظر نہیں آیا۔زبان بھی اتنی صاف کہ کوئی عام انسان بھی اسے بآسانی سمجھ سکے۔یہ ان کی معجزانہ اور کرشماتی شخصیت کا کمال ہی تھا کہ لوگ ان کی طرف کھینچے چلے آتے تھے۔اب دیکھیے وہ مظفر پور کے تھے اور میں بھی مظفر پور کا ہوں،لیکن ان سے ہماری ملاقات پٹنہ میں ہوتی ہے،اور یہیں ملاقات کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا جو ان کی وفات تک قائم رہا۔میں نے جب ''آجکل'' کا چارج سنبھالا اور آجکل کے لحاظ سے اداریہ لکھنے لگا تو کچھ لوگوں کو میری بات چبھنے لگی۔لوگوں نے میرے خلاف اعلیٰ سطح پر خطوط بھیجے،شکایتیں کیں اور مجھے مدیر کے عہدے سے ہٹانے کا مطالبہ شروع کردیا اور وہ اس میں کامیاب ہوگئے۔میرے خلاف ہوئی کارروائی کا سب سے زیادہ اثر اگر کسی نے لیا تو وہ یہی منظر اعجاز تھے۔منظر اعجاز حق گو تھے اور حق کا ساتھ دیتے تھے۔

اب ہمارے منظر اعجاز کا کوئی متبادل نظر نہیں آتا۔یوں تو منظر اعجاز سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی،کبھی کسی ادبی نشست میں کبھی کسی سیمینار میں۔وہ شاعری بھی کرتے تھے۔میں ان کی شاعری بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔وہ زیادہ تر بحر طویل میں غزلیں کہا کرتے تھے۔ان کی شاعری اوسط درجے کی تھی لیکن اچھی اور فنی پہلو سے نک سک سے درست ہوتی تھی،لیکن انھوں نے کبھی اپنی شاعری پر تفاخر اور گھمنڈ نہیں کیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں ۱۸/مارچ کو جنم لیتا ہوں اور وہ ۱۹ مارچ کو بڑی خاموشی سے رخصت ہوجاتے ہیں۔چلیے چھوڑیے! یہ تو قدرت کا قانون ہے کہ اس سرائے فانی میں جو بھی آیا ہے وہ ایک دن جائے گا بھی ضرور۔یہ سلسلہ تو لگا ہی رہتا ہے۔ہر انسان کو اپنی پہچان بنانے کے لیے کچھ تو ایسا ضرور کرجانا چاہیے جس سے وہ مدتوں پہچانا جاتا رہے۔

منظر اعجاز کا میدان عمل درس وتدریس تھا۔جہاں ایمانداری شرط اولین ہے۔جس کا پاس ولحاظ ہمارے پروفیسر حضرات اکثر وبیشتر نہیں رکھتے۔آج کسی بھی شعبے میں ایمانداری نہیں رہ گئی ہے۔سچی بات یہ ہے

وہ اگر کسی محفل یا سمینار میں جاتے اور پروگرام شروع ہونے میں اگر تھوڑی دیر بھی ہوتی تو وہ اس موقع کا بھی فائدہ اٹھا کر کچھ نہ کچھ کام کی باتیں کر جاتے۔ خاموش بیٹھ کر یا ادھر اُدھر کی بات کر کے اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرتے۔ سامنے والا اگر پھر بھی خاموش ہوتا یا لن ترانی بگھار رہا ہوتا تو ان کی کوشش ہوتی کہ کسی نہ کسی طرح وہ جاگ جائے اور اپنی موجودگی کا احساس کرائے۔ میں شاہد ہوں اس بات کا۔ ایک محفل کے شروع ہونے میں ابھی کچھ تاخیر تھی اور لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ مچھلی بازار کا سا ماحول بنا رکھا تھا۔ ایسے میں بھی منظر اعجاز نے ادب کی موجودہ صورتحال پر ہم سے گفتگو شروع کر دی۔ باتوں باتوں میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بھائی ابرار صاحب آپ نے اپنے مضمون ''اردو نظم کا سفر'' پر گفتگو کرتے ہوئے ''اسلامی ترقی پسندی'' کی اصطلاح وضع کرنے کی بات کہی۔ اعجاز کا یہ مضمونچہ دلچسپ ہے۔ اس کے کچھ حصے یہاں نقل کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں۔

عنوان ہے ''ابرار رحمانی کی نئی اصطلاح ''اسلامی ترقی پسندی''' ڈاکٹر منظر اعجاز لکھتے ہیں:

''مژگاں'' کا ۲۳ واں شمارہ پیش نظر ہے۔ اس میں ڈاکٹر ابرار رحمانی کا مضمون ''اردو نظم کا سفر'' یہاں تک کہ اسی شمارے میں ابرار رحمانی کا خط بھی پڑھ چکا ہوں، تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ابرار رحمانی کی تحریروں پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ جوان سال، خوش فکر اور بیباک ناقد ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار واضح الفاظ اور شفاف انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ کہیں کہیں تیکھا بھی ہو جاتا ہے لیکن ایک خاص زاویے سے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خط میں ان کا تیکھا پن بالکل واضح ہے لیکن پہلے میں ان کے مضمون کے ایک جملے پر اپنے خیال کا اظہار کروں گا۔ جملہ یہ ہے:

''اقبال قدامت پرست یا رجعت پسند مسلمان نہ تھے بلکہ اسلامی ترقی پسندی کے قائل تھے۔''

یہاں اسلامی ترقی پسندی کی اصطلاح قابل لحاظ ہے۔

''ممکن ہے کہ ابرار رحمانی کی پیش کردہ یا استعمال کردہ اصطلاح اسلامی ترقی پسندی بھی موضوع بحث بن جائے۔''

مروجہ ترقی پسندی کی فکری اساس مارکسزم ہی ہے جسے بالعموم لادینیت کا فلسفہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس میں انسانی تاریخ کی مادی تعبیر کی گئی ہے جو روحانی فلسفے کی رو سے غلط ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ''اسلامی ترقی پسندی'' کی اصطلاح پر بعض حضرات چیں بہ جبیں ہوں اور یہ موضوع بحث بن جائے۔ ابرار رحمانی کا خط بھی کافی دلچسپ ہے۔ انھیں کسی مضمون نگار نے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا اور کسی نے افسانہ نگاروں کے زمرے میں ڈال دیا۔ اس سلسلے میں ان کی وضاحت قابل لحاظ ہے اور قابل تعریف بھی۔ کوئی کم مایہ قلم کار ہوتا تو سوچتا کہ چلو افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی شہرت مل رہی ہے لیکن وہ جو کچھ کہ نہیں ہیں اس کا سہرا اپنے سر



بندھنا معیوب سمجھتے ہیں۔ ایک قلم کار کے لیے ایسی خودداری نہایت ضروری ہے، لیکن وہ قلم کار بغیر جانے سمجھے کسی کو شاعری اور کسی کو افسانہ نگاری اور کسی کو تنقید کی سند سے سرفراز کرتے رہتے ہیں ان کا اعتبار کیا رہ جاتا ہے؟''

یہ محض منظر اعجاز کی مجھ سے قربت اور محبت کی دلیل ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟

جناب منظر اعجاز کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ کب کہاں اور کس نے کیا بات کہی ہے انھیں وہ خوب یاد رہتا تھا اور موقع کی مناسبت سے وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میری بات خود مجھے یاد نہیں رہتی اور وہ بتا دیا کرتے تھے۔

اس وقت میرے سامنے منظر اعجاز کا ایک مضمون ہے جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے کہ یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو کسی معروف مجلّہ میں برائے اشاعت بھیج دیا جائے۔

مذکورہ مضمون ''فرید پربتی کی رباعیاں اور غزلیں'' کے عنوان سے ہے۔ فرید پربتی میرے اور منظر اعجاز کے مشترکہ دوست تھے اور اکثر جب فرید دہلی آتے تو مجھ سے ملاقات ضرور کرتے۔ اس ملاقات میں دوران گفتگو منظر اعجاز کا ذکر بھی آ جاتا۔

منظر اعجاز بنیادی طور پر استاد تھے۔ اور پڑھنے پڑھانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں کالج ٹھیک ٹھاک ملا تھا۔ اے این کالج جو بودھ گیا میں واقع مگدھ یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ جہاں پی جی کی کلاسز بھی ہوتی تھیں اور اب تو مگدھ کے جو کالجز پٹنہ میں تھے ان سب کو نئی پاٹلی پترا یونیورسٹی کے تحت کر دیا گیا اور ہمارے منظر اعجاز صاحب شعبۂ اردو پاٹلی پترا یونیورسٹی میں صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ یہ ان کی عین خوش نصیبی تھی۔ وہاں ان کے زیر نگرانی کئی اہم شخصیات نے پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرا رکھا تھا اور اب وہ وقت آ گیا کہ چند بہترین پی ایچ ڈی پروڈکٹ پیش کر سکتے کہ مولیٰ نے انھیں بلا لیا۔ معروف افسانہ نگار شوکت حیات ایسے ہی نابغۂ روزگار شخص ہیں جو منظر اعجاز کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور وہ ان سے پہلے ہی انتقال کر چکے ہیں۔

منظر اعجاز ماہر اقبالیات کے طور پر اپنی شناخت رکھتے تھے۔ ۱۹۹۴ء میں ہی اقبال پر ان کی کتاب ''اقبال اور قومی یکجہتی'' اور سنہ دو ہزار میں ''اقبال: عصری تناظر'' شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں ''فیض احمد فیض اور صلیبیں میرے دریچے میں'' ۲۰۰۳ میں ''ظفر عدیم: ایک سخن ساز اور معاصر غزل منظر نامہ'' ۲۰۱۰ء میں شعری مجموعہ ''ورق ورق اجالا'' اور ۲۰۰۶ء میں ''قومی وطنی شاعری کا پس منظر'' ۲۰۱۲ میں ''فراق اور غزل کا اسلوب''، ''تاثرات اور تجزیے'' ۲۰۱۳ء میں۔ انعکاس کے نام سے مظفر پور سے ایک سہ ماہی مجلّہ بھی نکالا تھا جو زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکا لیکن اس کے فراق گورکھپوری نمبر نے بہت شہرت حاصل کی۔

وہ ایک اچھے ناقد، محقق، شاعر اور ادبی صحافی بھی تھے۔ وہ اپنی عمر کی ستر بہاریں دیکھ چکے تھے اور ستر میں سے کم سے کم پچاس بہاریں واقعی ان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ شروع سے ہی وہ لکھتے پڑھتے رہے اور چھپتے چھپاتے بھی رہے۔ اردو کے لیے خاص طور پر وہ ہمارے آجکل اور چند دیگر رسالے کی ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہتے۔ اپنے شاگردوں، کلیگس، احباب اور رشتہ دار سبھوں کو پکڑ پکڑ کر آجکل کا خریدار بناتے تھے اور باذوق قارئین کی ٹیم تیار کرتے تھے۔ سب سے چندے کی رقم حاصل کرنے کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے نہایت خوبصورت اور صاف ستھری تحریر میں ناموں کی فہرست اور ناموں کے آگے چندے کی رقم درج کر کے ہمارے آفس کو بھیج دیتے۔ یہ ساری چیزیں بھیجنے کے بعد وہ ہمیں مطلع ضرور کر دیتے۔

منظر اعجاز صاحب یہ کام پابندی لگن اور محنت سے کرتے تھے۔ ان سب کو پرچہ بھی جاری ہو جاتا تھا، لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد شکایت آنے لگتی کہ ان ان صاحبان کو میگزین نہیں مل رہی ہے۔ یہ شکایتی خطوط وہ ہمارے بزنس ونگ کو بھیجا کرتے اور مجھ سے بھی کہتے کہ ذرا آپ بھی اس معاملے کو دیکھ لیں۔ میں بذات خود بزنس ونگ جا کر شکایتیں دور کرنے کی کوششیں کرتا لیکن میری یہ کوششیں بے کار کر دی جاتی۔ یہ ہمارے بزنس ونگ کی سراسر بے حسی ہے۔ سرکاری اداروں میں نچلی سطح پر ایسی شکایتیں عام ہیں۔ اس بدنظمی پر ضرور کوئی کارگر قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ آجکل میں بولڈ اور بیباک اداریے لکھنے کی پاداش میں مجھے آجکل سے ہٹا کر بطور سزا یوجنا میں بھیجا دیا گیا۔ جو ایک اقتصادی، ترقیاتی اور منصوبہ بندی سے متعلق رسالہ ہے۔ اس خبر سے پٹنہ کے ہمارے احباب تشویس میں مبتلا تھے لیکن ہمارے منظر اعجاز صاحب کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آئے۔ یہ ان کی مجھ سے عین محبت کا ثبوت ہے۔ اردو تنقید کا منظر نامہ ان دنوں بہت خوب نہیں ہے۔ دور دور تک سناٹا نظر آتا ہے۔ گوپی چند نارنگ، محمد حسن، شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی اور ابوالکلام قاسمی جیسے ناقدین اپنے حصے کا کام کر کے اب رخصت ہو چکے ہیں۔ لیکن ان مرحومین نے جتنا اور جیسا کام کر دیا اب اس میں اضافہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دھندلے دھندلے سے دو چار نام نظر آتے ہیں۔ لیکن میں یہاں ان کے نام نہیں لوں گا۔ لائن لمبی ہے، مسند تنقید کے دعویدار دست و گریباں ہونے کو تیار بیٹھے ہیں ایسے میں منظر اعجاز کا دم غنیمت تھا جو اب نہیں رہا۔ ابھی اور جیتے رہتے تو یہی انتظار ہوتا۔

◀◀ ● ▶▶

Tazeen Aptt.
179/22, Zakir Nagar
New Delhi- 110025Mob:7275989646
9911455508 / 8860944899



● ڈاکٹر محمد حامد علی خان

# منظر اعجاز: توانا تخلیقی اور تنقیدی ذہن

جناب منظر اعجاز سے میری دید شنید کا وقفہ کوئی تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ تب کی بات ہے جب میں سائنس کا طالب علم تھا اور منظر اعجاز مظفر پور میں ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرم تھے اور ۱۹۷۸ء میں انہوں نے ایک رسالہ ''انجو'' کا اجراء کیا تھا جس کی حیات تیسرے شمارے پر مکمل ہوگئی۔ پھر ۱۹۸۱ء میں پندرہ روزہ ''انعکاس'' جاری کیا، لیکن یہ بھی چند شماروں کے بعد اپنے مقدر کو پہنچ گیا۔ ہر چند کہ اس کا ضخیم 'فراق نمبر' شائع ہوا۔ منظر اعجاز نے انعکاس کا فراق نمبر شائع کر کے ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا۔ ادبی حلقہ میں اس کی خوب خوب پذیرائی بھی ہوئی۔ اس زمانہ میں منظر اعجاز کی وضع کچھ ایسی تھی کہ میری نگاہ ان تک پہنچتی تو تھی لیکن جملۂ معترضہ کی طرح کیونکہ جناب والا نے تھائی لینڈ سے ذریعۂ معاش و شناخت کی تلاش میں نکلے ہوئے گروپ جسے Thippy کہا جاتا تھا کا سا حلیہ بنا رکھا تھا اور جو ہندستانی زبان میں عام طور پر Hippy کہلاتے تھے کہ جن کی زلف شانوں تک ہوتی اور پینٹ اوپر سے جسم میں سلا ہوا اور نیچے مانو غرارہ ہے جو راہ کی دھول سے ہٹتا ہی نہیں۔ لیکن ۱۹۸۲ء میں جب مظفر پور کے چند نوجوانوں نے روحوں کا مشاعرہ منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا تو خصوصی ادبی مشیر کی حیثیت سے منظر اعجاز مدعو کیے گئے اور میں صرف یوں ان نوجوانوں کا معاون تھا کہ اگر کسی نے پروگرام کے ماحول کو بگاڑنے کی کوشش کی تو میں ایسی کوششوں کو ناکام کر دوں۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے پھر حسن اتفاق کہ میں نے سائنس سے ادب کا رخ کیا تو ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں بالترتیب ایم اے اردو و ایم اے فارسی کے امتحانات ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ دیا اور نتیجہ تقریباً مقابلے کا رہا اور اسی زمانہ میں میں نے جانا کہ منظر اعجاز دراصل سید محمد منظر الحق ہیں۔

یوں منظر اعجاز کا شمار میرے سنیئرز میں ہے۔ پھر ۱۹۹۱ء میں ہم دونوں نے ہی ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، صدر شعبۂ اردو، ایل۔ ایس۔ کالج مظفر پور کی نگرانی میں پی ایچ، ڈی کی سند بہار یونی ورسٹی مظفر پور سے حاصل کی۔ حسن اتفاق کہ مجھے یہ سند جون ۱۹۹۱ء میں ملی جبکہ منظر اعجاز کو نومبر ۱۹۹۱ء میں دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب منظر اعجاز کا مطالعہ و مشاہدہ نکھرنے لگا تھا اور میں رفتہ رفتہ ان کی تحریروں سے متاثر ہونے لگا تھا۔ ان کے کلام کا جو رنگ و آہنگ تھا اور فکر کی جو بالیدگی چھن کر آتی تھی وہ یقیناً اس عہد کے نوجوانوں میں منظر اعجاز

کی انفرادیت کی دلیل تھی۔ ۱۹۹۲ء میں درس و تدریس کے فرائض سے وابستہ ہوتے ہی منظر اعجاز کی ادبی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں اور آج ان کی پہچان نہ صرف یہ کہ زود نویس تنقید نگار کی حیثیت سے ہونے لگی ہے بلکہ زود گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی پہچان تقریباً بن چکی ہے اور ان کی ادبی کاوشوں:

| | |
|---|---|
| اقبال اور قومی یک جہتی | ۱۹۹۴ء |
| اقبال عصری تناظر | ۲۰۰۰ء |
| فیض احمد فیض اور صلیبیں مرے دریچے میں | ۲۰۰۳ء |
| اعجاز نظر | ۲۰۰۶ء |
| قومی وطنی شاعری کا منظر نامہ | ۲۰۰۶ء |
| ورق ورق اجالا | ۲۰۰۹ء |

کو ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔

''اقبال اور قومی یک جہتی'' دراصل منظر اعجاز کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بہار یونی ورسٹی مظفر پور نے انہیں نومبر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض کی تھی۔ بعد میں اسے ہی انہوں نے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ کی اشاعتی مالی امداد سے جون ۱۹۹۴ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ کتاب اپنے ظاہری حسن میں نفاست و سادگی کے ساتھ ساتھ منظر اعجاز کے مزاج و مذاق کی طرف اشارے کرتی ہے لیکن اپنے معنوی مایے کے اعتبار سے یہ فلسفہ و سیاست سے براہ راست متعلق ہے جو بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں اقبال کی شخصیت متنازعہ بھی رہی ہے کیونکہ اقبال کے معترضین اور ناقدین کا یہ عام خیال ہے کہ اقبال کی اولین دور کی شاعری حب الوطنی، انسان دوستی اور قومی یک جہتی کے شعور سے مالا مال ہے لیکن یورپ سے واپسی کے بعد ان کے لہجے اور فکر میں زبردست تبدیلی آئی اور انہوں نے ملت اسلامیہ کی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کو اپنا مقصود بنالیا جس سے قومی یک جہتی کے جذبے کو زبردست ٹھیس لگی۔ یہی نہیں ایک طبقہ تو اقبال کو پاکستان کے بانیوں میں بھی شمار کرتا ہے۔ اس لیے جمہور کی رائے میں ''اقبال اور قومی یک جہتی'' متضاد معاملہ ہے۔ یعنی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا شخص اقبال، قومی یک جہتی کا داعی اور علمبردار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر موضوع کی قرآت پر زور دیا جائے تو یہاں سوالیہ نشان کے ساتھ بھی ذہن بنتا ہے۔

اقبال پر اعتراضات کا دوسرا منطقی جواز یہ بھی ہے کہ اقبال کے تصور خودی اور تصور مرد مومن پر جرمنی مفکر نطشے کا زبردست اثر ہے اور نطشے چونکہ فاسسٹ ہے، وہ اپنی انفرادیت کے زعم میں جمہوریت کو رد کر دیتا ہے اس لیے اقبال کی خودی اسے شاینی فلسفے کا قائل بنا دیتی ہے۔ وہ وطنیت، قومیت اور جمہوریت



کے شعور سے برگشتہ و بیزار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایسے مفکر شاعر سے ''قومی یک جہتی'' کی تعلیم و تلقین کی توقع ہی بے سود ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو اقبال کی شخصیت کو متنازع بنا دیتی ہیں لیکن منظر اعجاز کی تقریباً تمام تر کاوشیں اپنے منطقی جواز سے اس تنازع کو حل کرنے سے متعلق رہی ہے۔

ڈاکٹر منظر اعجاز نے معقول منطقی جواز کے تحت اقبال کو محبّ وطن، جمہوریت پسند، انسان دوست اور قومی وحدت کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اگر ''اقبال عصری تناظر'' کے مشتملات پر نظر ڈالی جائے اور ان کے چند مضامین مثلاً تصورِ خودی، تصورِ عشق، ''ساقی نامہ'' ''شاہین'' اور منظری شاعری کا گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو وہ شکوک و شبہات دور ہو سکتے ہیں جن میں معترضین مبتلا رہے ہیں۔ منظر اعجاز نے اس زاویۂ نظر سے ان فرسودہ موضوعات پر روشنی ڈالی ہے جس کے وسیلے سے اقبال بالکل ہی عام اور روایتی ناقدین کے اندازِ نظر سے مختلف نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی ملت پسندی کا انکار نہیں کیا ہے لیکن فلسفۂ خودی کی ترتیب و تدوین میں اقبال کی اوّلین دَور کی شاعری نیا شوالہ (گائتری کا ترجمہ) آفتاب، جگنو، قومی ترانہ، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، رام اور نانک اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، سے لے کر ساقی نامہ تک کے حوالوں سے کام لیا ہے اور خودی کا فلسفہ مرتب کرنے میں ''ساقی نامہ'' کو بنیاد بنایا ہے۔ جو دوسری طرف خودی کے کامل تصور پر مبنی ہے یعنی جس بنیاد پر اقبال کو فاسسٹ تصور کیا جاتا رہا ہے اسی بنیاد پر منظر اعجاز نے اقبال کو قومی وحدت کا نمائندہ قرار دیا ہے اور یہی تصور جمیعت آدم کا نظریہ بھی واضح کرتا ہے اس طرح یہی چیز انسان دوستی کے شعور کی ضامن ہو جاتی ہے اور انسان دوستی کا جذبہ وطن کے مادی تصور کی واقعیت کو تسلیم کرتے ہوئے آفاقیت اختیار کر لیتا ہے اور یہی چیز جمہوریت اور انفرادیت کو بھی داخلی طور پر مربوط کر دیتی ہے۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں

''من و تو'' کی معنوی تخلیقی ہمکاری سے ہی ''ہم'' یعنی اجتماعی شعور کی مستحکم تعبیر ممکن ہے۔ یعنی اختلافات کے تعین اور استقرار کے بغیر یک جہتی کا تصور ناقص ہے اور منطقی طور پر اس خیال کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وحدت کا تعین تضادات و اختلافات کی ترتیب و تنظیم سے ہی ممکن ہے اس سلسلے میں منظر اعجاز نے چارلس ڈبلیو بوڈیمر جیسے امرائیولوجسٹ کا بے حد مفید اور اہم حوالہ بھی پیش کیا ہے اور اپنے خیال کو زبردست تقویت پہنچائی ہے۔

منظر اعجاز نے اس سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی حوالہ پیش کیا ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ نظریہ پاکستان اقبال کے نظریۂ زندگی سے میل نہیں کھاتا۔ علاوہ ازیں اپنے کئی دوسرے دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کو قیام پاکستان کا محرک قرار نہیں دیا جا سکتا ہر چند کہ انہوں

نے یہ مانا ہے کہ اقبال انڈین یونین میں مسلمانوں کے لیے ایک صوبے کی تشکیل چاہتے تھے جس طرح پنجابیوں اور بنگالیوں کے صوبے انڈین یونین کے تحت پائے جاتے ہیں گویا اس کتاب کے مطالعے سے مصنف کے مطالعے کی وسعت اور اکتسابی شعور کی پختگی کا اندازہ بھی خاطر خواہ طور پر ہو جاتا ہے لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب عام طلبہ کے استفادے کی چیز نہیں ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ موضوع خشک فلسفیانہ، حکیمانہ، سیاسی اور پیچیدہ تو دوسری طرف منظر اعجاز کا لسانی وطیرہ۔

''اقبال عصری تناظر'' مطبوعہ ۲۰۰۰ بنیادی طور پر ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن جب انہیں یکجا کر کے کتابی صورت میں لایا گیا تو اس کی معنوی جہت دوبالا ہوگئی کیونکہ منظر اعجاز نے اس میں سات ابواب قائم کیے مثلاً:

''تصورات: عصری تناظر'': یہاں خودی، پیکار، حریت، شاہین، مردِ مومن، عشق، عورت کے حوالے سے گفتگو کی ہے تو ''معجزات: عصری تناظر'' میں فن، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، نظم نگاری، غزل گوئی اور منظری شاعری کے حوالے سے معجزات اقبال کا بیان ہوا ہے۔ ''تجزیات: عصری تناظر'' میں اقبال کی نظم خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ، ''لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا'' ذوق وشوق، دین وسیاست، ساقی نامہ، فصلِ بہار، محاورہ مابین خدا وانسان، اگر خواہی حیات اندر خطر زی کے حوالے سے گفتگو کی۔ ''الٰہیات: عصری تناظر'' میں مذہب، تصوف، تو ''سیاسیات: عصری تناظر'': میں جمہوریت، اشتراکیت، وطنیت، قومی یک جہتی، انسان دوستی کے حوالے سے گفتگو ہے اور بالآخر ''متفرقات: عصری تناظر: میں مولانا روم، غالب، نطشے کے حوالے سے گفتگو ہے اور بالآخر ''متفرقات: عصری تناظر'' میں اقبال اور عالمی ادب، اقبال بحیثیت مفکر، اقبال بحیثیت نثر نگار، تصورِ خودی اور اقبال وآزاد کے حوالے سے اقبال عصری تناظر کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ گویا یہ پرانی شراب کو نئی بوتل میں منتقل کرنے کا فن بھی ہے لیکن اس کی معنوی گہرائی اور گیرائی نیز وسعت و پنہائی کا اندازہ ڈاکٹر عبدالحق کی اس رائے سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''منظر اعجاز نے دل ونظر کے سفینے کو اقبالیات کے بحرِ بے پایاں میں عزم واستقلال کے ساتھ جس طرح جولاں کیا ہے وہ صد آفریں ہے۔ اقبال پر تحقیقاتِ علمیہ کے ساتھ ایک گراں قدر تصنیف کی پیش کش کے لیے ہم ان کی اقبال شناسی کے معترف ہیں۔ یہ ان کی دوسری مفید اور منفرد کوشش ہے جس میں اقبال کی شعری وفکری جہات کے متنوع مباحث کو سہل وسادہ اسالیب میں پیش کیا جارہا ہے''۔ (ماخوذ۔ اقبال عصری تناظر، سکنڈ فلیپ)



''فیض احمد فیض اور صلیبیں مرے دریچے میں'' منظر اعجازی کی مختصر مگر جامع تصنیف ہے جو فیض کو مکتوب نگاری کے فن میں بھی یکتائے روزگار بنانے کی ایک کاوش ہے۔ دراصل فیض نے ۹ مارچ ۱۹۵۱ء سے ۱۹ اپریل ۱۹۵۵ء تک قید وبند کی صعوبتیں جھیلی تھیں اس دوران کئی مقامات کے جیل خانوں کی ہوائیں کھائیں اور اس دوران اپنی اہلیہ ایلس فیض اور بیٹیوں کے نام انگریزی میں کئی خطوط لکھے تھے لیکن ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہائی کے بعد ان مکاتیب کو از خود اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ میں ۱۲۵ خطوط بیگم کے نام اور آٹھ خطوط اپنی دونوں بیٹیوں کے نام والے شامل ہیں۔ منظر اعجاز نے ان مکاتیب کو چار ذیلی عنوان ''حبسیات''، ''اخلاقیات''، ''انتقادیات'' اور ''فلسفۂ حیات'' میں بانٹ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زیادہ زور فیض احمد فیض کے اسلوب پر دیا گیا ہے اور کوئی نئی بات نہیں کہ فیض کے شعری سرمائے میں اگر ڈکشن پر توجہ مرکوز کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اردو غزل کی مروجہ روایتی لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیور کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ان کے معنوی آفاق پھیل گئے ہیں۔ ان کے جہانِ معانی میں وسعتیں پیدا ہوگئیں ہیں۔ فیض نے بہتیرے گھسے پٹے اور فرسودہ الفاظ کو بھی اپنے استعمال کے سلیقے سے نئی زندگی بخش دی ہے۔ یہاں تک کہ فیض نے حافظ شیرازی کے ڈکشن کو بھی اپنے کلام میں استعمال کیا تو فارسی کی ترکیبیں، علامتیں اور تشبیہیں، استعارے پیکر اردو میں ڈھل کر اردو کا ہی سرمایہ بن گئے اور کچھ ایسی ہی خوبیاں فیض کی نثر میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے اپنے وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر فیض کے مکاتیب کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ یقیناً فیض کو پہچاننے میں معاون ہیں۔ فیض کا فلسفۂ حیات اس کتاب کا وہ باب ہے جو ماہر فیضیات کو بھی حیرت میں ڈال سکتا ہے۔ یہ منظر اعجاز کی فلسفیانہ موشگافیوں کے مذاق ومعیار کی بھی روشن دلیل ہے:

''فیض کے فلسفۂ حیات میں انسان جہاں مرکزی حیثیت اور بنیادی اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے وہیں اس کائنات سے انسان کے رشتے یعنی فرد اور کائنات یا انسان اور فطرت کے ساتھ ساتھ انسان سے انسان کے رشتے کی معنویت واہمیت کا پہلو بھی واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سماجی اور اقتصادی بنیادوں پر فیض نے جو فلسفہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اخلاقیات کے زاویے سے بھی اہم ہے۔ یہاں فیض جس قدر رجائی نقطۂ نظر کے حامل دکھائی دیتے ہیں، اس سے زندگی کا تصور اور بھی مایہ دار یا گراں مایہ دکھائی دیتا ہے۔ فیض کے مطابق زندگی کی اذیت ناکی اور اذیت پسندی میں ہی زندگی کے حسن کا راز مضمر ہے۔''[1]

''اعجاز نظر'' ڈاکٹر منظر اعجاز کے پندرہ مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں منظر اعجاز نے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان مضامین کی نوعیت بہر حال تنقیدی ہی ہے لیکن نظریاتی طور پر اس تنقید کا تعلق کسی مخصوص دبستان نقد ونظر سے نہیں۔ میں ویسے بھی فن میں چاہے، وہ تخلیق

کا فن ہو یا تحقیق وتنقید کا فن، کسی نظریاتی وابستگی کا قائل نہیں۔ حالانکہ نظریاتی وابستگی کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے زیادہ نقصان کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔۲'' لیکن اس مجموعہ مضامین کا کلیدی مضمون فیض احمد فیض کا فلسفۂ حیات اور مولانا ابوالکلام آزاد کا فلسفہ حیات ہے لیکن اس مجموعہ میں مختلف موضوعات کے ہوتے ہوئے بھی قدرے مشترک کی حیثیت رکھنے والی ایک چیز جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے وہ منظر اعجاز کا لفظیاتی اور لسانی نظام ہے اور سب سے بڑھ کر ان کا approach Philosophical جو انہیں معاصر نقادوں میں ممتاز ومنفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔ یوں ان کا مزاج ومذاق شروع ہی سے فلسفیانہ رہا ہے اور اس کے لیے وہ حلقۂ احباب میں بدنام بھی ہیں اور نیک نام بھی۔ مولانا آزاد کے فلسفہ حیات کی تعبیر وتفسیر سے بھی ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''حیات دراصل انا ہی کا ایک پہلو ہے اور انا زندگی کی حقیقی توانائی۔ یہ عمل شعور، ارادے اور مقصد سے ہم کار ہے۔ چونکہ یہ با مقصد ہے اس لئے اس میں حرکت ہے اور چونکہ اس میں حرکت ہے اس لئے اس میں حصول مقاصد کے لئے شدت کی ضرورت ہے اور حرکت میں شدت پیدا کرنے کے لئے رکاوٹ ضروری ہے۔ دراصل قوت حیات اپنے اظہار میں اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب اظہار کی راہ میں رکاوٹ حائل ہو چنانچہ حیات اظہار کے لیے جہاں راہ بناتی ہے وہیں رکاوٹ بھی خلق کر لیتی ہے اور اس میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ دراصل اظہار کی طلب ہی اس کے لئے حدود فراہم کر دیتی ہے اور یہی حدود یا رکاوٹیں ہیں جنہیں واقعیت بھی کہتے ہیں۔ خلق کی سطح پر یہی افراد واشخاص ہیں یا دوسرے مظاہر وموجودات''۔۱

اس اقتباس اور دوسرے بیانات سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ منظر اعجاز کی فکر پر فلسفۂ اقبال کا گہرا اثر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد اور فیض کے مطالعات واکتسابات نے بھی ان کی فکر اور اسلوب پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

''قومی وطنی شاعری کا منظر نامہ'' (جلد اول) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں حرفے چند کے علاوہ نظیر اکبر آبادی، محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الٰہ آبادی، شاد عظیم آبادی، شبلی نعمانی، ظفر علی خاں، سرور جہان آبادی، چکبست، حسرت موہانی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، پرویز شاہدی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، ظفر حمیدی اور محمد اقبال کی قومی وطنی شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے بیشتر مضامین موقر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے تھے بعد میں کچھ اور مضامین شامل کر کے کتاب کی شکل دے دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت پھیلا ہوا تھا جس کی متحمل کوئی مختصر سی کتاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے جو کام ہو چکا تھا اسے منظر عام پر کتابی صورت میں لانے کی کوشش کی گئی۔



منظر اعجاز اپنے فلسفیانہ میلان یا اپنے نسلی خاندانی متصوفانہ رجحان کی وجہ سے وحدت و یک جہتی کے قائل رہے ہیں اور جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال، مولانا آزاد اور فیض کے غائر مطالعے نے بھی انہیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا مبلغ بنا دیا ہے چنانچہ کم وبیش پینتیس برسوں کی قلمی کاوش میں ان کے قلم کی نوک سے کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جس سے وحدت انسانی کے جذبے کو ٹھیس لگتی ہو۔ منظر اعجاز مزاجاً اور فطرتاً گوشہ نشیں قسم کے انسان ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں انہیں Tendency Introvert کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ Tendency Extrovert کے حامل ہوتے تو انہیں امن عالم کا داعی، مبلغ یا علمبردار قرار دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں سمجھا جانا چاہئے کہ وہ زمانہ شناس نہیں لیکن منظر اعجاز خالص Humanist ہیں اور اقبال کو چاہے کوتاہ بیں سیاست داں جتنا بڑا فرقہ پرست سمجھیں لیکن منظر اعجاز یا ان جیسے ادب نوازوں کی نظر میں اقبال سے بڑا شاید کوئی Humanist نہیں اور ان کا Islamist ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اتنے بڑے Humanist ہیں۔ غالباً یہ ان کا آخری تاثر ہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اس کتاب کے مشمولہ مضامین میں اقبال کو آخری سرے پر رکھا ہے۔ ویسے انہوں نے اس کی توجیہ بھی ''حرفے چند'' میں پیش کر دی ہے جو اس طرح ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح قومیت اور وطنیت کا تصور سادگی سے پیچیدگی کی طرف بڑھا اسی طرح اردو میں قومی وطنی شاعری کا میلان بھی جذبات کی سادگی کے ساتھ ابھرا لیکن اقبال تک آتے آتے اس میں فکر وفلسفہ کی شدید کارفرمائی کی وجہ سے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ترتیب میں سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی اور آخر میں اقبال کو رکھا گیا ہے۔'' ۱

لیکن یہ طے ہے کہ منظر اعجاز بھی سماج ہی کا ایک انگ ہیں اور وہ بھی سماج کے دائرے میں ہی رہتے ہیں کوئی خلاء میں نہیں۔ لہٰذا ان سے کچھ غلطی بھی ہوئی جس کی مثال اس مجموعہ میں شامل مضمون ظفر حمیدی کی قومی وطنی شاعری، ہے جو صرف تعلقات کا نتیجہ ہے۔ حقیقت کی زبان کچھ اور کہتی ہے۔ کیونکہ ظفر حمیدی کا پورا شعری سرمایہ رومانیت سے مصلحت پسندی تک کا سفر ہے قومی وطنی شاعری کی مثالیں دراصل مصلحت پسندی ہی کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر حمیدی ان نظموں کے ذریعہ جو پانا چاہتے تھے انہیں میسر نہیں آیا۔

جبکہ ''ورق ورق اُجالا'' منظر اعجاز کا شعری مجموعہ ہے جس میں ان کی فکری نیرنگی و بوقلمونی کا سر جوش ملتا ہے۔ محمد حامد علی خان کا بیان ہے کہ:

''منظر اعجاز کی غزلیں دیگر جدید شاعروں کی طرح عصری مسائل کی پیچیدگیوں اور تلخیوں سے عبارت ہیں۔ ان کے ہاں تہذیبی قدروں کی شکست وریخت، عقیدے کی ٹوٹ پھوٹ، خواب اور تعبیر خواب

کی اذیتیں اور عصری انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن کا انعکاس ہوا ہے۔ان کی غزلوں میں عشق کا سوز و گداز اور تڑپ و کسک بھی موجود ہے۔اور فلسفیانہ پیچیدگی اور لب ولہجہ میں دقت پسندی ہے پھر بھی زبان میں حلاوت اور شیرینی موجود ہے۔ایک خاص قسم کی متانت اور سنجیدگی بھی ان کی غزلوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔سب سے بڑھ کر ان کا مخصوص لب ولہجہ اور منفرد رنگ وآہنگ ہے جو انہیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز بناتا ہے۔''۲

اور یہ امتیاز جو منظر اعجاز کو اپنے ہمعصروں سے الگ شناخت عطا کرتا ہے وہ ہے فکر کی گہرائی اور لفظوں کا اہتمام۔کیونکہ منظر اعجاز کی غزلوں میں ایسے ایسے قافیے اور ردیف کا استعمال ہوا ہے کہ اس پر اتنی رواں،دواں اور فکر انگیز غزلیں کہنا بہتوں کے لیے ممکن ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور یہ سب نہ صرف بے وجہ ہے بلکہ بقول خود اور بہ قلم خود منظر اعجاز:

''فن شاعری شعور کے روشن نقطے کا وہ انعکاس ہے جس میں حیات وکائنات کی تجلیات سمٹ کر بے مثال اور لازوال ہوجاتی ہیں۔لیکن شعور کا یہ لفظ روشن کیسے ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ فطرت جب دل کے تاروں کو چھیڑنے لگے اور روح گنگنا اٹھے تو اس کے آہنگ سے جو شرارے پھوٹتے ہیں۔انہی شراروں سے یہ نقطہ روشن ہوتا ہے۔کوئی بڑی شاعری یا غیر معمولی شاعری اس کے بغیر ممکن نہیں اور یہ کسی معجزے سے کم نہیں۔لیکن یہ معجزہ شاذ و نادر ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ساری زندگی کی ریاضت بھی اس کے لیے کم ہے۔غالباً اسی وجہ سے افلاطون نے فن شاعری کو عطیہ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔یعنی دوسرے کمالات زندگی کی طرح فن شاعری بھی خدائے بخشندہ کی بخششوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔

میرا علم،میرا فن بھی جو ہے وہ جس معیار کا ہو،اسی خدائے بخشندہ کی بخششوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے''۔۱

دراصل منظر اعجاز نے اقبال اور غالب وفیض کا مطالعہ اس قدر دقیقہ سنجی سے کیا ہے کہ وہ بھی ان اصحاب فن کے ارادت مندوں میں شامل ہوگئے ہیں اور اپنے فن کو کبھی اقبال کے اس مصرع:

پاک رکھ اپنی زبان تلمیذ رحمانی ہے تو

تو کبھی غالب کے اس بیان کہ'' آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں'' کے مصداق تصور کرتے ہیں اور جناب منظر اعجاز کا یہ دعویٰ کسی حد تک حق بہ جانب بھی ہے۔میں نے اکثر انہیں دیکھا کہ ہم لوگوں خوش گپیوں میں محو ہیں اور اچانک کچھ دیر کے لیے چپ ہوگئے۔گفتگو کا سلسلہ توڑ کر جیب (جو کبھی پوسٹ بکس ہوا کرتا تھا) سے ایک کاغذ نکالا اور شاعری شروع ہوگئی۔پھر اشاروں میں کبھی چائے کی فرمائش کردی تو کبھی سگریٹ کی اور درمیان میں کسی نے ٹوک دیا تو ان کا انداز ''اچھا چلتا ہوں''۔نہایت ہی بداخلاقی کے ساتھ وہ چل دیتے اور انداز بھی ایسا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہو اور وہ پناہ کے لیے بھاگ رہے ہوں اور یہ کیفیت نہ صرف ان کی عملی زندگی کا خاصا رہی بلکہ ان کے فن میں بھی در آئی ہے کہ کبھی وہ اپنے گردونواح کے ماحول میں گھٹن محسوس



کرتے ہیں تو کبھی اس سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔پروفیسر وہاب اشرفی کا بیان ہے کہ:

'' ڈاکٹر منظر اعجاز فنی اعتبار سے ایک پختہ شاعر ہیں جن کے یہاں Contradictions کا اجتماع اور ادغام ہے۔وہ سامنے کے لفظوں سے Irony کی کیفیت پیدا کرنے میں بے حد چابکدست نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں صنعتوں کا استعمال روایتی نہیں ہے اور اس میں وہ حدت سے زیادہ صلابت پر یقین رکھتے ہیں اب فکری نظام کی طرف واپس آیئے تو ایک صورت ان کے یہاں ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ایک طرف وہ زندگی کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹھیک اسی وقت کوئی احساس درد بھی کہیں نہ کہیں ابھر جاتا ہے اس لیے اپنی فکری روش میں مثبت رجحان کے باوجود انفعال کی کیفیت سے گزرتے رہتے ہیں''۔۱

اور اب پروفیسر وہاب اشرفی کا یہ بیان دیکھیں:

''منظر اعجاز نے بحیثیت شاعر اپنی شناخت کروانی چاہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعر یا افسانہ نگار سے زیادہ ان کے مضامین متاثر کرتے ہیں۔دراصل ان کا تنقیدی ذہن مطالعہ اقبال اور فیض سے مرتب ہوتا ہے۔لہٰذا ان کے تنقیدی مضامین میں ان جہات کی تلاش ملتی ہے۔جن کے پس منظر میں اقبال اور فیض شعر کہتے رہے تھے۔ترفع کی تلاش ان کے مضامین کے وہ پہلو ہیں جو ان کی ہر تحریر سے نمایاں ہے۔

منظر اعجاز نے کچھ افسانوں کے جائزے میں اپنی بصیرت کا احساس دلایا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک اچھا نقاد ان کے اندر پرورش پا رہا ہے۔''۲

مجھے پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کے ان دونوں بیانات میں روایتی طریقہ تنقید کی کیفیت ملتی ہے کہ ''میرے تو دونوں بھلے'' یوں مجھے منظر اعجاز کی شاعری خوب صورت،توانا،اور بڑی جاندار لگتی ہے کیونکہ ان کے ڈانڈے کلاسیکی شعری روایات سے مل جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا لسانی وطیرہ ہر چند کہ عام نہیں پھر بھی کوئی بیزار کن یکسانیت نہیں ملتی جبکہ ۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری میں یہ چیز اکثر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔منظر اعجاز کی شاعری ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق نہیں ہوتی۔ان کے اشعار میں جو فکری گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے،وہ جب تک گرفت میں نہ آئے،ان کے اشعار سے لطف اندوزی کی توقع بیکار ہوگی مثلاً یہ شعر:

ریزہ ریزہ ہوئے تابندہ خیالوں کے ورق　　تیرگی چاٹتی جاتی ہے اجالوں کے ورق

یا

میرے مورث کا جو ترکہ تھا نہ محفوظ رہا　　دیمکیں چاٹ گئیں کہنہ رسالوں کے ورق

اقدار کی شکست وریخت اور پامالی کا یہ حزنیہ اظہار اس لب ولہجہ اور اس انداز واسلوب میں ان کے معاصرین کے یہاں کہیں اور نہیں مل سکتا۔

ایک دوسری غزل کا مطلع اور ایک شعر ملاحظہ ہو:

فصیل سنگ اثر پہ پھیلے تو حدِّ دشت انا نہ ٹوٹے　　پھسل پھسل کر مرے لبوں سے کہیں یہ حرفِ دعا نہ ٹوٹے
حدودِ عرفاں کی منزلوں پر ہیں سنگ میل آگہی کے روشن　　قیاس تیرہ نگاہ سے پھر تجلیٔ نقش پا نہ ٹوٹے
خواب پلکوں سے لرز کر جو گرا ٹوٹ گیا　　گرچہ شیشہ بھی نہ تھا کیسے بھلا ٹوٹ گیا

آٹھ اشعار پر مشتمل یہ پوری غزل جس حزینہ کیف کی حامل ہے وہ اشعار سے ظاہر ہے لیکن اس کے بعض اشعار میں جو DepthPhilosophical ہے اس کی وجہ سے حاشیہ تاویل کی وسعت پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ مثلاً:

جوں کہ تو ں رہ گئی پارینہ خیالوں کی فصیل　　زندگی کا جو تصور تھا نیا ٹوٹ گیا

اس شعر سے اس انقلاب کی طرف بھی اشارہ مقصود ہوسکتا ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سائنس کی دنیا میں رونما ہوا۔ جس کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے قطعیت پسندانہ میلان کو شدید جھٹکا لگا۔ کائنات کی Validity Solid بٹ گئی اور مادہ لہروں کے نظام میں تبدیل ہوگیا جس کے پیش نظر اقبال نے اس خیال کا اظہار کیا کہ کلاسیکی طبیعات کی جڑوں کی تنقید شروع ہوچکی ہے اور یہ موسم مذہبی تجربات کے لیے نہایت ہی موافق ہوگیا ہے۔ یعنی مذہب وروحانیت کو جھٹلانے والے خود ہی جھوٹے ثابت ہوچکے ہیں۔ گویا کہ روحانی اقدار کی بالادستی کو اس صورت حال سے تقویت ملی تھی۔

ویسے کچھ اشعار ایسے بھی منظر اعجاز کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں جو سادہ نظر آتے ہیں لیکن ان کی پرکاری وہاں بھی مطالعے کی سنجیدگی اور متانت کا تقاضہ کرتی ہے۔

وہ تو اک پتھر تھا اور پتھر کا پتھر رہ گیا　　موم تو میں بھی نہ تھا کیسے پگھل کر رہ گیا
نیند کی لذت سے جب محروم آنکھیں ہوگئیں　　ترجمان شب شکن آلود بستر رہ گیا

یا

جب کسمسائی سانسوں میں خوشبو حیات کی　　رکھ کر زباں کانٹوں پر پھولوں سے بات کی

اس طرح کے بے پناہ شعر منظر اعجاز کے مجموعہ غزل ''ورق ورق اجالا'' میں بھی ہیں اور ''مباحثہ'' اور انتساب، وغیرہ میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیلی تجزیہ درکار ہے۔ اگر عمر سے وفا کرسکا تو ان کے شعری سرمایے کا تجزیاتی مطالعہ الگ سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ طے ہے کہ منظر اعجاز کا آہنگ فکر اور رنگ سخن زمانے سے جدا ہے اور یہی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

سید محمد منظر الحق، منظر اعجاز ابن سید مقبول احمد نے زندگی کے سرد وگرم موسم کے تقریباً ۷۱ سال کا تجربہ



جھیلا یعنی سند کے اعتبار سے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو موضع رسول پور ترکی، ڈاکخانہ اسوئی، ضلع ویشالی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں مڈل بورڈ کا امتحان پاس کیا۔ پھر بھگوان پور ہائی اسکول، ویشالی سے ۱۹۷۱ء میں ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کر مظفر پور آگئے۔ اور مضافاتی طبیب کی حیثیت سے مظفر پور کے شکل روڈ میں ایک مطب بنالیا۔ بلا کے ذہین تھے اس لیے یہاں کے شعراء، وادباء سے تعلق قائم ہوا جن میں ظفر عدیم، اسد رضوی، قیصر صدیقی اور چندر بریلوی ان کے رفقاء میں رہے۔ ۱۹۷۹ء میں پھر تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء میں بالترتیب ایم۔ اے اردو، ایم۔ اے فارسی کے امتحانات میں شریک ہوئے اور بہتر نتیجہ حاصل کیا۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی صدر شعبۂ اردو ایل ایس کالج کی نگرانی میں ''اقبال اور قومی یک جہتی'' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء میں یونی ورسٹی سروس کمیشن پٹنہ کی سفارش پر پہلے ایس۔ یو۔ کالج ہلسہ میں اردو کے لکچرار مقرر ہوئے۔ تقریباً سات برسوں کی تگ ودو کے بعد ان کا تبادلہ اے۔ این۔ کالج، پٹنہ میں ہوگیا۔ یہیں سے ریڈر اور پروفیسر تک کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۸ مارچ ۲۰۱۸ء کو مگدھ یونی ورسٹی گیا سے الگ ہوکر پاٹلی پتر ایونی ورسٹی، پٹنہ قائم ہوئی تو پاٹلی پتر ایونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے پہلے صدر شعبہ ہوئے لیکن دسمبر ۲۰۱۸ء ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ شومئ قسمت کہ ابھی ادب کی خدمت کرنا باقی ہی تھا کہ مسلسل امراض میں مبتلا ہوتے گئے اور بالآخر ۱۹ مارچ ۲۰۲۳ء کو صبح کے تقریباً تین بجے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ منظر اعجاز ہر چند کہ کم گو واقع ہوئے تھے لیکن ادبی محفل اور مذاکرہ ہو تو مختصر کرنے کی گزارش کرنا ہوتی تھی کہ یہ اپنا مکمل مطالعہ ومشاہدہ پیش کرنے کی کوشش کرتے اور سامع جو مادیت پرستی کا قائل ہوتا بیزار ہونے کو آجاتا تھا۔ شعری نشستوں میں بھی ان کا حال یہ ہوتا کہ چار مصرعے، یہ اشعار اور یہ غزل ملاحظہ ہو۔ تب یارانِ بے تکلف کہہ اٹھتے منظر صاحب ڈیڑ کیونٹل ٹھانس دیا پھر ایک قہقہہ اٹھتا اور منظر صاحب چلیے خیر شکریہ کہتے ہوئے مخصوص مسکان کے ساتھ اپنی جگہ لے لیتے۔ منظر اعجاز احباب پرست بھی واقع ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے خاصا وقت اور خاصی توانائی اپنے ان احباب کے فن کی شناخت پر صرف کیا کہ جو ادب کا حصّہ نہ بن سکے۔

◀◀ ● ▶▶

Prof.Deptt.ofUrdu
B.R.A.BiharUniversity,Muzaffarpur
Mob:9431073132
Email-:hamidalikhan546@gmail.ocm

● ڈاکٹر منظر اعجاز

# ہونہہ مسلمان!

''ڈاکٹر صاحب کیس جیت گئے۔''

''ڈاکٹر صاحب کیس جیت گئے۔''

ظفیر تو مارے خوشی کے بے حال ہو رہا تھا۔اس کی یہ کیفیت گاؤں والوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔سائیکل تو خیر وہ چلاتا ہی تھا مگر اس طرح اچک اچک کر نہیں۔اس کا پیندا تو سائیکل کی سیٹ پر ٹک ہی نہیں پا رہا تھا۔لگتا تھا اس کے بازوؤں پر پری زادوں کی طرح پر نکل آئے ہیں۔وہ مست پرندے کی طرح لگاتار چہکار رہا تھا۔سناٹے کی طرح سے گذرتا تب بھی اس کی چہکار بند نہیں ہوتی اور جب کسی کے دروازے سے گذرتا تو اس کی چہچہاہٹ اور تیز وہ جاتی۔حالانکہ ہوگاؤں کا حجام بھیکو ٹھاکر تو تھا نہیں مگر پتہ نہیں کسی نے اسے پیغام رسانی پر مامور کیا تھا یا نہیں قیافہ شناس لوگوں نے اس کی باچھیں کھلی ہوئی دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ یہ شتر بے مہار لٹک میں حجامی پر اتر آیا تھا۔

اس گاؤں کی روایت تھی کہ مسلمانوں کے گھروں میں شادی بیاہ کی تقریب ہوتی تو دعوت نامہ تقسیم کرنے کے لیے یا مولود شریف کی محفل سجنے والی ہوتی تو حجام ہی سے خبر بھجوائی جاتی۔ان دنوں اس کام لیے بھیکو ٹھاکر ہی کو مقرر کر لیا گیا تھا۔لیکن ظفیر تو کھرئی حجام نہیں۔وہ تو ڈاکٹر صاحب کا پڑوسی تھا۔لیکن اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔پڑوسی تو اور بھی تھے۔اور وہی اغل بغل میں کئی گھر تو ڈاکٹر صاحب کے رشتے دار بھی تھے۔جس میں سے کئی چہرے پر یہ خبر سن کرنا گواری کے آثار بھی پھیل گئے تھے۔

ظفیر ویسے بھی اپنی بے تکی حرکتوں کی وجہ سے کئی لوگوں کو بالکل ہی نہیں بھاتا تھا۔اس دن تو بڑا احمق معلوم ہو رہا تھا۔کیوں کہ ڈاکٹر صاحب کے کیس جیتنے کی خبر وہ جس طرح طشت از بام کر رہا تھا۔اس کی حقیقت سے اپنے پرائے بھی کسی حد تک واقف تھے۔کسی نے دبھی زبان میں کہہ بھی دیا کہ یہ جیت نہیں۔بڑی ہار ہے مگر یہ الو کیا جانے۔ان کا اشارہ ظفیر کی طرف ہوتا کوئی کہتا یہ ڈاکٹر کا لٹک بنا ہوا ہے اور کوئی کہتا کہ یہ چمچہ اور ڈوئی سے بڑھ کر چھل اور بیلچہ بنا ہوا ہے ڈاکٹر کا۔ظفیر پڑوسیوں کے ایسے تیکھے تبصروں سے بے نیاز وفور جذب و مستی میں وہی فقرے ''ڈاکٹر صاحب کیس جیت گئے۔'' کی ہانک لگاتا ہوا گاؤں کے وسط



جنوب سے سائیکل پر اچکتا ہوا نکلا تو پچھم پورب اور اتر کے چکر کاٹتا رہا۔

''ڈاکٹر صاحب کیس جیت گئے۔'' کہیں کہیں کسی کسی نے روک کر ٹوکا اور تفصیل جاننے کی کوشش کی لیکن ظفیر وہی فقرہ دہراتا رہا۔''ڈاکٹر صاحب بیس جیت گئے۔'' اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم تھا ہی نہیں تو وہ بتاتا کیا۔اس گاؤں میں ڈاکٹر کا تنہا چمچہ وہی نہیں تھا۔کچھ لوگ بلکہ زیادہ تر لوگ اسی قسم وقماش کے تھے اور ڈاکٹر سے مرغوب رہتے تھے۔ان میں سے اکا دکا کچھ لوگ ڈاکٹر کو نہ صرف سلامی دینے بلکہ تفصیل جاننے اور مبارکباد پیش کرنے لیے بھی پہنچنے لگے۔ڈاکٹر صاحب ایسے لوگوں کی نفسیات سے تو واقف تھے اور پھر وہ روپے پیسے اور رسوخ کی وجہ سے جیل جانے سے بال بال بچ گئے تھے۔اس لیے ان کی خوشیوں کا توٹھکانہ تھا ہی نہیں۔حاجی پور کے سب ڈیویزن کورٹ میں سید شاہ ولایت حسین کے پر پورے حنان صاحب نے ان پر قبروں کی پامالی اور بے حرمتی کا مقدمہ کر رکھا تھا۔ان کے گواہوں میں مولوی ابوبکر، محمد کریم اور بندہ سنگھ کے علاوہ باسو سنگھ بھی تھے قبروں کی بے حرمتی اور پامالی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی لیکن کورٹ کو ان گواہوں کے علاوہ جو ثبوت چاہئے تھا وہ پیش نہیں کیا جا سکا تھا۔حالانکہ کورٹ غیر ضروری ثبوت طلب کر رہا تھا کیوں کہ وکیل نے اشاروں اشاروں میں دوران جرح اچھے خاصے نذرانے کی پیش کش کر دی تھی۔ڈاکٹر نے کئی دوسرے ہتھکنڈے بھی اپنائے تھے اور منصف مجسٹریٹ کے گھر ڈالی بھی بھجوائی تھی۔گویا کہ اس نے ڈاکٹر کا نمک کھا لیا تھا۔اس لیے اس کا سارا زور اس بات پر تھا کہ ''کیا یہ دعویٰ مدعی نے جو کیا ہے کہ قبروں کی بے حرمتی اور پامالی ہوئی تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ اسی پہلو کو جواز بنا کر اس نے مقدمے کو خارج کر دیا تھا اور اس طرح ڈاکٹر کی گلو خلاصی ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر کے لیے یہ سوال زندگی اور موت کا بھلے ہی نہ ہو لیکن مونچھ کا تو ضرور تھا۔حالانکہ وہ تو کلین شیو تھے۔البتہ رعب داب اور عزت ووقار کا مسئلہ ضرور تھا۔وہ اپنے دیار و امصار سے نکل کر اس گاؤں میں آ بسے تھے۔سسرالی مکان میں رہتے تھے اور اسی میں برآمدے پر کرسی ٹیبل لگا کر کلینک قائم کر لیا تھا۔حالانکہ وہ سند یافتہ ڈکٹر نہیں تھے،لیکن اس زمانے میں اور بھی ایسے ڈاکٹر گاؤں میں ہوا کرتے تھے اور انہیں چھولا چھاپ ڈاکٹر نہیں کہا جاتا تھا۔وہ تو گاؤں کے ماحول میں فرشتۂ رحمت سمجھے جاتے تھے۔سرکاری اسپتال تو کئی کئی کوس دوری پر ہوا کرتے بازار یا شہر کے علاقے میں لیکن کبھی ڈاکٹر غائب وکبھی کمپاؤنڈر یا نرس غائب اور اگر یہ سب موجود ہیں تو دوا غائب۔موجودہ دور میں تو اور بھی حالات ناقابل بیان ہیں شہروں کے اسپتالوں کے مریضوں کی موت کی شرح گاؤں کے علاج ومعالجے اور موت کی شرح سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔پرائیوٹ اسپتالوں میں اگر بہتر نظام معالجہ ہوتا ہے تو خرچ کی تاب ایرے غیرے تو لا نہیں سکتا۔آج بھی اگر گاؤں میں ڈاکٹر کبیر احمد جیسے ڈاکٹر جو عام طور چھولا چھاپ کہے جاتے ہیں، نہ ہوتے تو خدا ہی

جانے کہ بے موت مرنے والوں کی تعداد کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے۔

ڈاکٹر کبیر احمد بھی مرگھٹ پر بیٹھے گدھ سے کم نہ تھے۔لیکن تھے اقبال مند لوگ دستِ شفا بھی سمجھتے تھے اس لیے لازمی کہ اس علاقے کے سب سے بڑے ڈاکٹر وہی سمجھے جاتے تھے اور جو زیادہ سیریس قسم کے مریض وہتے تھے، وہ انہیں کے یہاں لائے جاتے تھے اور جو لائے جانے کے قابل نہ ہوتے تھے تو ان کے علاج کے لیے ڈاکٹر صاحب کو کسی قاصد کے ذریعہ کال کرلیا جاتا تھا۔ان کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ جسے وہ خود سے سنبھلتا ہوا نہیں پاتے تو شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کے یہاں چن سے ان کے تعلقات ومراسم تھے، وہاں ریفر کردیتے تھے یا خود ساتھ جا کر مریض کو وہاں پہنچا دیتے تھے۔اس وجہہ سے بھی اس علاقے میں ان کی مقبولیت اور عزت وشہرت کو چاند چاند لگے ہوئے تھے جو انہیں مرگھٹ کا گدھ سمجھتے تھے وہ بھی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ان سے علاج کرنانے پر مجبور ہوجاتے تھے۔وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بھی کسی رورعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔مریض اگر کسی وجہہ سے ان کا مقروض مرا تو کسی نہ کسی طرح سے اس کے وارثوں سے قرض وصول کرتے لیتے تھے۔ان کی شخصیت کا یہ ناگوار پہلو بھی پڑوسیوں کے پیش نظر تھا۔اس لیے بھکت بھوگی منھ پر تو نہیں لیکن پیٹھ پیچھے آپسی گفتگو کے دوران غیر ارادی طور پر یا ان کی زبان پھیل جاتی تو یہ فقرہ ادا ہوتا کہ ''یہ ڈاکٹر ہے کہ جلاد!'' ایسے ہی بھکت بھوگیوں میں ایک پڑوسی فقیرہ بھی تھا۔ہر چند گم دس کا اص نام کچھ تھا۔ایک بار ذکر چھڑ گیا تو اپنا دکھڑا روتے روتے اس نے ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔''اماں سٹریس ہوگئی تھی۔شہر لے جا کر علاج کرانے کی اس وقت سکانی (سکت) نہیں تھی۔انہی سے علاج کروایا تھے تو پڑوسی ہی کچھ نقد اور کچھ ادھار کے ساتھ علاج شروع ہوا۔مگر اماں بچ نہ سکیں۔ڈاکٹر صاحب کا کچھ روپیہ باقی رہ گیا تھا مختصر سی رقم تھی۔انہوں نے اس وقت تو اس کا مطالبہ نہیں کیا سمجھا کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے معاف کردیا ہوگا۔لیکن انہوں نے معاف نہیں کیا تھا۔کافی عرصہ گذر گیا۔تب تک میری مالی حالت کچھ بہتر ہوگئی تھی۔اس لیے غلہ کی خریداری کے لیے میرے ماموں بیل گاڑی سے بازار کی طرف روانہ ہورہے تھے۔میں بھی ساتھ ہولیا۔میرے گھر کے سامنے ہی ڈاکٹر صاحب کا بھی گھر تھا، ہمیں نکلتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تو بولے۔کہاں کا ارادہ ہے۔میں ارادہ ظاہر کردیا تو انہوں نے روک لیا اور لپک کر اندر گئے اور جھٹکتے ہوئے گھر سے نکلے اور میرے ہاتھ میں ایک ہزار کا روپیہ تھماتے ہوئے بولے۔''یہ سامان کی فہرست ہے لیتے آنا۔کچھ پیسہ اور لگ جائے تو یہاں آ کر لے لینا۔'' جب ہم بازار سے واپس آئے تو مطلوبہ سامان ان کے حوالے کرتے ہوئے حساب بھی دے دیا۔کچھ روپے میرے لگے تھے، یہ زبانی طور پر بتادیا۔امید تھی کہ جو روپیہ میں نے لگایا تھا، اسی وقت وہ ادا کردیں گے۔لیکن انہوں نے ایسا کیا نہیں۔بولے''جائے آپ کی اماں کے علاج کے دوران میرا کچھ باقی تھا وہ مہنا ہوگیا۔''میں تو ہکا بکا رہ گیا۔کیا کرتا پھر بھی ہمت کر کے کہا۔



''اس وقت تو آپ نے کہاں نہیں تھا۔'' اسی لمحے نانی کا یہ فقرہ یاد آ گیا۔'' دمڑی کی ہانڈی گئی اور کتے کی ذات .....''بہر حال ڈاکٹر کی شخصیت کا یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آچکا تھا اور میرے تجربے کی روشنی میں اس قول کی تصدیق ہوچکی تھی کہ ''یہ ڈاکٹر ہے کہ جلاد!'' ڈاکٹر کبیر احمد کائیاں ہونے کے ساتھ ساتھ مغرور اور متکبر بھی تھے لیکن تھے تو مقبول اور مشہور ڈاکٹر اور اک ایک خوبی بھی ان میں تھی۔وہ تھے بڑے مٹھ بولے۔ان کی شخصیت کے بعض منفی پہلوؤں کو بالمصلحت لوگ نظر انداز کردیتے تھے۔لیکن کبھی کبھی اور خاص طور سے جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد سے متصل نیم کے پرانے چھتنا دار اور سایہ دار درخت کے سائے میں تھوڑی دیر کے لیے کچھ لوگوں کی جمگھٹ لگ جاتا تو بہت ساری گئی گذری یہاں تک کہ بے سر پیر کی باتیں بھی عمر دارز لوگوں کی خوش کپیوں کا موضوع بن جاتی۔ایسے ہی میں کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کا ذکر بھی چھڑ جاتا اور سید شاہ ولایت حسین علیہ الرحمہ کا بھی اور خاص طور پر مسجد کے حوالے سے۔سید شاہ ولایت یسن کو عمر رسیدہ لوگ ان کے عرف بابو جان کے نام سے ہی یاد کرتے تھے، ان کی بزرگی، عملیات اور کشف وکرامات کے قصے بھی اکثر چھڑ جاتے وہ شاید مرمر کی سلوں سے ناخوش وبیزار تھے۔اس لیے مٹی کا حرم تعمیر کریا تھا۔اور اسی کے پاس قبر کھدوا کر چلہ کشی کے لیے زندہ دفن ہوگئے تھے۔اس عمل کے لیے چالیس دنوں کی مدت مقرر کی تھی۔لیکن ایک دن پہلے ہی براہل نے نہایت مجبوری کی حالت میں قبر میں منھ سٹا کر انہیں آواز دی۔حالانکہ انہوں نے سختی سے منع کردیا تھا کہ چالیس دنوں سے پہلے انہیں آواز دی جائے نہ قبر سے نکالا جائے لیکن براہل کی مجبوری یہ تھی کہ برٹش حکومت کے کارندے نے لاٹ کی عدم آئیگی کی وجہہ سے ان کی ساتھ موضع کی ملکیت کو نیلامی پر چڑھا دیا تھا اور اغل بغل کے گاؤں کے زمندار بولی لگانے لیے پہنچنے لگے تھے۔چنانچہ کان میں آواز پڑی تو لامحالہ کہ کہ ''نکالو' اور وہ نکالے گئے۔اس کے بعد جو ہونا تھا ہوا۔عمل میں خلل پڑ ہی چکا تھا۔انہیں اپنی ملکیت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ رہی یا گئی، اس سے انہیں تو کوئی سروکار نہ تھا۔یہ ان کے جوابنی کا زمانہ تھا لیکن عمر رسیدگی کے زمانے میں ضعف قویٰ سے دست ودیوار جلنے پر مجبور ہوئے تو اپنے مکان کے قریب ہی پھر ایک مٹی کی مسجد تعمیر کرائی۔پہلے والی مسجد بھی مٹی ہی کی تھی جو وقت کے بہاؤ میں مسمار ہوکر بہہ نکلی تھی۔یہ انیسویں صدی عیسوی زمانہ تھا۔اور اب بیسویں صدی کے نصف دوم اینٹ گارے کی چھت دار مسجد موجود تھی پنج وقت نماز تو اغل بغل کے چند مصلیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔لیکن جمعہ ادا کرنے کے لیے آس پاس کے دوسرے گاؤں سے بھی لوگ آتے تھے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد نیم کے پیڑ کے سائے میں تھوڑی دیر ٹھہر کر ایک دوسرے سے علیک سلیک بی کرتے اور خیر وعافیت بھی دریافت کرتے اس دوران اکچر کئی گذری باتیں بھی نکل آتیں، اور کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کی طرف بھی توجہ مبذول ہوجاتی اور وہ گفتگو کا موضوع بن جاتے۔ڈاکٹر صاحب جمعہ کی نماز کے لیے بھی مسجد میں قدم رنجہ فرمانے سے گریز کرتے اور عیدین کی نمازیں وہ

اپنے آبائی گاؤں ہی میں ادا کرتے رہے ہوں گے۔ اس گاؤں میں تو ان کی سسرال تھی۔ ان کے سسر صاحب جثیت تھے اس لیے پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے یہاں اڈا جمایا پھر کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر خانہ قائم کیا۔ اور خوش نصیبی سے ان کی ڈاکٹری چل نکلی اس لیے ان کے حوالے سے دوران گفتگو ایسے تبصرے بھی سامنے آتے کہ ”ہے یہ شخص مقدر کا سکندر۔ جو لوگ ان کے پس منظر سے واقف تھے کہتے کہ ان حضرت نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا حالانکہ ساتھ ساتھ امتحان میں بیٹھے اور ہر سال فیل ہوتے رہے۔ گھرانہ خوش حال تھا۔ مگر یہ خود کند ذہن تھے چھنپ مٹائے نہیں مٹتی تھی۔ یہاں شادی ہوئی تو یہیں کے ہو رہے۔ بیٹھا بنیا کیا کرتا؟ یہاں کا ماحول راس آیا اور بغیر پڑھے لکھے ڈاکٹر بن بیٹھے۔ اور ڈاکٹری چل نکلی۔ آس پاس کے کئی گاؤں سے مریض آتے جو اچھا ہوتا وہ ان کا مرید بن جاتا۔ کئی گاؤں تک شہرت پھیلی۔ مختلف مذاہب اور ذات برادری کے سربرآوردہ لوگوں سے مراسم و تعلقات استوار ہوئے اور صاحبان اثر و رسوخ میں شمار کئے جانے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے اثر و رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے بندوق کا لائسنس لیا اور پھر بندوق بھی لے لی۔ اس سے پہلے انہوں نے ائر گن بھی لیا تھا اور ادھر ادھر چڑیوں کا شکار کرنے بھی نکل جاتے تھے اور کبھی کبھی تو بغیر کن کے پری زادیوں جیسی آدم زادیوں کا بھی شکار کر لیتے تھے ممکن ہے خود ہی شکار ہو جاتے ہوں گے۔ چالیس کی عمر کے بعد بھی نہایت ہی خوبصورت اور اسمارٹ تھے۔ ندشاید کسرتی نہیں تھا لیکن فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا بلکہ دو چار کوس کی دوری پر جو فٹ بال میچ ہوا کرتے تھے بالعموم ان کی ریفری وہی ہوا کرتے تھے۔ موسم کی مناسبت سے بیڈمنٹن بھی کھیلا کرتے تھے لیکن اپنے گھر کے صحن میں اپنے لڑیوں یا عزیزوں کے ساتھ اور محرم کے کھاڑے یا جلوس میں لاٹھیاں بھی بھانجتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اثر و رسوخ کی وجہ سے بندوق کا لائسنس لینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ پھر انہوں نے بندوق بھی لے لی۔ نیل کے شکار پر بھی نکل۔ اس علاقے میں نیل کو لوگ گھوڑ پراس کرتے تھے دور دراز گاؤں سے بھی نیل کے شکار کے لیے اصرار کر کے بلاتے اور حسب ضرورت تعاون بھی فرماتے۔ خاص طور سے ان علاقوں کے کسان جن کی فصلیں نیل کے جھنڈ تباہ کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں آوارہ جانوروں کے قہر سے کسان ایسے بے حال نہ تھے جیسے کہ موجودہ دور میں کئی صوبوں کے کسان آوارہ جانوری کی مچائی تباہی پر گریہ وزاری کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں نیل کے جھنڈ بھی تباہی مچاتے ہیں۔ سرکاروں سے اس سلسلے میں اقدام کرنے کے لیے گوہار بھی لگائی جاتی ہے۔ کئی عرصے سال سے یہاں نیل کے شکار پر پابندی ہے ایسے ہی جیسے گوونش کے ذبیحہ رالبتہ عربی ناموں سے کاروبار چلانے والے غیر مسلموں پر ایسی سخت پابندی نہیں۔ وہ حلالی کا اسٹیکر لگا کر مسلم ممالک میں اپنا پروڈکٹ بیچتے ہیں اور کڑوروں کی کمائی کرتے ہیں۔ زرمبادلہ سے ملک کی معیشت اور مالی حالت میں بہت حد تک بہتری



آتی ہے اب تو کھال اور ہڈیوں تک کے کاروبار میں بھی انہیں کی اجارہ داری بتائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں جس زمانے کی گفتگو چل رہی ہے، وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا اور حضرت سید شاہ ولایت حسینؒ کا زمانہ تو اس سے بھی بہت پہلے کا تھا۔

گاؤں کی صد سالہ ضعیفہ حیاتن نانی ان کے بارے میں اپنی زبان سے جو کچھ بیان کرتی وہ دراصل قواعد کی رو سے زبان کی بجائے علاقائی بولی ہوتی تھی اور بجکا کہلاتی تھی۔ اور آج بھی یہی کہلاتی ہے۔ سمجھنے والے سمجھ بھی لیتے ہیں لیکن موجودہ نسل کے لوگ جنہوں نے پڑھائی لکھائی یا نوکری کے شہر میں بود و باش اختیار کرتی وہ بجکا بول نہیں سکتے۔ چنانچہ حیاتن نانی کے بیان کیے ہوئے واقع یا گاؤں کے بزروگوں سے حضرت ولایت حسین کے کرمانی قصے وہ اپنی زبان میں سناتے ہیں تو موجودہ نسل تجسس اور تحیر کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے عقیدت مند آج بھی ہیں حضرت کے مزار شریف پر نذر و نیاز، فاتحہ، درود اور چادر پوشی بھی کرتے ہیں اور عرس کے میلے بھی لگاتے ہیں۔ کسی معتقد نے کچی قبر کو پکے مزار کی شکل دے دی ہے۔ معتقدین میں ڈاکٹر کبیر احمد کے سسرالی رشتے دار ہی کی تعداد زیادہ ہے۔ جن سے ڈاکٹر صاحب کو خدا واسطے کا بیر رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ سب منتوں اور مرادوں والے ہیں۔

سید شاہ ولایت حسینؒ کے آستانے پر منتوں اور مرادوں کا سلسلہ کوئی موجودہ دور کی بات نہیں۔ اسے بھی شاید کرامت ہی قرار دیا جائے جن کی منتیں اور مرادیں پوری ہوتی تھیں۔ وہ چادر پوشی کی بجائے قبر پر مٹی ڈال دیتے تھے، اس لیے حضرت کی قبر برابر نمایاں رہی۔ کچھ قبر عین اس اسی جگہ پر تھی جس جگہ قبر کھدوا کر چلہ کشی کے لیے دفن ہو گئے تھے لیکن انتالیسویں دن جو خلل واقع ہوا تو پھر انہوں نے حجرہ بنوا کر اس میں چلہ کشی کی اور اپنی مراد کو پہنچے۔ اس کے بعد افزائش نسل کی شروعات ہوئی۔ البتہ ملکیت گئی تو گئی۔ اس کی انہیں قطعی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کے گھر آنگن میں کلکاریاں گونج اٹھی تھیں۔ عملیات کی مشقت کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ اپنے ہوش و حواس اور بھرے پورے گھر میں پکی عمر کو پہنچ کر انہوں نے زندگی کی آخری سانس لی۔ ان کی وصیت کے مطابق وہیں پر انہیں دفن کیا گیا جہاں پر چلہ کشی کے لیے وہ مدفون ہوئے تھے۔ ان کی بزرگی اور کشف و کرامات کے نیز دور دور تک چرچے تھے۔ ان کے جد امجد حضرت سید شاہ فیروز علی عرف ترک شاہ بھی اپنے کشف روحانی کی وجہ سے معروف زمانہ تھے۔ اس گاؤں میں وہی اس خانوادے کے بانی تھے اور گاؤں کا نام بھی انہیں سے منسوب و موسوم تھا۔ ان کی اولادوں میں حضرت سید شاہ ولایت حسین سے پہلے بھی کئی بزرگ گزرے تھے اور یہ سلسلہ سید شاہ فیروز علی سے اورنگ زیب کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ گزارے کے لیے جاگیر عطا کی گئی تھی۔ یہی سید شاہ ولایت حسین کی ملکیت تھی لیکن جب ان کی شخصیت کشف روحانی سے آراستہ ہوئی تو ملکیت جاتی رہی اور اسی کے ساتھ یہ خانوادہ معاشی اعتبار سے زوال آمادہ ہوتا گیا۔ انگریز حاکموں نے ملکیت تو نیلام کر دی تھی لیکن شکاری کے ضمن میں اتنی جائداد چھوڑ دی تھی سچ سے حضرت کے بیٹوں سید شاہ نعیم اللہ اور سید شاہ ولی اللہ کے کنبے کا گذارا وہ جاتا تھا۔ لیکن

پوتے سیس چاہ مقبول احمد کو نوکری کرنی پڑی۔ وہ کسی سرکاری اسکول کے ٹیچر ہوئے اور اپنی مختصر سی تنخواہ سے اوپر کا خرچ پورا کرتے رہے۔ زمین جائداد تو ابھی بھی اتنی تھی جس سے کنبے کی کفالت ہو جاتی تھی اور تنخواہ سے خانہ داری کے بالائی مصارف میں پٹوا، پنچی اور کامدار جوتیاں تک آجاتی تھیں لیکن ناگہانی طور پر ایک فوجداری مقدمے کا بوجھ سر پر آ گیا۔ یہ مقدمہ لمبا کھینچ گیا جس کی وجہ سے انہیں ملازمت کے مستعفی ہونا پڑا۔ یہیں سے زمین جائداد فروخت ہونا شروع ہوئی اور خانوادے میں مفلسی اور مفلوک الحال گھر کر لیا۔ پھر مقدر کی بات وہ سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ سرتان جگر کا تھا۔ معاشی بحران کی وجہ سے معقول علاج بھی نہ ہو سکا۔ اس دوران میں انہوں نے ایک بیٹی کی شادی کر لی اور بڑے بیٹے حنان نے میٹرک پاس کر لیا۔ ان کے علاوہ ایک بیٹی اور تین بیٹے اور تھے جو کم سن یا بچے تھے۔ ان کی فکر بھی بیماری کے ساتھ لاحق تھی۔ امید زیست تو بالکل ہی نہیں تھی پھر بھی تسلی کے لیے علاج شروع کرایا گیا تو ڈاکٹر کبیر احمد ہی سے۔ روپے پیسے تو تھے نہیں علاج ادھار کھاتے میں چلتا رہا۔ پھر مریض کو لب گور دیکھ انہیں ڈاکٹر صاحب پٹنہ لے گئے۔ ساتھ میں عبدالحنان بھی تھے۔ تسلی کے لیے جانچ پڑتال دوا علاج جو کچھ بھی ہوا، وہ ڈاکٹر صاحب ہی کرتے رہے۔ پٹنہ کے معالج نے مشورہ دیا کہ علاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک سانس چل رہی ہے، جو کچھ سکون ملے گا گھر ہی میں ملے گا گاؤں کی ٹھیٹھ زبان میں بتایا گیا کہ پٹنہ کے ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا۔ مقبول احمد نے چند روز اور تکلیف میں گذارنے کے بعد آخری سانس لی۔ گھر گھرانے کے عالوہ پڑوسیوں کے آنگن بھی ماتم گدہ بن گئے۔ سے کو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر ترس آتا لیکن کوئی کر بھی کیا سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا تو ایک طرح سے احسان ہی تھا کہ ادھاری کھاتے میں خود بھی علاج کیا اور علاج ہی کے لیے پٹنہ لے گئے لیکن موت جس کا مقدر بن چکی تھی اسے زندگی کی سند کون دے سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے تو قل تک صبر سے کام لیا لیکن چہلم سے پہلے دسویں، بیسویں تک بھی صبر نہ کر سکے ان کی تسلی کے لیے مقبول احمد کی بیوہ نے کہلا بھیجا کہ ''چہلم تک صبر کریں۔ زمین کہیں رہن رکھ کر مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے گی۔'' ڈاکٹر نے جواباً کہلا بھیجا کہ ''پھر ادھر ادھر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے خود میں ہی تیار ہوں۔'' چنانچہ پانچ کٹھے کا ایک ٹکڑا بطور رہن انہیں کو دے دیا گیا۔

زمین کا یہ ٹکڑا ان کے سسرالی مکان کے سامنے تھا لیکن اس مکان اور اس زمین کے درمیان ایک قطعہ زمین کسی غیر مسلم کا تھا جسے قیمتاً حاصل کرنے میں ڈاکٹر کامیاب ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ سسرالی مکان میں تھے اور اب اپنا گھر بنانا چاہتے تھے۔ اور بالآخر انہیں کامیابی ملی۔ لیکن ایک ٹیڑھا مسئلہ یہ تھا کہ جس طرف سے گھر کا راستہ نکل سکتا تھا اس طرف تو سید شاہ ولایت حسینؒ کا نجی قبرستان تھا۔ اسی سے ملحق اور ان کے صحن سے متصل پانچ کٹھے کا وہ پلاٹ تھا جو عبدالحنان کی والدہ نے گروی کے طور پر انہیں دے دیا تھا۔



ڈاکٹر صاحب نے جدید طرز کا پختہ مکان تعمیر کرایا تھا۔ اس میں پورٹیکو بھی تھا جسے کار پارکنگ کے لیے استعمال ہونا تھا لیکن راستے کے لیے تو یہاں پگڈنڈیوں سے زیادہ گنجائش نہ تھی۔ یہ مسئلہ پیش نظر تھا کہ اسی دوران دور کی سوجھی۔ بھوشن پرساد کو شک کو مکھیا کے انتخاب کامیاب بنانے میں ان کا کردار اہم ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے ووٹ کے علاوہ پڑوسی دلتوں کے ووٹ بھی وہ کوشک جی کو تھوک میں دلواتے اس کے عوض مکھیا جی سے حسب ضروت کام بھی لیتے۔ چنانچہ راستے کے مسئلے پر انہوں نے چھٹی حس سے کام لیا۔ مکھیا جی نے متصل سڑک پر مٹی بھروانے کا کام شروع کروایا تو قبرستان کے پلاٹ سے مٹی کاٹنے کا کام شروع ہوا۔ اور اسی دوران وہ قبریں جو دھنسی ہوئی تھیں اور قبروں کے نشان کا پتہ دیتی تھیں، انہیں مٹی سے بھر کر سطح کر دیا گیا۔ اور وہاں پر بیگن گوبھی اور ٹماٹر کے پودے اگا دیے گئے تھے۔ حضرت سید شاہ ولایت حسینؒ کی قبر ہر چند کہ محفوظ رہی مگر اس کے کنارے کٹ گئے اور دوسری قبروں کے تو نشانات بھی منہدم ہو گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب کی راہ آسان اور ہموار ہو گئی۔ سید شاہ ولایت حسینؒ کی قبر چونکہ اونچی تھی، اور ان سے زائرین کے اعتقادات وابستہ تھے۔ اس لیے اس قبری مٹی کو کٹوا کر مسطح کروا دینا آسان نہیں تھا لیکن ان کا اصل مسئلہ جو راستے کا تھا، ایسے راستے کا جس سے جیپ، کار وغیرہ آسان سے گذر سکے۔

والد کے انتقال کے بعد عبدالحنان شدید طور پر ڈپریشن کے شکار ہو گئے۔ حال ہی میں تو انہوں نے میٹرک پاس کیا تھا۔ نوکری چاکری وہاں کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے بیٹے تھے اپنے چھوٹوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ سامنے تھا۔ کچھ دنوں میں ایک چھوٹی بہن کی شادی بھی کرنی تھی۔ نفسیاتی طور پر وہ اس قدر دباؤ میں تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان کے اضطراب کو بھانپ لیتے تھے۔ انہیں دنوں قبرستان سے متعلق ڈاکٹر اور مکھیا کی کارستانیاں سامنے آئیں۔ چند قبریں پڑوسیوں کی بھی تھیں اور وہ عبدالحنان کے طرف دار بن گئے اور اکسایا کہ وہ ڈاکٹر اور مکھیا دونوں پر مقدمہ کر دیں ان کے آگے عبدالحنان کی بساط ہی کیا تھی۔ لیکن جذبات کے بہاؤ میں آ کر انہوں نے مقدمہ کر دیا۔

قبرستان والا یہ قطعہ اراضی غیر مزروعہ تھا اور شاید اس لیے غیر مزروعہ تھا کہ واضح طور پر یہ مختصر سا قبرستان تھا۔ ویسے طویل و عریض سرکاری قبرستان بھی ذرا فاصلے پر تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے جعلی کاغذ بھی بنوا لیے اور اس زمین کی ملکیت پر اپنا دعویٰ ٹھوک دیا لیکن کورڈ میں یہ جعلی کاغذ نقلی کرنسی کی طرح چل نہیں سکا۔ کورٹ سے معائنہ کار آئے تو موقع پر بھی گواہی گذری۔ گواہوں میں چند ہندو مسلمان پڑوسی بھی تھے۔ انہوں نے بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ اظہار خیال کیا سید شاہ ولایت حسینؒ کی بزرگی کے بارے میں وہ جو سنتے آئے تھے وہ بھی سنایا۔ یہ قطعہ زمین قبرستان میں کیسے تبدیل ہوا۔ یہ بھی بتایا

دوسری قبروں کے نشانات ڈاکٹر اور مکھیا کی ملی بھگت سے کیسے مٹائے گئے۔اس کی بھی تفصیل بیان کی گئی۔

معائنہ کار مسلمان اور حاجی پور کورٹ میں مختار تھے۔سب کچھ سننے کے بعد پوچھا کہ ''کیا کسی مردے کی ہڈی بھی کھدائی میں نکلی؟'' گواہوں نے جواب میں کہا۔''نکلی بھی ہوگی تو ہم میں سے کسی نے دیکھا ہوگا۔مزدور لگے تھے اور دیر رات تک سڑک کی مرمت کا کام چالتا رہتا تھا۔ یہاں کوئی پہریدار تو تھا نہیں جو دیکھتا کہ قبروں سے کیا کیا نکل رہا ہے۔اور کیا کیا دفن وہ رہا ہے۔''

یہ سلسلہ ختم ہوا تو گواہان اور تماش بین اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے لیکن معائنہ کار کو ڈاکٹر اور مکھیا جی نے تھوڑی دیر کے لیے منت سماجت کر کے چائے پانی کے نام پر روک لیا۔اس دوران کچھ راز و نیاز کی بھی باتیں ہوئیں۔معائنہ کار کے سفر کی تکان مٹ چکی تھی۔ان کے چہرے سے بشاشت کے آثار رونما ہو رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب اور مکھیا جی کے ماتھے کی سلوٹیں مٹ چکی تھیں۔

معائنہ کار کی رپورٹ کے بعد کورٹ نے فیصلہ سنانے میں زیادہ دن نہیں لگائے۔لیکن اس فیصلے پر کچھ لوگوں کو حیرت تھی کہ مدعا علیہ اور مدعی دونوں خوش تھے۔انہیں لگتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف نہیں آیا ہے۔دونوں طرف سے جیت کے دعوے ہو رہے تھے۔یہ الگ بات تھی کہ ڈاکٹر صاحب مبارک باد دینے جو ہندو مسلمان آتے، لڈوؤں سے ان کا منھ میٹھا کراتے۔اس کے ساتھ ہی وہ مریضوں کو بھی نظر انداز نہیں کر رہے تھے۔نہیں عبدالحنان کو مبارک باد دینے کوئی نہیں آیا۔کیوں کہ دور چار کے سوا سب تو یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ ہار گئے ہیں۔اس صورت حال میں زخم پر نمک چھڑکنے کون آتا۔

ڈاکٹر صاحب تو بھی زمانہ شناس تھے اور وقت و حالات نے ان کی فہم و فراست کو اور بھی قوت و وسعت بخش دی تھی۔وہ عدالتی رسومات سے واقف تھے یا واقف کر دیے گئے تھے۔انہوں نے تندہی اپنے حق میں فضا سازگار اور راہ ہموار کر لی تھی۔اس لیے انہیں بہت حد تک اطمینان تھا کہ عدالت کا فیصلہ جو بھی آئے، انہیں جیل کی سزا نہیں ہوگی۔اس کے باوجود کبھی کبھی جسم میں سستی پھیل جاتی کہ اگر سزا ہوگئی تو نام و نمود اور عزت و شہرت پر بٹہ لگے گا اور اس کے بعد ان کی چودراہٹ بھی ختم ہو جائے گی۔اس لیے انہیں فیصلے کا شدت سے انتظار تھا۔آخر کار فیصلہ آیا تو سب سے پہلے ان کے وکیل ہی نے مبارک باد دی اور کہا کہ:''آپ بال بال بچ گئے۔مقدمہ خارج ہو گیا۔اسے اپنی بڑی جیت سمجھئے۔''اور ڈاکٹر صاحب کو لاحق وسوسے اور اندیشے سے نجات مل گئی۔مارے خوشی کے ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے تاہم انہوں نے وہیں سے کئی سیر موتی چور کے لڈو خرید لیے۔اور ظفیر کو گاؤں میں خبر رساں کے طور پر دوڑا دیا جو کہیں تیز اور کہیں دھیمی آواز میں اعلان کرتا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کیس جیت گئے۔



عبدالحنان کو ان کے وکیل نے بھی مقدمہ خارج ہونے کی اطلاع دی اور کہا کہ:''ڈاکٹر کو جیل کی سزا ہونی چاہئے تھی لیکن کسی وجہ سے نہیں ہوئی لیکن آپ اپنے اصل مقصد میں کامیاب ہوئے آپ اسے اپنی جیت ہی سمجھئے۔''عبدالحنان کو اس بات کا افسوس ضرور ہوا کہ وہ ڈاکٹر کو جیل کی سزا نہیں دلوا سکے۔لیکن وکیل نے اس پہلو پر زور دیا کہ''کورٹ نے ایک ہی قبر کے نشان کی بنیاد پر اسے قبرستان قرار دیا۔جب کہ مدعا علیہ نے جعلی کاغذات کی بنیاد پر اس پورے پلاٹ کو گھونٹ جانے کی کوشش کی تھی۔''یہی وجہ تھی کہ عبدالحنان بھی اسے اپنی جیت سمجھ رہے تھے، ورنہ عدالت نے مقدمہ خارج کر کے جیت ہار کا سوال ہی سرے سے خارج کر دیا تھا۔لیکن یہ وکیل کی سمجھائی ہوئی زبانی باتیں تھیں۔نقل تو ابھی آئی نہیں تھی جس کا انتظار دونوں فریقوں کو تھا۔

جب فیصلے کی مصدقہ نقل آ گئی تو مسجد سے متصل نیم کے پیڑ کے سائے میں کچھ لوگ بیٹھے، ان میں مولوی شیخ ابوبکر اور محمد کریم کے علاوہ بندہ سنگ اور باسو سنگھ بھی موجود تھے۔دراصل ان سنگھ صاحبان کی مسلمانوں ہی سے خریدی ہوئی وہاں پر زمین تھیں اور کاشتکاری کا سلسلے میں تقریباً ہر روز ہی ان کا وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

بہر حال جب یہ لوگ نیم کے پیڑ کے سائے میں جمع تھے تو عبدالحنان کورٹ کے فیصلے کی نقل لے کر وہاں پر آ گئے اور انہوں نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا کہ''وکیل صاحب نے مجھے اس مقدمے کے سلسلے میں جو نکتہ سمجھایا تھا وہ میں نے آپ لوگوں کو بھی بتا دیا تھا۔لیکن اب جب نقل آ گئی ہے تو اسے بھی سن لیجئے۔اور پھر انہوں نے تلخیص (Extract) کے صفحے سے متعلقہ عبارت پڑھنا شروع کیا۔

"The allegation is regarding digging and desscreting the grave Yard. But the accued are also muslims. Hence it is not Believable that a muslim will do it."

اس انگریزی عبارت کے بعد عبدالحنان نے اس کا خلاصہ اس اسلوب میں پیش کیا:

''قبرستان کے کھودنے اور قبروں کے بے حرمتی کا الزام ملزمین پر لگایا گیا ہے۔لیکن ملزمین بھی مسلمان ہی ہیں اس لیے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مسلمان ایسا کرے گا۔''

پھر مولوی ابوبکر کو مخاطب کر کے عبدالحنان نے کہا۔''چچا اصل نکتہ یہی ہے کہ کورٹ نے اس قطعہ زمین کو Grave Yard یعنی قبرستان مان لیا ہے۔اور مدعا علیہ کو مسلمان ہونے کی وجہ سے بری الذمہ قرار دیا یعنی کوئی مسلمان ایسا کیسے کر سکتا ہے۔''

یہ سن کر مولوی ابوبکر نے بس اتنا اور اس انداز میں اپنا تأثر دیا۔''ہونہہ مسلمان!''

◀◀ ● ▶▶

## ● غزلیں

### منظر اعجاز

انجامِ سفر اب کیا ہوگا، گھر بار، در و دیوار نہیں
رستے ہی میں تھک کر بیٹھ رہیں کوئی پیڑ بھی سایہ دار نہیں

اک سعیِ لا حاصل کے سوا منزل کی تمنّا کیا ہوگی
جب ذوقِ سفر بیدار نہیں، جب پاؤں جنوں رفتار نہیں

اب کوئی خلش کب ہوتی ہے، ہر چند تجلّی بکھری ہو
دل درد کی لذّت بھول گیا، اک تیرِ جگر کے پار نہیں

الزام کسی پر کیا ڈالیں، ہے کون پرایا شخص یہاں
جو دوست ہیں، وہ سب سامنے ہیں، دشمن بھی پسِ دیوار نہیں

آخر وہ خروشِ مستی کیا، جب دل کی بستی سونی ہو
آخر وہ جنوں کا عالم کیا، جب رقصِ سرِ بازار نہیں

معنی کا گدازِ جسم نہیں لفظوں کی قبائے زرّیں میں
وہ برّشِ تیغِ تیز نہیں، وہ پھولوں کی مہکار نہیں

منظرؔ وہ غزل کا رنگ کہاں، وہ جذبوں کا آہنگ کہاں
شعروں میں کہاں وہ کیف و اثر جب دل ہی عشق آزار نہیں

◂◂ ● ▸▸



### منظر اعجاز

فصیلِ شب پہ کہیں آفتاب کا منظر
نہ جانے کیسا ہے، آخر یہ خواب کا منظر

اسی سے پوچھئے خوشبو کا ذائقہ کیا ہے
سلگتے دیکھا ہو جس نے گلاب کا منظر

بھڑک اُٹھی ہے ابھی پیاس روح کی یکلخت
نظر نے کھینچا ہے تصویرِ آب کا منظر

نفس نفس میں ہے اک سوز لا انا کی گونج
نظر نظر میں ہے اک اضطراب کا منظر

کہیں ہے آب کے دھوکے میں زندگی کا شعور
کہیں وجود کا صحرا، سراب کا منظر

کہیں سزا تو نہیں یہ بھی بے گناہی کی
نظر جو جھیل رہی ہے عذاب کا منظر

خیامِ فکر میں سہمے ہوئے خیال کی رُت
بکھرتی ٹوٹتی سانسیں، طناب کا منظر

نظر کی لو کو بڑھاتے ہیں والیانِ نظر
عجب ہے منظرِ روشن کتاب کا منظرؔ

◂◂ ● ▸▸

رقمِ قصہ لہو کا جو مرے قرطاسِ جاں پر ہے
اسی کا شائبہ شاید جبینِ کہکشاں پر ہے
دلِ یزداں دھڑکتا ہے مرے انفاس کی لے سے
زمیں پر میں ہوں لیکن گونج میری آسماں پر ہے
حقیقت کو جو افسانہ سمجھتے ہیں، وہ کیا جانیں
یقیں کا سوز بھی روشن کہیں حرفِ گماں پر ہے
سناؤں بھی کسے شوقِ سفر کی داستاں اے دل
کہ طاری اور ہی کچھ کیفیت اہلِ جہاں پر ہے
جزیرے ڈوبتے جاتے ہیں جن میں خواب بستے تھے
ابھی بھی مستقل میری نظر سیلِ رواں پر ہے
ابھی موجیں بھی برہم ہیں مری کشتی کے تیور سے
نظر بادِ مخالف کی مرے ہی بادباں پر ہے
میں شبنم کی طرح اُڑنے لگا ہوں دامنِ گل سے
مگر حرفِ مکرّر کون اس لوحِ جہاں پر ہے
تکلف بر طرف، اے صاحبانِ دانش و بینش
جو میرے دل پہ گزری ہے، وہی میری زباں پر ہے
چکانا ہی پڑے گا زندگی کا مول اے منظر
کہ اب بھی قرض پچھلے موسموں کا جسم و جاں پر ہے

◂◂ ● ▸▸

# منظر اعجاز

ترے خیال کو چھو کر مہک اٹھا ہوں میں
تو کوئی پھول ہو جیسے کوئی ہوا ہوں میں

میں اپنے جسم کے گنبد سے گونج اٹھتا ہوں
جو تیرے دل سے اٹھی ہوک وہ صدا ہوں میں

ترے خیال کے سانچے میں ڈھل کے نکلا ہوں
ترے ہی خواب کا موہوم سلسلہ ہوں میں

ہے میرے ذوقِ طلب میں ترے جمال کا رنگ
تو میرا چہرا ہے اور تیرا آئینہ ہوں میں

مرا وجود کہ ہے سیلِ بیکراں کی طرح
یہ اور بات کہ منظر حباب سا ہوں میں

◂◂ ● ▸▸

جب کسمسائی سانسوں میں خوشبو حیات کی
رکھ کر زبان کانٹوں پہ پھولوں سے بات کی
شاخوں پہ تُل کے جوہرِ پندار کی طرح
شبنم نچوڑ لیتی ہے لذّت حیات کی
سر میں سما رہا ہے نئی آگہی کا درد
پھر پھیلنے لگی ہیں حدیں ممکنات کی
شیرازہ پھر بکھرنے لگا ہے وجود کا
پھر ٹوٹنے لگی ہیں رگیں کائنات کی
دن میں مجھے بھٹکنے سے اس نے بچا لیا
وہ رہ گئی ادھوری کہانی جو رات کی
دشمن ہو یا کہ دوست مجھے اس سے کیا غرض
چھپ چھپ کے مجھ سے میرے ہی سائے نے گھات کی
سینے میں جیسے آگ لگا دی ہو پیاس نے
ساحل پہ سر پٹکتی ہیں موجیں فرات کی
منظرؔ طلوعِ صبح کا آنکھوں میں پھر گیا
شب کتنی خوشگوار تھی عرفانِ ذات کی!

◂◂ ● ▸▸



# منظر اعجاز

حقیقت سے بہت اکتا چکا ہوں
میں پھر خوابوں کی دنیا چاہتا ہوں

مرے اندر ہے نغموں کا تلاطم
مجھے چھیڑو میں سازِ بے صدا ہوں

کسے میں جانتا، پہچانتا ہوں
ابھی تو خود سے سے بھی ناآشنا ہوں

دعا کس کی ہوں، کس کا مدعا ہوں
میں اپنی ذات کی ٹوٹی صدا ہوں

میں شہرِ سنگ میں شیشہ گری تک
عروجِ عکسِ آئینہ رہا ہوں

بنائے امتیازِ لا و الا
جوازِ کلیّاتِ ارتقا ہوں

میں خالق ہوں جہانِ فکر و فن کا
مگر منظر ابھی تک نار سا ہوں

◂◂ ● ▸▸

اجنبیت کا بوجھ ڈھو جاؤں
تیری بیگانگی کو رو جاؤں

اپنی پلکوں پہ اشک کے موتی
آئینہ دیکھ کے پرو جاؤں

جب بھی میں خود کو ڈھونڈنے نکلوں
جاکے تیری گلی میں کھو جاؤں

کھو کے اپنے وجود کا احساس
تیری سانسوں میں جذب ہو جاؤں

اپنے دل میں چھپا کے رکھ لے مجھے
گم اندھیروں میں، میں نہ ہو جاؤں

◂◂ ● ▸▸

● ڈاکٹر رمیشا قمر

# بات کر کے دیکھتے ہیں

ڈاکٹر رمیشا قمر - سید محمد اشرف

سید محمد اشرف معاصر فکشن کا معتبر و مستند نام ہے۔ انکم ٹیکس جیسے مصروف اور میکانکی محکمے میں رہ کر بھی ادب کے دامن کو مضبوطی سے تھامے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے اپنے تخلیقی کام میں منہمک ہیں۔۔ سید محمد اشرف نے اردو فکشن کے سرمایے میں گراں قدر اضافے کیے۔ انھوں نے افسانوی اصناف میں بہترین تخلیقات پیش کیں اور اردو فکشن کے صف اول کے فن کاروں میں اہم نام بن گئے۔

سید محمد اشرف کی تخلیقات ان کے عمیق مطالعے ان کی معاشرتی، اقتصادی، مذہبی و تہذیبی موضوعات و معاملات پر مضبوط گرفت اور فنی بالغ نظری اور ذہنی بالیدگی کی دین ہیں۔ ایک مخصوص قسم کی تہذیب و تمدن اور لسانی و ثقافتی موضوعات کو پر کشش اور پر اثر انداز میں رقم کرنا اشرف کے قلم کا کمال ہے۔ تو چلتے ہیں ناظرین اس باکمال فن کار سے روبرو ہوتے ہیں اور "بات کر کے دیکھتے ہیں"۔

(۱) رمیشا قمر: اشرف صاحب! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ ابتدائی زمانے سے ہی ہر مسلکِ ادب کے لوگوں کے منظورِ نظر ہو گئے۔ اس چوطرفہ پسندیدگی، ہر دل عزیزی اور ہر طرح کے ادبی گروپ میں آپ کی ایکسپٹیبلٹی اور مقبولیت کا سبب واقعی آپ کی خوش قسمتی ہے یا اس میں آپ کی پر کشش شخصیت اور آپ کی بے پناہ فن کارانہ صلاحیتوں کا بھی عمل دخل ہے۔

اشرف: میرے پاس وقت میں اتنی فراغت کبھی نہیں رہی کہ میں کسی اَدبی گروپ یا تحریک سے وابستہ ہو کر ادبی سیاست کروں۔ طبیعتاً بھی میں اس قبیل کا نہیں ہوں۔ اس کے باوجود (یا باوصف) اگر قارئین سے اس قدر محبت ملی تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ رہی بات پر کشش شخصیت اور فن کارانہ صلاحیتوں کی تو اسے اپنا حسنِ ظن سمجھئے۔ من آنم کہ من دانم۔

(۲) رمیشا قمر: محبتیں بانٹنے والوں کو ہی محبتیں ملتی ہیں پھر تو آپ واقعی خوش نصیب ہیں۔ اشرف صاحب آپ کی ابتدائی زندگی کے متعلق چند باتیں جاننا چاہوں گی مثلاً کہ آپ کے لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی؟ آپ کی ادبی تربیت میں کن لوگوں کا حصہ رہا؟ کن کتابوں اور کن مصنفوں نے متاثر کیا؟



اشرف: بچپن میں خانقاہ کے عرسِ نوری میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ میرا دِل بھی چاہتا تھا کہ میں بھی پڑھوں۔ میری والدہ مجھے منقبت یا غزل لکھ کر دے دیتی تھیں۔ بس وہیں سے ابتدا ہوئی۔ خانقاہ کے کتب خانے میں بے شمار کتابیں تھیں/ ہیں۔ کچھ رسائل بھی پابندی سے آتے تھے۔ کچھ رسائل بڑوں کی نظر سے چھپا کر کرائے پر لیے جاتے تھے، جیسے 'طلسمی دنیا'، 'جاسوسی دنیا' وغیرہ۔ کچھ رسائل والدین منگا کر دیتے تھے جیسے 'کھلونا' اور 'نور' وغیرہ۔ دھیرے دھیرے طبیعت کا رُجحان نثر کی طرف ہوتا گیا۔ میرے دادا حضرت آوارہ بہت معروف اِنشاء پرداز تھے۔ ان کی لکھی ہوئی تحریریں اور بولی ہوئی تقریریں ریڈیو پر سُن کر یہ شوق اور آگے بڑھا۔ قصبے کا باشندہ تھا اور قصبات میں کہانیاں آس پاس بکھری ہوئی نظر آ جاتی ہیں کیوں کہ اَفراد سے تعلق نزدیک کا ہوتا ہے۔ پھر تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے اور قاضی عبدالستار کی شفقتوں کے سائے میں لمبا عرصہ گزرا۔ علی گڑھ آنے سے قبل، ۱۹۷۲ء سے پہلے انہیں پڑھ چکے تھے۔ قاضی صاحب جتنے بڑے ادیب تھے اُتنے ہی بڑے تربیت کار بھی تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ لکھنے کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ پتا ہونا چاہیے کہ کہانی میں کیا نہیں لکھنا ہے۔ یہ بات میں نے گانٹھ میں باندھ لی۔ دوسری بات جس پر بہت عمل کیا وہ یہ تھی کہ کہانی لکھنے کے بعد بہت دِن تک پال میں لگا کر رکھ دینا چاہیے۔ جب چھے (۶) مہینے کے بعد بھی وہ کہانی اچھی لگتی رہے تب چھپنے کے لیے اِرسال کرنی چاہیے۔ قاضی صاحب سے یہ بھی سیکھا کہ متاثر تو ہونا چاہئے لیکن کسی کے قلم سے مرعُوب نہیں ہونا چاہئے اور متاثر ہونے کا مطلب بھی یہ نہیں کہ آپ اُسی کے رنگ میں لکھنے لگیں۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ ہر لکھنے والا اپنی راہ کا تنہا مُسافر ہوتا ہے۔ تو لکھنے پڑھنے کے کام کو عبادت جیسا تو سمجھا لیکن کبھی باجماعت نہیں کیا۔

مجھے جن اَدیبوں نے متاثر کیا اُن میں قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، غلام عباس اور ضمیر الدین احمد تھے۔ بچپن اور لڑکپن میں رفیق حسین کی کہانیوں نے بھی بہت متاثر کیا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ یہ بات واضح ہوتی گئی کہ رفیق حسین کے افسانوں میں جانور آخر تک جانور ہی رہتے ہیں۔ میں اس سے آگے کی کوئی بات چاہتا تھا۔

عصمت چغتائی اور بیدی کے یہاں علی الترتیب زبان کی بے تکلفی اور نثر کے نا ملائم انداز سے معنی آفرینی نے متاثر کیا لیکن ہر کہانی میں نہیں۔ مجھے اشفاق حسین کی کہانی 'گڈریا' نے خوب متاثر کیا۔ عزیز احمد کی بہت سی تحریروں نے متاثر کیا۔ مجھے اپنے دادا حضرت آوارہ کی تحریروں نے بہت متاثر کیا۔

معاصرین میں نیر مسعود، ذکیہ مشہدی، خالد جاوید اور صدیق عالم نے متاثر کیا۔ مجھے اِبنِ صفی بھی اپنی شفاف نثر اور روانی کے باوصف بہت پسند آتے ہیں۔ آج سے کئی دہوں پہلے جب سنجیدہ ادیبوں میں اِبنِ صفی کا نام لینا معیوب سمجھا جاتا تھا تب میں نے ''ذہن جدید'' کے سروے میں اپنا بیان دیا تھا کہ میں اردو کے دس عمدہ ناولوں میں اِبنِ صفی کا ناوِل ''شاہی نقارہ'' بھی شامل سمجھتا ہوں۔ کچھ ادیبوں نے اس پر لے دے بھی کی لیکن بقیہ نے اِس بات کو سراہا بھی۔

ہر عمر میں انسان کے مزاج کی کیفیت اور اِنجزاب کی قوت مختلف ہوتی ہے۔ اسی کے بقدر تأثر بھی مختلف ہوتا ہے۔ مجھے اچھی تحریروں سے متأثر ہونا اچھا لگتا ہے اور میں نے جب جب کوئی چیز پسند کی، بَا نگِ دَہل اُس کا اعلان کیا، اسعد محمد خاں کی ایک کہانی ہے ''ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اِسٹوری'' میں اُسے عمر کے مختلف مراحل میں پانچ مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ مجھے وہ آج بھی ہانٹ کرتی ہے۔ ہاتھ لگ جائے تو پڑھے بغیر نہیں مانتا۔

'آگ کا دریا'، 'گردشِ رنگِ چمن'، 'ہاؤسنگ سوسائٹی'، 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'، 'شب گزیدہ'، 'فجو بھیا'، 'بادَل' مجھے بہت پسند ہیں۔ نیر مسعود کی 'طاؤس چمن کی مینا'' بھی بہت پسند ہے۔ قاضی صاحب کا ناول ''خالد بن ولید'' بھی بہت پسند ہے۔ البتہ لکھتے وقت دِھیان رَکھتا ہوں کہ میری تحریر پر میری پسندیدہ کتاب یا مصنف کی پَرچھائیں نہ پڑے کہ ہر لکھنے والا اَپنے راستے کا تنہا مُسافِر ہوتا ہے- میں نے اَگر کبھی محسوس بھی کر لیا کہ میری کسی کہانی میں کسی مصنف کے اَنداز کی رَمَق بھی شامل ہوگئی تو میں اُس کہانی کو اُسی مصنف کے نام منسوب کر کے تقریباً دست بردار ہو جاتا ہوں۔ ایسی کچھ کہانیاں میرے مجموعوں میں شامل ہیں۔

(۳) ریشما قمر: بچپن کی باتیں اور یادیں زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں آپ کے علمی اور قلمی سفر کے ابتدائی سفر کے متعلق جان کر اچھا لگا۔۔ اشرف صاحب ہر انسان زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں مہارت اور قابلیت رکھتا ہے اس حوالے سے اپنی صلاحیتوں کی تلاش کیسے ہوئی؟

اشرف: مجھے ابتدا سے ہی یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کہانیاں حاوِی ہو جاتی ہیں۔ میری پھوپھی مرحومہ بچپن میں کوئی کہانی سناتی تھیں تو میں رو رو کر اُس کے اَنجام تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اُن کو سونے نہیں دیتا تھا۔ لڑکپن میں مجھے اَندازہ ہو گیا کہ میں ماجرا بیان کر لیتا ہوں اور اِس طرح بیان کر لیتا ہوں کہ وہ دوسروں کو اپنا ماجرا لگنے لگتا ہے، اَٹھارہ برس کی عمر میں ''ڈار سے بچھڑے'' لکھی جسے بے شمار لوگوں نے پسند کیا۔ اس سے پہلے ''چکر'' لکھ چکا تھا۔ اِن دونوں کہانیوں کو لکھنے کے بعد اندازہ



ہوا کہ شعر گوئی تفریحاً کروں گا لیکن کہانی لکھنے میں عبادت جیسی محویت سے کام لوں گا۔

(۴) ریشا قمر: بہت خوب!! آپ کے فکشن کی تعریف و توصیف تو ہوتی ہی ہے آپ کی زبان کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو فکشن کی زبان پر بات بہت کم کرتے ہیں اور جن کے نزدیک زبان کی بہت زیادہ اہمیت بھی نہیں وہ بھی آپ کی زبان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ پاتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی روشنی ڈالیے کہ وہ کیا بات ہے جو آپ کی زبان میں لوگوں کو نظر آتی ہے اور دوسروں کی زبان میں دکھائی نہیں دیتی؟

اشرف: کہانی میں نثر کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کہانی میں ہمارا پہلا سابقہ جس چیز سے پڑتا ہے وہ نثر ہی ہوتی ہے۔ میں نثر لکھنے کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا بس میرا دِل چاہتا کہ میرے جملے، میرے الفاظ- کہانی سے باہر کے نہ محسوس ہوں۔ میرے کِردار کوئی ایسی زَبان نہ بولیں جِس سے وہ واقف ہی نہیں ہیں۔ مثلاً معمولی بستیوں سے وابستہ افراد مقفّیٰ مسجّیٰ زبان نہیں بول سکتے۔ تو کہانی میں وہ وَہی زبان بولیں جو وہ بول سکتے ہیں۔ یہ تو کرداروں کی بات ہوئی۔ جہاں تک ماجرے کا تعلق ہے ماجرا اس زبان میں اترنا چاہیے جیسا وہ میرے دِل پر اترا ہے۔ ایک اور چیز جس کا خیال رکھتا ہوں وہ یہ کہ جملے اور الفاظ روزمرہ کے قریب ہوں۔ مجھے لکھتے لکھتے پچاس برس ہو رہے ہیں۔ اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہے کہ خوشبو کا بیان کِن لفظوں میں کیا جانا چاہیے اور رَنگوں کا تذکرہ کرنے میں کس قسم کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ لمس کو کیسے بیان کیا جائے اور منظر کو کیسے دِکھا دیا جائے۔ میں دیہی زبان تو روانی سے لکھ لیتا ہوں لیکن میں پھوہڑ زبان لکھنے میں خود کو عاجز سمجھتا ہوں۔ جہاں پھوہڑ اور بے تکی، اہمال زدہ زبان لکھنا شروع ہوئی، میں وہیں کہانی بند کر دیتا ہوں اور یا تو اس کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں یا ایّامِ جاہلیت کی یادگار کے طور پر اُسے اُلماری کے نچلے خانے میں رَکھ کر فراموش کر دیتا ہوں۔ اب اس سے زیادہ کچھ لکھا تو تعلّی کا الزام لگنے لگے گا۔ ویسے آپ نے انٹرویو میں سوال نامہ ہی ایسا ترتیب دیا ہے کہ اس کے جوابات میں لامحالہ تعلّی کا انداز آ سکتا ہے۔ تعلّی اردو ادب میں صرف شاعری میں رَوا رکھی گئی ہے۔

(۵) ریشما قمر: بالکل درست فرمایا آپ نے کوئی بھی فن ہو وہ ریاضت چاہتا ہے اس میں پختگی اور نکھار تب ہی آتا ہے جب آپ اپنا ۱۰۰ فیصد دیتے ہیں اور یہی آپ کی کامیابی کا راز ہے۔۔ اشرف صاحب آپ نے افسانے بھی عمدہ لکھے ہیں اور ناول بھی اچھے قلم بند کیے ہیں۔ دونوں میں زیادہ کمفرٹیبل آپ نے خود کو کہاں زیادہ محسوس کیا۔ اسباب پر بھی کچھ روشنی ڈالیں تو آپ کو سمجھنے میں

آپ کے فین کو زیادہ آسانی ہوسکتی ہے۔

اشرف: افسانے اور ناول میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجھے ناول لکھنے میں کم اسٹریس (Stress) ہوتا ہے۔ کہانی بلا کا ارتکاز طلب کرتی ہے۔ ناول میں اگر آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو آپ کسی نہ کسی صورت اگلے باب میں اُس کی نفی کر سکتے ہیں یا بھر پائی کر سکتے ہیں۔ افسانے میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ناول میں موضوع کی وسعت لکھنے والے کو پریشان کرتی ہے لیکن وہ پریشانی ارتکاز کی پریشانی سے کم ہوتی ہے۔ ناول کے واقعات، حتیٰ کہ انجام بھی لکھنے کے عمل کے دوران تبدیل ہوتا جاتا ہے یا کیا جا سکتا ہے۔ افسانے میں عموماً یہ ممکن نہیں ہوتا۔

(۶) ریشما قمر: بہت خوب!! ویسے تو مجھے آپ کی زیادہ تر کہانیاں پسند ہیں مگر ڈار سے بچھڑے، آدمی، روگ اور بادِ صبا کا انتظار زیادہ اچھی لگتی ہیں، آپ کو ان میں سب سے زیادہ اچھی کون سی لگتی ہے اور کیوں؟

اشرف: اس سوال کا جواب دینا ناممکن ہے۔ کہانی میں تبھی شائع کراتا ہوں جب وہ مجھے بہت پسند ہوتی ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے بہت پسند ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر میں پچھلے جوابات میں بتا چکا ہوں کہ جو پسند نہیں آتیں اُن کا کیا حشر کرتا ہوں۔ 'آخری بن باس' اور 'لکڑ بگھا سیریز' کی کہانیاں مجھے پڑھنے میں اُلجھن لگتی ہے۔ ایک کہانی ''منظر'' ہے وہ جب بھی سامنے آتی ہے میں اُسے پڑھ لیتا ہوں۔ میرا دِل کہتا ہے کہ مجھے اس کا سیکوَل لکھنا چاہیے۔ اَفسانے اولاد کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔ کسی بچے کی کوئی اَدا اچھی لگتی ہے، دوسرے بچے کی کوئی اور اَدا۔ اصل محبت سب سے یکساں ہوتی ہے۔

لکڑ بگھا سیریز کی تینوں کہانیوں میں افراد کی مختلف کمینگیوں کا احوال ہے۔ کوئی بات براہِ راست نہیں ہے۔ سارا تماشہ انسان اور درندے کے درمیان کا قصہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر افسانے کے انسان میں ایک درندہ چھُپا بیٹھا ہے۔

(۷) ریشما قمر: ہماری موجودہ زندگی کو موضوع بنانے کے لیے ناول کی صنف مناسب اور موزوں ہے کیونکہ افسانے میں زندگی کے کسی ایک حصے کو پیش کیا جا سکتا ہے اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

اشرف: تائید کرتا ہوں۔ لیکن کسی بھی دور کی زندگی کو موضوع بنا کر اُسے بھرپور انداز میں پیش کرنا شرط ہے۔ یہ سچ ہے کہ افسانہ زندگی کے کسی ایک رُخ کو پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک رُخ کتنی تابنا کی اور اِرتکازِ فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اصل چیز وہ ہے۔ ناول ہو یا افسانہ۔ آپ صرف اس کی ہیئتی آسانیوں یا حدود کی بنیاد پر اس کی کوالٹی کا اعلان نہیں کر سکتے۔ اصل بات تو اُس متن میں



ہے جو موضوع اور کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کرتا ہے۔ مثلاً میری نگاہ میں کرشن چندر کا ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' اور ان کے افسانے ''آدھے گھنٹے کا خدا'' میں اگر مجھے فیصلہ کرنا ہو تو میں ان کے افسانے ''آدھے گھنٹے کا خدا'' کے حق میں فیصلہ کروں گا۔ عصمت چغتائی کے ناول 'ضدی' کے مقابلے میں افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' زیادہ بہتر ہے۔ اپنی اِن ترجیحات کے باوجود میں اِس بات کی تائید کرتا ہوں کہ ناول زندگی کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور اس کا سبب اس کی پھیلی ہوئی ہیئت ہے۔

(۸) ریشما قمر: بالکل صحیح!! اشرف صاحب آپ کے عصر میں محبت کے موضوع سے بچنے یا اسے اپنی کہانی کا موضوع نہ بنانے کا رجحان عام رہا، مگر آپ نے محبت پر کہانیاں لکھیں بلکہ اپنے ناولوں میں بھی اسے اچھی خاصی جگہ دی تو آپ نے ایسا کیوں کیا۔ خود کو دنیا سے الگ دکھائی دینے اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی فطرت اس کا سبب ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟

اشرف: مجھے محبت کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ اس موضوع میں دنیا کے بہت سے موضوع سمٹ آتے ہیں، حتیٰ کہ ہَوس بھی۔ دوسرے لوگ اگر محبت کی کہانیاں نہیں لکھتے تو یہ ان کا مسئلہ یا ان کی ترجیح ہے۔ فی زمانہ فحش کہانیاں اس زعم میں لکھی جا رہی ہیں گویا محبت کی کہانی لکھنے کا حق ادا کیا جا رہا ہو۔ ان کا تفصیلی ذکر اِس انٹرویو کے معیار کے خلاف ہے۔

(۹) ریشما قمر: محبت آفاقی جذبہ ہے نسلِ انسانی کی ضامن ہے محبت حیات کا مرکز و محور ہے اور اس جذبے پر زندگی کا دارومدار ہے۔۔ اشرف صاحب آپ جس محکمے میں برسوں رہے ہیں وہاں تو لکھنے کے لیے بہت سارا مواد تھا، کیا آپ نے اپنی تخلیقی روش میں اپنے اس ماحول سے کوئی فائدہ اٹھایا؟ اگر ہاں تو آپ نے اپنے ماحول کو ایک فن کار کی نظر سے کس طرح دیکھا؟

اشرف: ''نمبردار کا نیلا'' میں انکم ٹیکس کا کچھ ذِکر ہے۔ ورنہ عموماً میں نے اپنی ملازمت کو اپنے فن سے دور ہی دور رکھا ہے۔

(۱۰) ریشما قمر: کیا ادب کا مقصد لطف و انبساط کی فراہمی ہے یا ادراک و شعور کی رہنمائی بھی؟

اشرف: یہ ادب کا بہت پرانا سوال ہے۔ لیکن ضروری سوال ہے۔ نرا لطف و انبساط ادب کو مرزا شوق کی مثنوی بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر فن پارے میں مسرت و انبساط بالکل نہیں ہے تو قاری اسے پڑھ کیسے پائے گا۔ فن پارہ پڑھنے کے بعد ہی تو وہ بصیرت تک پہنچ پائے گا۔ نری انشا اور نرا فلسفہ پڑھنا ہو تو قاری کسی اِنشا پرداز کی کتاب پڑھے گا اور فلسفے کے لیے سقراط، اَرسطو، افلاطون اور ابنِ عربی سے

رابطہ کرے گا۔ کسی فن پارے میں مسرت اور بصیرت خطِ توام کی طرح ہوتے ہیں۔ لطف جب آتا ہے جب مسرت سے بصیرت کی خوشبو محسوس ہو اور بصیرت میں مسرت کا رَنگ نظر آئے۔ یہ جملہ کچھ کچھ ہمارے بزرگ نقاد پروفیسر آل احمد سرور جیسا ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

(۱۱) ریشا قمر: اشرف صاحب آپ کی نثری تخلیقات تو انفرادیت کی حامل ہوتی ہیں؟ مگر کیا کبھی آپ نے شاعری بھی کی ہے؟

اشرف: میں نے بہت شاعری کی ہے۔ نظم، آزاد نظم، غزل، تقدیسی شاعری وغیرہ۔ لیکن شاعری کو رسائل میں نہیں شائع کراتا۔ ''صلّو علیہ وآلہٖ'' میرے مجموعے کا نام ہے جس میں نعتیں اور مناقب ہیں۔

(۱۲) ریشا قمر: مبارکباد!! ان دنوں آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ آپ کی کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں؟

اشرف: تین ناولِ ہیں: (۱) میرا من قصہ سنو، (۲) مردار خور (۳) ضیغمِ سرخ
فراغت و فرصت کے انتظار میں ہوں۔ موقعہ ملے تو اِن کو جلد از جلد مکمل کروں۔ اِبتدائی دونوں ناولوں میں چند صفحات کی کمی ہے۔
میری مندرجہ ذیل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ (۱) ڈار سے بچھڑے (افسانوں کا مجموعہ) (۲) نمبر دار کا نیلا (ناول) (۳) بادِ صبا کا انتظار (افسانوں کا مجموعہ) (۴) آخری سواریاں (ناول) (۵) صلو علیہ وآلہٖ (مجموعۂ نعت و مناقب)
ان کے علاوہ تین چار کتابیں اور ہیں جو تصوف کے موضوعات پر تالیف کا کام ہے۔
(۶) عرفان صدیقی کی شاعری کی کلیات ''شہرِ ملال'' نام سے ترتیب دی ہے جو عرشیہ پبلشرس نے شائع کی ہے۔ (۷) غیر تخلیقی نثر کی کتاب زیرِ ترتیب ہے۔

(۱۳) ریشا قمر: ماشاءاللہ!! یہ سفر یوں ہی جاری و ساری رہے یہی ہماری دعا ہے۔۔ اشرف صاحب اسلامیات سے بھی آپ کا گہرا تعلق رہا ہے ادب اور مذہب کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

اشرف: مذہب کو مذہب کی نظر سے دیکھتا ہوں اور ادب کو ادب کی نگاہ سے۔ دین اور مذہب کی اَساس مختلف ہوتی ہے۔ اور اُن کا تفاعل بھی۔ اسے ہمیشہ دھیان میں رکھنا چاہئے۔ میں ایسا بھی نہیں سمجھتا کہ دین اور ادب میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی دین کی روحِ اصل ادب کو متاثر کرتی ہے اور کبھی کبھی اچھا ادب اصلِ دین کی تشریح آسان زبان میں کر دیتا ہے۔

(۱۴) ریشا قمر: بجا فرمایا!! شاعری اور افسانے کے لیے مصروفیات سے وقت نکالا جا سکتا ہے لیکن ناول محنت طلب اور یکسوئی کا کام ہے آپ نے ایسے میں تین ناول لکھنے کے لیے وقت کیسے نکالا؟



اشرف: پانچ ناول۔ معلوم نہیں کیسے لیکن بہر حال وقت نکال لیا۔ دعا کیجئے کہ اَدھورے کام پورے کرنے کے لیے بھی وقت نکال سکوں۔ دیگر ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد اور زیادہ مصروف ہو گیا ہوں تعلیمی کاموں میں۔

(۱۵) ریشا قمر: ریٹائرڈ ہونے کے بعد اور مصروف ہونے والی بات خوب کہی آپ نے!! اشرف صاحب آپ کا ناول آخری سواریاں بہت مشہور ہوا اس ناول کے کچھ تخلیقی جملے جو آپ کے پسندیدہ ہیں؟

اشرف: یہ کام آپ مجھ سے بہتر طریقے سے کر سکتی ہیں۔

(۱۶) ریشا قمر: میں کر سکتی ہوں اور ضرور کروں گی مگر وہ میرے پسندیدہ ہوں گے۔۔ اشرف صاحب کسی بھی فن پارے کی تخلیق کے بعد خالق کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ احساس ہر تخلیق کے بعد جداگانہ ہوتا ہے تو آپ کو کس ناول کی تکمیل کے بعد بے طرح مسرت نے سرشار کیا؟

اشرف: آخری سواریاں۔ یہ میرے لیے مشکل کام تھا۔ پانچ چھے سو صفحات کے مواد کو جان بوجھ کر دو سوا دو سو صفحات میں سمویا ہے کہ ناول میں افسانے جیسا اِرتکاز برقرار رہے۔

(۱۷) ریشا قمر: شاید اسی کو دریا کو کوزے میں بند کرنا کہتے ہیں۔۔ آپ اپنے معاصر ناول نگاروں میں کن کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟ ان ناولوں کے نام اور خصوصیات بیان کیجیے؟

اشرف: میں معاصر ناولِ نگاروں میں خالد جاوید، انیس اشفاق، اور ذکیہ مشہدی کو پسند کرتا ہوں اور ان کی تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔ اگر ناولِ کی شرط نہ لگائی جاتی تو میں صدیق عالم کا نام بھی لینے میں خوشی محسوس کرتا۔ محسن خاں نے بھی 'اللہ میاں کا کارخانہ' بہت سادگی اور پرکاری سے تحریر کیا ہے۔ طارق چھتاری کے ایک ناول کے کچھ باب پڑھے ہیں۔ اس میں ان کی نثر کی متانت اور عمدہ جزئیات نگاری کے جلوے خوب نظر آتے ہیں۔ غضنفر کے چھوٹے چھوٹے ناولِوں میں ایک دلچسپ بات ملتی ہے کہ ان کی نثر کی بنت میں شاعری اپنا کمال دِکھاتی ہے۔

(۱۸) ریشا قمر: بہت خوب! معاصر فکشن کے اہم نام!! اشرف صاحب آپ کے افسانے بھی بہت مشہور ہوئے میں نے ''اردو کی تیرہ نئی مقبول کہانیاں'' کتاب ایڈیٹ کی ہے ابھی جس میں آپ کا مشہور افسانہ ''ڈار سے بچھڑے'' شامل کیا ہے... آپ کی نظر میں آپ کا بہترین افسانہ کونسا ہے اور کیوں؟

اشرف: ''ڈار سے بچھڑے'' چھپنے کے بعد بہت مشہور و مقبول ہوا۔ لیکن وہ میرا ابتدائی افسانہ تھا۔ موضوع اور اسلوب کی سطح پر میری کہانیوں میں تبدیلی آتی گئی۔ ''منظر'' کا موضوع اور تکنیک اس زمانے کی کہانیوں سے بہت مختلف ہے۔ اسی طرح لکڑ بگھا سیریز کی کہانیاں یعنی 'لکڑ بگھا ہنسا'، 'لکڑ بگھا

رویا'، اور 'لکڑ بگھا چپ ہو گیا' اردو میں نئی طرح کی کہانیوں کے عکاس ہیں۔ 'آدمی' اور 'روگ' بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ اپنی ایک کہانی 'رنگ' کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں لسانیاتی سطح پر ایک تجربہ کیا گیا ہے۔ 'دعا' اپنے اختصار اور ارتکاز کی وجہ سے پسند ہے۔ میں کہانیوں کو شایع ہی تب کرتا ہوں جب وہ مسودہ کی حالت میں سال چھ مہینے اچھی لگتی رہیں۔ (پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) مجھے اپنی سب سے زیادہ اچھی لگنے والی کہانی کا نام لینا مُحال نظر آتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ یہ فیصلہ کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔

(۱۹) ریشما قمر: خوب!! افسانے میں کیا مقامی رنگ کی اہمیت ہے؟ اور کیا آپ نے بھی مقامی رنگ اختیار کیا ہے؟

اشرف: کہانی میں مقامی رنگ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ کہانی آفاقی نہیں، زمینی ہوتی ہے۔ مقامی آب و ہوا، مقامی بولی، مقامی کردار کہانی میں سوندھا پن پیدا کر دیتے ہیں۔ سچ پچھیے تو تقریباً تمام کہانیاں مقامی ہوتی ہیں۔ جن کہانیوں میں مقامیت نہیں ہوتی اُن میں ماجرا بھی نہیں بن پاتا صرف لفظوں کا انبار ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں جدیدیت کے تحت زیادہ لکھی گئیں۔ آج کسی کو ان کا نام بھی شاید یاد نہیں۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ کہانی کی اَرضیت اس کا حق ہوتا ہے۔ اردو کی مشہور کہانیوں کے نام لکھ رہا ہوں کسی تفحص کے بغیر۔ نظارہ درمیان ہے (قرۃ العین حیدر)، ایک چادر میلی سی (بیدی)، موذیل (منٹو) پیتل کا گھنٹہ (قاضی عبدالستار) گڈریا (اشفاق حسین) طاؤس چمن کی مینا (نیر مسعود) آئینۂ حیرت (رفیق حسین)۔ ان میں علی الترتیب بمبئی، پنجاب، بمبئی، اودھ، پنجاب، لکھنؤ اور اُتر پردیش کے پہاڑی علاقوں کی مقامیت کی آمیزش ہے۔

میں کیوں کہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر رہا ہوں اور وہ بھی ہر جگہ ۸-۹ برس اس لیے میری کہانیوں میں کئی بستیوں کی مقامیت ہے۔ مثلاً ڈار سے بچھڑے میں میرے وطنِ مالوف مارہرہ شریف کی مقامیت حاوِی ہے۔ ''روگ'' میں ترائی کے علاقے کی اَرضیت ہے۔ ''آدمی'' میں پھر مارہرہ شریف ہے۔ ''قربانی کا جانور'' میں ممبئی کی مقامیت کا اِمتزاج ہے، ''دعا'' میں بمبئی کا ماحول اور زبان ہے۔ ''ساتھی'' میں ایک ایسا شہر ہے جو علی گڑھ سے ملتا جلتا ہے۔ 'لکڑ بگھا سیریز' کی کہانیوں میں کان پور کے ماحول کی خوشبو ہے۔ ''آخری سواریاں'' میں مارہرہ شریف، دلّی اور کلکتہ کا رنگ ہے۔ ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر افسانہ نگار یہ طے کر کے لکھے کہ اسے ایک خاص مقام کی مقامیت پر زور دینا ہے اور کسی دوسرے مقام کے



کردار یا بولی کو ٹاٹ باہر کرنا ہے تو اس سے کہانی میں یا ک طرح کا تصنع پیدا ہو جاتا ہے اور افسانہ کمزور ہو جاتا ہے۔ مقامیت تو انسان کے رَگ و پے میں سمائی ہوتی ہے۔ اس کا اظہار لا شعوری طور پر ہوتا ہے۔ خالد جاوید نے 'موت کی کتاب' میں اہتما کیا ہے کہ اس میں اسم ہائے معرفہ کا استعمال نہ ہو لیکن لکھتے وقت اس بات پر قابو نہیں رہتا کہ جس مقام کی کہانی ہے اس کا احساس قاری کو نہ ہو پائے۔ 'موت کی کتاب' کا لوکیل بریلی اور نواح کا علاقہ ہے۔ بانس کی گاڑیوں کے ذکر سے یہ بانے کھل جاتی ہیں کیوں کہ بانس اور بریلی کا رشتہ پرانا ہے۔

میری کہانیوں میں 'اندھا اونٹ'، 'چمک' اور 'دوسرے کنارے پر' پر مقامی رنگت بہت واضح ہے حالاں کہ ان میں اُن بستیوں کا نام نہیں آیا ہے جہاں وہ کہانیاں اُپجی تھیں۔

(۲۰) ریشما قمر: کوئی بھی فن پارہ نثری ہو کہ شعری اس عہد کی آواز ہوتا ہے تو کیا وہ آفاقی ہو سکتا ہے اگر ایسا ہے تو وہ کون سے عوامل ہیں جو کسی فن پارے کو آفاقی بناتے ہیں؟

اشرف: یہ سوال پچھلے سوال کے برعکس ہے۔ اس میں مقامیت کا ذِکر تھا اور اس موجودہ سوال میں آفاقیت کا ذکر ہے۔ مقامیت کسی کہانی میں پرزوں کی طرح استعمال ہوتی ہے۔ افسانہ نگار اس مقامیت کو کہانی کے تاثر پر حاوِی نہیں کرتا۔ کہانی کا جو مجموعی تأثر ہوتا ہے وہ ان معنی میں آفاقی ہوتا ہے کہ فکشن کی اس تحریر کا اصل تأثر یکساں ہوگا یا تقریباً یکساں ہوگا چاہے قاری دلّی کا ہو، بمبئی کا ہو، کراچی کا ہو یا نیویارک کا۔

تکنیک اور موضوع مقامی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن ان دونوں کی مدد سے جو مجموعی تأثر خلق ہوتا ہے وہ آفاقی ہوتا ہے۔ مشہور و معروف شاعر احمد مشتاق امریکہ میں رہتے ہیں۔ ''آخری سواریاں'' پڑھنے کے بعد انہوں نے استاد اللہ رکھا مرحوم کے داماد جناب ایوب اولیا کو لندن فون کر اس کتاب کا ذِکر کیا۔ مجھے یقین ہے کہ احمد مشتاق مارہرہ، سیتاپور، دِلّی یا کلکتہ کی مقامیت سے واقف نہیں ہوں گے۔ لیکن اُن کو محسوس ہوا ہوگا کہ ناول کا مجموعی تأثر آفاقی ہے۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ افسانہ نگار کو مقامیت اور آفاقیت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ جو دِل پہ گزرے وہ رقم کرنا چاہیے۔

(۲۱) ریشما قمر: اردو کے نو وارِد فکشن نگاروں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

اشرف: میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ نوجوان قلم کاروں کو کوئی پیغام دوں۔ لیکن جو اپنے بزرگوں سے پایا ہے اس کی ترسیل کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ میرے بزرگوں نے مجھے نوعمری کے زمانے میں سبق دیا تھا کہ اپنے ادب کے کلاسیکی سرمایے کو شوق سے پڑھنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اگر

ممکن ہو تو اپنے ملک کی دیگر زبانوں کے ادب پاروں کا ترجمہ بھی پڑھنا چاہیے تاکہ اس بات کا علم ہو سکے کہ ہم سے پہلے ہماری زبان اور دیگر زبانوں میں کیا کیا لکھا جا چکا ہے اور کس کس انداز سے لکھا جا چکا ہے۔ ہمارے قدم ادب میں جم نہیں پاتے جب تک ہم اپنے کلاسیکی ادب کو شوق سے نہ پڑھیں۔ ہمارے نوجوان فکشن نگاروں کو فکشن کے علاوہ تاریخ اور شاعری کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں سیاق وسباق عطا کرتا ہے اور شاعری کا مطالعہ اس بات کو روشن کرتا ہے کہ نازک موضوعات کو کس طرح برتا جاتا ہے۔

آپ کا اصرار ہے تو ایک بات اپنے نوجوان قلم کاروں سے کہنا چاہوں گا کہ اپنے راستے کے تنہا مسافر بنیں اور جس بات کو وجود نے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے وہی لکھیں۔

(۲۲) ریشما قمر: عمدہ اور اہم باتیں! ادب کو زندگی کی تفسیر کہا گیا ہے مگر نئی تہذیب ادب کو اپنی ضروریات میں شمار نہیں کرتی وہ تو سوشل میڈیا کو انٹرٹینمنٹ سمجھتی ہے اسی سے ذہنی وروحانی تھکن بھی دور کرتی ہے ایسے میں پھر ادب کی کیا ضرورت ہے؟

اشرف: ادب تو سوشل میڈیا کے الجھے پروگراموں کی بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ ایک اچھے ادب پارے کو استعمال کر کے سوشل میڈیا خود کو وقیع اور ارفع کرتا ہے۔

اگر سوشل میڈیا سے آپ کی مراد 'وہاٹس ایپ' اور 'فیس بک' ہیں تو مجھے عرض کرنے دیجیے کہ ان دونوں چیزوں سے تو ذہنی اور روحانی تھکن مزید بڑھتی ہے۔ سستی تفریح کے ذرائع آج موبائل اور لیپ ٹاپ ہیں۔ پچھلے وقتوں میں یہ کام مرغ بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی سے لیا جاتا تھا۔ اَدب کی ضرورت ہمیشہ سے تھی اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ اچھا ادب ہمارے زخموں کی تکلیف کم نہیں کرتا لیکن اُن کے احساس کو کم کر دیتا ہے۔ کتابوں کو آپ تنہائی میں پڑھ کر انبساط بھی حاصل کر سکتے ہیں اور کچھ سوچ بھی سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا کی تفریح ایک سستی تفریح ہے اور اس میں غرق ہو کر کوئی روحانی خوشی شاید ہی حاصل ہوتی ہو۔ تازہ ترین تحقیقات نے بتایا ہے کہ سوشل میڈیا (وہاٹس ایپ، فیس بک، ٹیوٹر اور انسٹاگرام) میں غرق ہو کر تفریح کرنے والے اسکرین دیر تک دیکھنے کی وجہ سے اپنے دماغ کے سوچنے سمجھنے والے حصے کو تقریباً بے حس کر لیتے ہیں جب کہ ادب ہمیں اعلیٰ درجے کی فرحت عطا کرتا ہے اور ہمیں حساس بناتا ہے۔

(۲۳) ریشما قمر: کتاب آپ کو بہت سے تجربات دے جاتی ہے آپ کی شخصیت کو نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔۔ اشرف صاحب آپ کے خیال میں جینوین ادب کیا ہے؟



اشرف: جینوین ادب وہ ہوتا ہے جو ہمیں مسرت اور بصیرت فراہم کرتا ہے۔ جینوین ادب کو ناپنے کے لیے رِیاضی کی طرح کوئی فارمولے نہیں ہوتے۔ صرف ذاتی احساس ہمیں بتاتا ہے کہ جینوین ادب کیا ہے۔ جب وہ ذاتی احساس معاشرے کی روح کو چھونے لگے تو اسے قبول عام کہا جاتا ہے۔

میں میرؔ کی غزلیں بھی پڑھتا ہوں اور میں نے ابن صفی کے ناول بھی پڑھے ہیں۔ مجھے قاضی عبدالستار کے ناوِل پسند ہیں اور میں مشتاق احمد یوسفی کا مزاح بھی شوق سے پڑھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ سب جینوین ادب کا حصہ ہیں۔ ابنِ صفی کے نام پر کچھ لوگ ناک بھوں چڑھا سکتے ہیں۔ لیکن ناک بھوں چڑھانے سے پہلے انہیں چاہیے کہ ابن صفی کے ناوِل 'شاہی نقارہ'، 'جہنم کا شعلہ' اور 'ڈیڑھ متوالے' پڑھ لیں۔ میں اِن ناولوں کو اعلیٰ ترین ادب نہیں کہتا لیکن یہ ناوِل جینوین اَدب کا حصہ ہیں۔

(۲۴) ریشما قمر: بالکل درست کہا آپ نے ابن صفی محض ایک رائٹر کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے ۔۔ اشرف صاحب میں نے انٹرویوز کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہی انٹرویوز کا سلسلہ ''بات کر کے دیکھتے ہیں'' شروع کیا ہے تو یہ آپ سے بھی جاننا چاہوں گی کہ کسی بھی ادب میں انٹرویو کی کیا اہمیت ہے؟

اشرف: انٹرویوز کے ذریعے ادیبوں کی شخصیت کے وہ گوشے سامنے آجاتے ہیں جو اب تک پوشیدہ تھے۔ ادیبوں کی پسند ناپسند کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ زندگی اور ادب کے بارے میں ان کے ردِّعمل سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ لیکن اِنٹرویوز کا وہ حصہ بڑا نازُک ہوتا ہے جہاں کسی مخصوص سوال کا جواب دینے کے لیے ادیب کو خود اپنی تخلیقات کا ذِکر کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ وہاں سمجھ میں نہیں آتا کہ خاموش رہا جائے یا جواب دیا جائے۔ خاموش رہنے میں چالاکی کا الزام لگ سکتا ہے اور جواب دینے میں تعلّی کا ملزم بن جاتا ہے۔

(۲۵) ریشما قمر: خوب! اشرف صاحب ماضی اور حال کے اردو ادب سے آپ واقف ہیں کیا آپ ادب کے موجودہ منظرنامے سے مطمئن ہیں؟

اشرف: ادب کا موجودہ منظرنام مایوس کُن نہیں ہے۔ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں اور عمدہ شاعری بھی ہو رہی ہے۔ اچھی تنقید بھی لکھی جا رہی ہے۔ البتہ تحقیق کے معاملے میں سطحی کام ہو رہے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ بعض وجہوں سے تنقیدی بیانیہ بہت حاوی ہو گیا ہے۔ میں تنقید نگاروں کی عزّت کرتا ہوں، کیوں کہ اُن کا کام مشکل کام ہوتا ہے، محنت کا کام ہوتا ہے۔ لیکن وہ تنقیدی مضامین دِل کو نہیں بھاتے جن میں اپنی سوچ کم ہوتی ہے، دوسرے نقادوں کے اقتباسات زیادہ ہوتے

ہیں۔ اردو کے شعبوں میں تخلیق کی ہمت افزائی نہیں ہوتی، تنقیدی مضامین کی بہت آؤ بھگت ہوتی ہے۔ جب اچھی تخلیقات ہی سامنے نہ آئیں گی تو اچھی تنقید کیسے لکھی جائے گی۔ اس بات کو سمجھنے میں اردو کی درس وتدریس سے وابستہ حضرات بہت وقت لے رہے ہیں۔

شعبۂ اردو میں تنقیدی کتاب لکھنے پر پوائنٹ ملتے ہیں جو لیکچرر شپ کی آسامی کا فارم بھرتے وقت بہت کام آتے ہیں۔ ایسے ہی پوائنٹ تخلیقی کتابوں پر بھی ملنے چاہئیں لیکن یہ پوائنٹ تبھی ملنے چاہئیں جب تخلیق یا تنقید یا تحقیق کی کوالٹی عمدہ ہو۔

ہندوستان پاکستان دونوں ملکوں میں اچھا فکشن لکھا جارہا ہے۔ اچھی شاعری بھی ہورہی ہے۔ خلیجی ممالک میں بھی اچھی شاعری ہورہی ہے۔ قطر میں زندگی جینے والے عزیز نبیل اس کی ایک اچھی مثال ہیں۔

(۲۶) ریشما قمر: صحیح فرمایا آپ نے تخلیق ہو تنقید ہو یا پھر تحقیق سب سے اہم کوالٹی ہے ۔ اردو ادب کا عالمی ادب میں کیا مقام ہے؟

اشرف: اس کا معروضی جواب دینا بہت مشکل ہے۔ جس نے پورا عالمی ادب پڑھا ہو اور جو امریکی، لاطینی، افریکہ، یوروپ، روس، ایران اور دیگر علاقوں اور زبانوں کے ادب سے واقف ہو وہی اس کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔ لیکن اتنا تو آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اردو برصغیر اور خلیجی ممالک کے علاوہ دنیا کے بہت سے علاقوں میں لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ میر، غالب، اقبال عالمی سطح پر قبولیت کی سند رکھتے ہیں۔ فیض کو ''سوویت لینڈ لینن'' اوارڈ ملا تھا۔ منٹو، قرۃ العین حیدر کی کہانیاں دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔ مشرقی تہذیب کے بامعنیٰ اظہار کے لیے اردو زبان وادب نے بہت کام کیا ہے۔ جب ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تھا اس سال اقبال پر بھی غور کیا گیا تھا۔ آج بھی اردو کی عمدہ شاعری اور فکشن انگریزی میں ترجمہ ہوکر عالمی پیمانے پر داد وتحسین وصول کرتے ہیں۔ محمد عمر میمن اردو افسانوں کے تراجم کرکے بڑے پیمانے پر شائع کرتے تھے کیوں کہ ان کی مانگ تھی۔

(۲۷) ریشما قمر: اردو رسم الخط پر آئے دن لوگوں کی رائے نظر سے گزرتی رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے اب کچھ اردو والے بھی اردو رسم الخط سے مایوس نظر آتے ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اردو کو دیوناگری رسم الخط اختیار کرنا چاہیے؟ یا اسے رومن میں لکھنا شروع کردینا چاہیے تاکہ اس کا رینج بڑھ سکے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

اشرف: نہیں۔ میں ہرگز اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اردو رسم خط کا اردو زبان سے بدن اور لباس والا رشتہ نہیں ہے۔ یہ رشتہ جسم اور کھال کا رشتہ ہے۔ اُردو زبان کو جب تک اُردو حروفِ تہجی میں نہ پڑھا جائے، وہ اجنبی



اجنبی سی لگتی ہے۔ اس اجنبیت کو دور کرنا بہت مشکل ہے اور اور رسم خط کو سیکھنا بہت آسان ہے۔

اوّل تو میں یہ واضح کردوں کہ میں اردو رسم خط کی طرف سے ہرگز مایوس نہیں ہوں، بہار، آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹرا میں اردو رسم خط کے ساتھ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہاں اسکولوں میں اُردو کا رِواج ہے۔

ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں مدارس ہیں جہاں لاکھوں طالب علم اردو رسمِ خط میں دینی علوم حاصل کرتے ہیں۔ جب ملک میں فارسی کا رِواج کم ہوگیا تب درسِ نظامی یا دینی نصاب کے لیے اُردو میڈیم کا استعمال کیا جانے لگا۔ حالاں کہ مدارس کے پاس اردو رسمِ خط استعمال کرنا ان کی ترجیحات میں شامل نہیں تھا۔ یہ ان کی مجبوری تھی کہ فارسی کا عام رِواج ختم ہورہا تھا۔ لیکن اُن کی یہ مجبوری اردو رسم خط کے لیے آبِ حیات بن گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم مدارس سے عمدہ ادب کی تخلیق کی امید رکھیں لیکن یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ مدارس کے طلباء کے ہاتھوں میں اردو رسمِ خط محفوظ ہے۔

طالب علموں کے مدارس کے ساتھ ساتھ طالبات کے مدارس بھی بڑی تعداد میں ہیں اور وہاں بھی تقریباً وہی نصاب ہے جسے اردو رسمِ خط میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس نصاب کی بڑی بڑی کتابوں، مثلاً بخاری شریف اور جلالین پر عمدہ اردو رسم خط میں حاشیے لکھے گئے ہیں۔ درسِ نظامی میں پڑھائی جانے والی تقریباً تمام کتب پر ازسرِ نو جدید طباعت کے ساتھ حاشیے لکھنے کا کام مشہور درسگاہ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور میں شروع ہوا۔ جو تقریباً مکمل ہوچکا ہے۔ لاکھوں لاکھ طلباء وطالبات تقریباً آٹھ سے دس برس تک اُردو رسمِ خط میں کتابوں کے حواشی پڑھتے ہیں اور امتحانات کے پرچوں کا جواب اردو میں لکھتے ہیں۔ ان میں سے اچھی تعداد میں طلباء فارغ ہوکر درس وتدریس کے کام میں لگ جاتے ہیں یا تصنیف وتالیف کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں۔

میں اس بات کو ماننے میں بھی تامل نہیں کروں گا کہ اردو رسمِ خط کو صرف مدارس اور جامعات کے بھروسے پر چھوڑ دیا جائے۔ ہمیں اس کے لیے اَن تھک کوشش کرنا ہوگی کہ اپنے اپنے محلوں میں چھوٹے چھوٹے کمیونٹی مکاتب قائم کریں جہاں قرآنِ عظیم کے ناظرے اور زبانِ اُردو کی اِبتدائی تعلیم ہوتا کہ ہمارے بچے کم عمری میں ہی رسمِ خط سیکھ جائیں۔ بچے اگر ایک بار حروف کو جوڑ کر لفظ بنانا سیکھ جائیں تو پھر بہت آسانی ہوجاتی ہے۔ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل تک میں ایسے ایپ (Application) ہوتے ہیں جو انگریزی حروف لکھنے پر اردو زبان میں منتقل کردیتے ہیں مثلاً گوگل ٹرانس لٹریشن (Google Transliteration) ہمارے نوعمر

آسانی کے ساتھ اس Application کی مدد سے رسمِ خط پر قابو پا سکتے ہیں۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ زبانوں کو سیکھنے کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ یہ کہ ہمارے گھروں میں ابھی ایسی خواتین ہیں جو گھر کے بچوں کو روزانہ آدھا گھنٹہ دے کر اردو رسمِ خط سکھا سکتی ہیں۔ مساجد کے ائمہ حضرات سے اپنے بچوں کو ٹیوشن دلائی جا سکتی ہے۔ اِس طرح اُن کی قلیل آمدنی میں بھی تھوڑا سا اِضافہ ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا تمام طریقے سادہ اور قابلِ عمل ہیں۔

بہت سے پبلک اسکول اور کانونٹ بھی طلباء کی اچھی تعداد دیکھ کر اپنے یہاں کم از کم آٹھویں درجے تک اردو پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ میرے خسرِ محترم پروفیسر علی اشرف (سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ) جب پٹنہ میں تعینات تھے تب انہوں نے وہاں کی پرنسپل سے کہا کہ ان کے بچوں کو اُردو بھی پڑھنا ہے۔ پرنسپل نے جواب دیا کہ اگر وہ اُردو کی کلاسس شروع کرتی ہیں تو آپ کے بچے اپنے سیکشن سے اس پیریڈ کے لیے Uproot ہو جائیں گے۔ میرے مرحوم خسرِ محترم نے فرمایا کہ اگر یہ بچے اردو نہیں پڑھ سکے تو اپنی دادی اور نانی سے ہمیشہ کے لیے Uproot ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سینٹ جوزف جیسے مشہور کانونٹ میں اردو کی تعلیم شروع ہوئی جو اب تک جاری ہے، بحمد للہ۔

جہاں ہمارے بچے تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں وہاں ہم اردو کی تعلیم کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

البرکات پبلک اسکول، علی گڑھ میں دسویں تک اردو کی تعلیم کا نظام ہے اور غیر مسلم طلباء و طالبات بھی دلچسپی سے اردو پڑھتے ہیں۔

میں دیوناگری میں یا رومن میں اردو لکھنے کا مخالف نہیں ہوں لیکن یہ اردو رسم خط کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں نوجوانوں میں (ہندو ہوں یا مسلم) اردو سے دلچسپی بڑھی ہے۔ ریختہ اور جشنِ ادب کے جلسوں میں ہزاروں نوجوان پہنچتے ہیں۔ جب اردو سے دلچسپی بڑھ رہی ہے تو لامحالہ اردو رسمِ خط سے بھی قربت پیدا ہوگی۔

اس موضوع پر بات طویل ہوگئی۔ بس ایک آخری بات کہہ کر اگلے سوال کا جواب دوں گا... بچے اکثر شکایت کرتے ہیں کہ کتابوں میں اردو کی طباعت اس طرح ہوتی ہے کہ ایک لفظ کے حروف دوسرے لفظ کے حروف کے پاس نظر آتے ہیں جس سے اختلال پیدا ہوتا ہے۔ میرے بچپن میں ایک رسالہ تھا جس کا نام ''نور'' تھا۔ اس میں طباعت ایسی ہوتی تھی کہ الفاظ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر



ہوتے تھے۔ ہم آج بھی کمپوزنگ میں یہ طریقہ استعمال کر سکتے ہیں۔ کاغذ کا کچھ خرچہ بڑھ جائے گا لیکن ہماری آنے والی نسلیں اردو رسم خط سے نزدیک ہونے میں پریشانی نہیں محسوس کریں گی۔

(۲۸) ریشما قمر: مدلل اور مفصل جواب! ادب میں گروہ بندیاں پہلے سے ہی رہی ہیں اب تو یہ کہا جا رہا ہے یہ گروہ بندیاں ہی ایوارڈز اور اعزازات کا فیصلہ کر رہی ہیں یہ بات کس حد تک درست ہے؟

اشرف: ادب میں ہمیشہ سے گروہ بندیاں ہیں۔ لیکن انعامات و اعزازات کا فیصلہ ہمیشہ گروہ بندی کے لحاظ سے نہیں ہوتا۔

میرا اُردو کے کسی خاص گروہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے لیکن مجھے اردو ادب سے متعلق تقریباً تمام اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ کہانی لکھنے پر اوّل انعام علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں ملا۔ طالب علمی کا زمانہ ابھی چھوٹا بھی نہیں تھا کہ ۱۹۸۱ء میں کراچی سے ''دوشیزہ اوارڈ'' ڈار سے بچھڑے پر ملا۔ اسے دینے والے ذاتی طور پر مجھ سے واقف بھی نہیں تھے۔ غالباً ۱۹۹۵ء میں مشہور کتھا اوارڈ ملا جو ''آدمی'' نام کے افسانے پر ملا۔ مرکزی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اقبال سمّان، فروغ اردو ادب (دوحہ قطر اوارڈ)، لائف ٹائم اچیومنٹ اوارڈ اردو اکامی... یہ سب وہ اوارڈز ہیں جن کا فیصلہ کرنے والوں سے میرا کوئی گروہی تعلق نہیں تھا، نہ اب ہے۔ الحمد للہ۔ یوں اپنی عزت نفس پر سمجھوتہ کیے بغیر میں سب کا ادب لحاظ کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ میرا ذاتی تجربہ ہو۔ بلکہ یہ بات ایک حقیقت ہے کہ انعامات و اعزازات اکثر و بیشتر گروہ بندی کی بنیاد پر ہی دیے جاتے ہیں۔ البتہ میں اس بات سے ذاتی طور پر واقف ہوں کہ پروفیسر شارب ردولوی صاحب نے اپنی بیگم محترمہ شمیم نکہت کے نام سے جو ایوارڈ شروع کیا ہے اس کے لیے وہ ایک جیوری بناتے ہیں جس میں مختلف الخیال ادباء و شعراء ہوتے ہیں۔ وہ جیوری ہم خیال ہو کر کسی ایک فکشن نگار کا نام تجویز کرتی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی ان کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوتے، لیکن ایسی مثالیں عنقا کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۲۹) ریشما قمر: کسی بھی ادیب یا فنکار کے لیے انعامات کتنی اہمیت رکھتے ہیں؟

اشرف: انعامات و اعزازات سے حوصلہ بڑھتا ہے، طاقت ملتی ہے۔ ہمارا کام پسند کیا جا رہا ہے، اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ انعامات و اعزازات حرفِ آخر نہیں ہوتے۔ اصل انعام تو پڑھنے والے دیتے ہیں یا اپنا دِل دیتا ہے۔ اور زمانہ دیتا ہے۔ میں سرسوتی سمّان اور گیان پیٹھ ایوارڈ کی اس جیوری کا ممبر ہوں جو آخری فیصلہ کرتی ہے۔ ع

ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں

(۳۰) ریشا قمر: آپ کا اصل انعام آپ کے قارئین ہیں سر آپ سے یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ایسی کوئی کہانی ہے جو آپ لکھنا تو چاہتے ہیں مگر جسے اب تک نہیں لکھ پائے؟

اشرف: ایسے تین ناول اور چار کہانیاں ہیں جو میں لکھنا چاہتا ہوں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ کام مکمل نہیں ہو پاتا۔ بائیں آنکھ کے ریٹینا میں بہت تکلیف ہے۔ یہ عارضہ کچھ قابو میں آئے تب شاید یہ کام مکمل ہوں۔ جن ناولوں کا اوپر ذکر کیا ان کے سینکڑوں صفحات لکھ چکا ہوں۔ لیکن ابھی مکمل نہیں کر پایا ہوں غمِ دوراں بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

(۳۱) ریشا قمر: ان شاء اللہ بہت جلد آپ کے ادھورے کام مکمل ہو جائیں گے آپ کی صحت و سلامتی کے لیے ڈھیروں دعائیں! آخری سوال آپ کی میری اور ہم سب کی پیاری اردو زبان کے حوالے سے ہے۔ آج اردو تعلیم افسوس ناک حد تک زوال کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اس کی ترویج و بقاء کے لیے کیا مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں؟

اشرف: اردو زبان سے محبت میری پہلی محبت ہے۔ میں نے اس موضوع پر آرٹیکل بھی لکھے ہیں اور کہانیاں بھی۔ جلسوں میں بھی خطاب کیا ہے اور محفلوں میں بھی گفتگو کی ہے۔ اردو تعلیم کی صورتِ حال کا تعلق اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے ہے۔ اس کے لیے ہمیں حکومت سے اپنے احتجاج کے موقف میں کوئی کمی نہیں کرنا چاہئے لیکن ہم خود بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ اردو زبان کی تعلیم کی ڈور اردو رسم خط سے بندھی ہوئی ہے۔ اردو رسم خط والے سوال کے جواب میں اس کا تفصیلی جواب دے چکا ہوں۔ کاش ہم سب اس پر عمل کر سکیں۔ بہت شکریہ

ریشا قمر: آپ سے بات کر کے اور آپ کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی۔ بہت شکریہ

◂◂ ● ▸▸

H no:189 Near Mahindra Showroom
Sedam Road Kalaburagi 585105 Karnataka
Mob No:7259673569



● ڈاکٹر اکرم پرویز

# نیر مسعود: فریب خیال کی شعریات

## ——— 'مارگیر' کی مظہریاتی اور توتمی شرح ———

مجھے اپنے قریب ہی کہیں ایک مانوس خوشبو کا احساس ہوا۔ یقیناً بہت پہلے کبھی میں اس خوشبو سے آشنا تھا۔ میرے سر کے اندر دھندسی پھیلنے لگی۔

مانوس خوشبو کی لپٹ پھر آئی اور اچانک مجھے پتا چلا کہ یہ خوشبو درخت کے کھرچے ہوئے تنے کی سبز لکیروں میں سے نکل رہی ہے۔ میں ان لکیروں کی طرف کھنچ رہا تھا کہ ایک آہٹ سنائی دی۔

مجھے یاد آیا کہ مانوس خوشبو اس کی [مارگیر] ہتھیلیوں میں بھی موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہی خوشبو اس سوار کے ٹوٹے ہوئے دھڑ میں سے نکلتی تھی۔ [مارگیر]

ادبی متن ایک بھید بھرا تجربہ ہے جس کا شعور حاضر جمع غائب ہے۔ مظہریت اسی معمے کو حل کرنے کی ایک کاوش ہے۔ سوانحی/نفسیاتی تعبیر خالق کے احوال و کردار کے سیاق میں متن سے معاملہ کرتی ہے اور اسے مصنف کے شعور کا انعکاس قرار دیتی ہے مگر مظہریت اس ترتیب کو پلٹ دیتی ہے۔ یہ متن کو خالق کی طرح ٹریٹ کرتی ہے اور اسی کے توسط سے ماتن کے شعور کو کھولتی ہے۔ یوں متن مصنف کے شعور کی تفہیم کا امتیازی نشان بن جاتا ہے۔ شعور کے حاضر جمع غائب کا مظہریاتی مساوات ذیل میں مندرج ہے:

مظہریاتی تنقید کے نزدیک 'ادب شعور کی ایک فارم ہے اور تنقید کا کام اس فارم کا تجزیہ کرنا اور اس میں مصنف کے تہ نشیں شعور کی نشاندہی کرنا ہے'۔ مظہریت نے مصنف کی نفسیات اور ادب کے درمیان پہلے سے چلی آ رہی ترتیب کو پلٹ دیا، یعنی روایتی رویہ مصنف کے ذہن و شعور کی روشنی میں ادب کے مطالعے کا تھا۔ مظہریت نے زور دیا کہ ادب کو بنیاد بنانا چاہیے مصنف کے ذہن و شعور کو سمجھنے کے لیے، گویا ادب کلید ہے مصنف کے شعور کی کہ اس کے شعور

نے حقیقت کو کس طرح سمجھا اور پھر ادب کی سطح پر اُس کی کیا بازیافت کی۔

[گوپی چند نارنگ: ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2004، ص:294]

یہاں ہمفری اوزمنڈ کے سیاق میں ذیل کے تھیوری سے بھی واقف ہونا ضروری ہے:

The word "psychedelic" (coined by British psychologist Humphry Osmond) means "mind manifesting". By that definition, all artistic efforts to depict the inner world of the psyche may be considered "psychedelic".

(https://en.wikipedia.org/wiki/Psychedelic_art)

ترجمہ: لفظ 'واہماتی' (ہمفری اوزمنڈ سے منسوب) کا مفہوم ہے دماغ کا اظہار۔ اس تعریف کے تحت سائیکی کی داخلی دنیا کے اظہار کی تمام ادبی کوششیں واہماتی خیال کی جاسکتی ہیں۔

قاضی افضال حسین نے واہماتی (Psychedelic) اور فریب خیال (Hallucination) کی تفریق کیے بنا ہی نیر مسعود کے افسانے کو واہمہ قرار دیا ہے۔ واہمے کے لیے انھوں نے.....موجود میں غیر موجود، اور غیر موجود میں موجود..... کے ہونے کا مفروضہ قائم کیا ہے جو نیر مسعود کے ہی بیانیہ سے ماخوذ ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے Hallucination کی وضاحت نہیں کی اور اسے ایک منفی تصور کی طرح برتا۔ انھوں نے اسے واہمہ کے مقابل رکھ کر یکسر مسترد کر دیا اور اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جبکہ اپنے تصوراتی معنی میں واہمہ اور فریب خیال دونوں ایک ہی ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ادبی معاملات میں جسے وہ واہمہ کہہ رہے ہیں، اسے ہی عام معنی میں یا روزمرہ میں فریب خیال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض دفع مترادف کے طور پر بھی ان دونوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ فریب خیال کے تفاعل کی ضمن میں ذیل کے اقتباسات کا مطالعہ سودمند ہوگا:

Hallucinogens are. . . chemicals which, in non-toxic doses, produce changes in perception, in thought and in mood, but which seldom produce mental confusion, memory loss or disorientation for person,



place and time.

[Richard Evans Schultes, Albert Hofmann, and Christian Rätsch: (1998) *PLANTS OF THE GODS, Their Sacred, Healing, and Hallucinogenic Powers*, Vermont: Healing Arts Press, Rochester, p:13]

ترجمہ: فریب خیال پیدا کرنے والی ادویات کیمیائی مادے ہیں جو کہ اپنی غیر زہریلی خوراک میں کسی شخص، جگہ اور وقت کی کیفیت، خیال اور تصورات میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں لیکن جو شاذ و نادر ہی یہ ذہنی انتشار، عدم یادداشت یا بدحواسی پیدا کرتی ہیں۔

There are many kinds of hallucinations: the most common and popularly recognized is the visual hallucination, often in colors. But all senses maybe subject to hallucinations: auditory, tactile, olfactory, and gustatory hallucinations can occur. [Ibid, p:12]

ترجمہ: کئی قسم کے فریب خیال ہوتے ہیں جن میں سے سب زیادہ عام اور معروف سمجھا جانے والا فریب خیال بصری فریب خیال ہے جو کہ سیاہ و سفید کے بجائے رنگ آمیز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام حواس فریب خیال کے زیر اثر ہو سکتے ہیں یعنی قوت سامعہ، قوت لامسہ، قوت شامہ اور قوت ذائقہ میں بھی فریب خیال پیدا ہو سکتے ہیں۔

Hallucinogens or psychedelics produce deep changes in the sphere of experience, in perception of reality, in space and time, and in consciousness of self. Depersonalization may occur. Without loss of consciousness, the subject enters a dream world that often appears more real than the normal world. Colors are frequently experienced in indescribable brilliance; objects may lose their symbolic character, standing detached and assuming increased significance since they seem to possess their own existence. [Ibid, p:14]

ترجمہ: فریب خیال یا واہمہ زاد ادویات ذات کے شعور کے ساتھ ساتھ زمان و مکان، سچائی اور تجربات کے دائرے میں گہری تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔ اس سے

ذات کی معدومیت ہوسکتی ہے۔شعور کو کھوئے بغیر انسان ایک ایسی خواب ناک دنیا میں داخل ہوتا ہے جو حقیقی دنیا سے بھی زیادہ حقیقی نظر آتی ہے۔رنگ اکثر ایسے محسوس ہوتے ہیں جن کی غیر معمولیت پر سوال قائم نہیں کیا جاسکتا۔اشیا اپنے علامتی/معنوی کردار کو ختم کردیتی ہے اور اس سے علاحدہ ہوکر اپنی معنویت کو مستحکم کرتی ہے ایسے جیسے کہ ان کا خود کا کوئی الگ وجود ہو۔

The psychic changes and unusual states of consciousness induced by hallucinogens are so far removed from similarity with ordinary life that it is scarcely possible to describe them in the language of daily living. [Ibid, p:14]

ترجمہ:فریب خیال والی ادویات شعور کی غیر معمولی حالت اور اندرونی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں جو کہ عام زندگی سے اشیا کی مماثلت کو برطرف کردیتی ہیں جس کو کہ روزمرہ کی زبان میں بیان کرنا شاید ہی ممکن ہو۔

نیر مسعود کے بیانیہ میں وہ تمام کوائف ووظائف ساختیہ کے طور پر دخیل ہیں جن کی خصوصیات وصفات محولہ بالا انگریزی اقتباسات میں مذکور ہیں۔ساتھ ہی اس سے ان کی .....نوشدارو.....کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔یوں بھی مندرجہ بالا اقتباسات کی رو سے مارگیر کے متن کا تقابل ان کے درمیان کے انسلاک واشتراک کو نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ فریب خیال کی شعریات کی شرح سے بھی تعلق رکھتا ہے:

مجھے آج تک یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ میں نے ان دھندلے سایوں کے درمیان کتنا وقت گزارا۔شروع شروع میں مجھے ہلکی آہٹوں کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔اس کے بعد آہٹوں کے ساتھ کچھ ہاتھوں نے مجھے چھونا شروع کیا۔یہ ہاتھ کبھی کبھی مجھے کچھ چیز بھی پلاتے تھے۔جس کے ساتھ میری ناک میں تلخ دھویں کی سی بو آتی تھی۔اپنی آنکھوں کے سامنے مجھے ہر وقت ایک سیاہ پردہ تنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔آخر ایک بار اس پردے میں ہلکی ہلکی لہریں پڑنے لگیں جو رفتہ رفتہ دھندلے سایوں میں بدل گئیں۔ابتدا میں یہ سایے میرے لیے ناقابل فہم تھے،لیکن پھر ایسا ہونے لگا کہ جو شکل میں چاہتا تھا سایے وہی شکل اختیار کرلیتے تھے،اور یہ میرا ایک کھیل ہوگیا تھا۔ان بدلتی ہوئی شکلوں کے سوا جو میری مرضی کی پابند تھیں۔مجھے کسی چیز کے بارے میں کوئی تجسس



نہیں تھا۔اور اپنے حواس سے ٹکرانے والی ہر بات مجھے بالکل فطری اور ہمیشہ سے ہوتی معلوم ہوتی تھی۔آوازیں مجھ سے سوال کرتی تھیں جن کا جواب دینے کے لیے مجھے ان سوالوں کو سمجھنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی، بلکہ کبھی کبھی تو میں کسی سوال کے بغیر بھی جواب دینے لگتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح میں کوئی بہت بڑا فرض ادا کررہا ہوں۔[مارگیر]

مفروضاتی سیاق میں کہنا ممکن ہے کہ مارگیر کے بیانیہ کی مظہریاتی ساخت نیر مسعود کے شعور کی ایک ایسی تشکیل نو سے عبارت ہے جس میں فریب خیال کی سائیکی کا انوکھا پیٹرن اپنی مکمل جمالیات کے ساتھ منور ہوا ہے۔خواہ اس پیٹرن کی تشکیل کی اساس کچھ بھی رہی ہو۔یوں بھی اس بیانیہ کی مارفولوجیکل ساخت کی تحدید میں فن کار حال اور ماضی کے مابین افتراق قائم کرنے سے قاصر نظر آتا ہے لہذا حال کی کیفیات ماضی کے دھندلکوں سے ہم آہنگ ہوکر ایک عجیب وغریب اور غیر مانوس عرصے کی تشکیل کرتی ہے اور ہم اس عرصے سے اسی ذہنی تناسب کے تفاعل میں نہیں جڑ پاتے جیسا یہ پیٹرن ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔یوں ہم بھی مارگیر کے بیانیہ کے اسی دھند کا حصہ ہوجاتے ہیں جو اس کی عمومی فضا ہے اور جس کے لیے افضال صاحب نے 'واہمے' کا مفروضہ قائم کیا ہے۔لیکن اگر ہم اسے یوں سمجھیں کہ اس پیٹرن میں داخل کا انتشار اور بدنی انفجار،شعور ولاشعور/خواب وخیال کے باہمی تفاعل کی آمیزش وآویزش کی غیر معمولیت سے صیقل ہوا ہے تو متن کچھ کچھ کھلنے لگتا ہے۔اس تناظر میں یہ کہنا غیر اغلب نہیں ہوگا کہ بیانیہ کوئی بھی مکمل وضع قائم نہیں کرپاتا یعنی مسلسل التوا میں رہتا ہے اور اگر کہیں بھی اس کی کامل وضع اجاگر ہوتی ہے یا اس نوع کا کوئی امکان بھی ممکن نظر آتا ہے تو پھر اس میں انقسام وانفجار کی مختلف صورتیں جنم لینے لگتی ہیں اور دراصل یہی صورتیں ہی اس متن کی واحد/کلی/حتمی ساخت کی مسلسل نفی واسترداد سے متعلق ہیں۔نفی واسترداد کی اس منطق کی تفہیم سے نوتشکیلی شعور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اسی نوتشکیلی شعور میں قرأت کے آداب متعین کرنے سے متن کی مظہریاتی وضع کا جمال نکھرنے لگتا ہے۔

نیر مسعود کا بیانیہ متن غیر حاضر میں موجود ہے اس لیے ان کے متن کے داخلی انسلاکات،شرحیات کے ایسے قوانین کی دریافت کا مطالبہ کرتے ہیں جو عام اور سکہ بند تنقیدی میزان سے ممیّز ہوں۔ان کے متن کے داخلی انسلاکات میں قبل از تاریخی Prehistoric معاشرت کا گہرا شعور روشن ہے۔اس لیے نیر مسعود کے بیانیہ کی تفہیم کے لیے قبل از تاریخی ثقافت کی جڑوں کا مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ نام نہاد مہذب سماج کی اخلاقیات میں ماقبل تاریخی معاشرت کے عقائد ورسمیات کو توہمات ولغویات کے لفظی اور معنوی ڈھانچے میں محصور کیا جاتا ہے۔کلچر کی تمام تعریفوں میں نام نہاد مہذب سماج کے تشکیل کردہ ترجیحات و تعصّبات ضرور مضمر ہوتے ہیں جس کی رو سے ہر بے تعقلی واقعات کی تردید کی جاتی ہے۔تو تمی معاشرت کے

ساتھ بھی اسی نوع کا رویہ برتا گیا ہے اور اسے آج کے مادی اور جدید کلچر میں ملفوف اصطلاحات کے سیاق میں روشن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ روشن خیالی اور جدید علمیات کے تناظر میں قبائلی معاشرت موڈرن تہذیب کے لیے حیرت کا سامان بن گئی (اس حوالے سے درخائم، ٹیلر، فریزر، مالینوسکی اور بالخصوص لیوی اسٹروس وغیرہ کا مطالعہ سودمند ہوگا)۔ ادبی مطالعات میں اسطوری علائم کو (غیر ادبی) وسیلے کے طور پر برتا گیا لیکن اس ثقافت کو فراموش کر دیا گیا جس کے گربھ سے اسطوری بیانیہ کا جنم ہوا تھا۔ یہ گربھ ہی توتمی معاشرت کا زائیدہ ہے لہذا افسانوی بیانیہ کی تعبیر میں توتمی معاشرت کو بھی حوالہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذیل میں ماقبل تاریخی معاشرت کے بنیادی جوہر توتمیت کو نیر مسعود کے متن سے ملا کر پڑھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نیر مسعود کے بیانیہ میں غیر موجودگی کے جو ابعاد ہیں ان میں زمان و مکان کی شناخت کو معدوم رکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں واضح طور پر بستی، جنگل، پرندے، جانور، شامن اور قبائلی معاشرت کا ادراک موجود ہے:

> بلکہ کئی بار تو مجھے اس جنگل کے پیچ وخم پر اپنے گھر کے آس پاس کے پہچانے ہوئے راستے کا گمان ہوا۔ [مارگیر]

جنگل کے پیچ وخم پر اپنے گھر کے آس پاس کے پہچانے ہوئے راستے کا گمان ہونا محض واہمہ نہیں بلکہ توتمی سائیکی کا بھید بھی ہے جو اجتماعی لاشعور کے سہارے متن میں تحلیل ہو رہی ہے۔ تحلیل ہونے کا پراسیس مکمل نہیں ہے لہذا اس کی باقیات متن میں جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ یہی باقیات توتمیت کے احوال و آثار کو منور کرتے ہیں۔ متن کی مظہریاتی تعبیر میں اسے یوں بھی بریکٹ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں نہ صرف مصنف کا انعکاس ہوتا ہے بلکہ اس کا بدنی جمال بھی اپنی تمام تر حیرانیوں کے ساتھ منکشف ہوتا ہے۔ یوں بھی اس بات پر بضد نہیں ہو جا سکتا ہے کہ توتمی معاشرت کے سیاق میں ہی ان کے بیانیہ کی تشکیل ممکن ہوئی ہے لیکن اسے بطور طریق کار کے برتنے پر کچھ نئے سوالات ضرور قائم ہو سکتے ہیں، اور نیر مسعود کے بیانیہ سیاق کی شرح میں یہی ہمارا مقصد ہے۔ ان کے یہاں واضح طور پر جنگل کلچر کے تمام لوازمات موجود ہیں اور اس کی پوری ترتیب بھی اس میں شامل ہے۔

توتمی معاشرت کی اساسی شناخت توتم کے سہارے منور ہوتی ہے:

> It (totem) is as a rule an animal,and more rarely a plant or a natural phenomenon, which stands in a peculiar relation to the whole clan.
> [Sigmund Freud: (2012) *Totem and Taboo*, special Indian Edition: Routledge Classics, p:3]



> ترجمہ: توتم اصولاً ایک جانور ہی ہے اور کبھی کبھار یہ ایک پودا یا ایک قدرتی مظہر ہوتا ہے جو کہ پورے قبیلے سے ایک مخصوص رشتہ رکھتا ہے۔

توتم کسی مخصوص قبیلے کا شناختی نشان ہوتا ہے جو اپنے ہمعصر دیگر قبائل کے نشانات سے منفرد اور الگ ہوتا ہے۔ توتمی معاشرت میں قبیلے کی قرابت داری کا تصور اسی کی رو سے متعین ہوتا ہے۔ قبیلے میں خون کا رشتہ اتنا اہم اور معنی خیز نہیں ہوتا جتنا کہ توتمی قرابت داری یعنی ایک ہی قبیلے کے لوگوں کا آپس میں بھائی بہن ہونا۔ اس کی اطلاقی جہت میں دیکھا جائے تو نیر مسعود کے یہاں بھی توتمی تشکیل کے کئی حوالے مذکور ہوئے ہیں:

> پاک ناموں والا پتھر بیضوی قطع کی ایک سفیدی مائل لوح کی شکل میں ہے جس میں باریک حرفوں میں پاک نام کندہ ہیں۔۔۔ یہ ہمارے خاندان کا نشان ہے۔ [پاک ناموں والا پتھر]

ان کے بیانیہ میں توتم کی تشکیل کے بعد اس کے معجزات بالکل اسی تناسب سے بیان ہوئے ہیں جیسا کہ Frazer نے Totemism میں بیان کیا ہے:

> سب کچھ بہت صاف تھا۔ ہر موت اور ہر خون کے ساتھ یہ ضرور بتایا جاتا تھا کہ پتھر مرنے والے کے پاس نہیں تھا۔ کئی لوگوں نے مرض کی شدت میں اسے گلے سے اتار دیا تھا۔ کئی کے گلے سے اسے اتار کر اسے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ بعض نے غسل کرتے وقت اسے اتار دیا تھا اور غسل کرنے ہی میں ختم ہو گئے تھے۔ کئی بیماروں کو جب ان کی حالت مایوسی کی ہو گئی، پتھر پہنا دیا گیا تھا اور وہ اچھے ہو گئے تھے۔ پتھر ہمارے خاندان کا نشان تو تھا ہی، مجھے محسوس ہوا کہ خاندان کا سب سے بڑا مسئلہ بھی تھا، اس لیے کہ جب تک وہ کسی کے گلے میں رہتا اسے موت نہ آتی۔ [پاک ناموں والا پتھر]

محولہ بالا اقتباس میں پاک ناموں والا پتھر خاندانی نشان کے طور پر قائم ہوتا ہے۔ توتمیت کا سیاق اس کے توتم ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد محولہ بالا اقتباس میں توتمی متعلقات کے کچھ دیگر مرحلوں کا ذکر بھی موجود ہے جو توتم کے روحانی اور مابعد الطبیعیاتی خصائص کو اجاگر کرتے ہیں اور اس سے مختلف انواع کے عقائد و توہمات کو منسلک کرتے ہیں لیکن توتمیت کے تفاعل کو مزید پھیلانے کے لیے ہمیں 'مارگیر' کے بیانیہ کی توتمی ساخت کو انگیز کرنا ہوگا۔ یوں تو نیر مسعود کے بیانیہ میں توتم کی نشانیاتی تشکیل کے بعد کا مرحلہ بھی سلسلہ وار طے ہوا ہے۔ جس میں سے ایک مرحلہ تو وہ ہے جہاں راوی کردار اور قبیلے کے درمیان تفاہم و تقارب کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے اور پوری بستی اسے اپنا توتمی قرابت دار تسلیم کر لیتی ہے۔ اس

کے علاوہ بھی متن میں اس نوع کے کئی مرحلوں کا ذکر موجود ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نیر مسعود کے اکثر بیانیہ میں جہاں بھی راوی کردار کسی بستی سے روبہ رو ہوتا ہے اس کے لیے وہ بستی اپنے تمام در وا کر دیتی ہے۔ مارگیر میں 'مددگار' کے ساتھ بھی بستی کا اسی نوع کا رویہ ہے۔ مارگیر کی توتمی ساخت کو توڑتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس بیانیہ میں مارگیر قبیلے کا شامن ہے۔ جس کے پاس تقریباً ہر نوع کے سانپ کے کاٹے کا علاج ہے۔ اس کے پاس ایک زہر مہرہ بھی ہے جو دیکھنے میں سیاہی مائل پتھر کی مانند ہے۔ پاک ناموں والے پتھر سے اس کی وضعی ساخت کی مماثلت کے برخلاف اس بیانیہ میں مارگیر اور زہر مہرہ سے توتمی قرابت داری کا جو بھی معاملہ ظہور پذیر ہوا ہے اس میں توتمی سائیکی کے تمام انسلاکات و مضمرات موجود ہیں:

مجھے نہیں معلوم اور شاید کسی کو بھی نہیں معلوم کی یہ کیا ہے۔ اسے پرانے لوگوں نے بنایا تھا یا یہ قدرتی چیز ہے، کوئی پتھر یا نباتات یا کسی قسم کا جاندار۔

جاندار؟ میں نے پوچھا۔ اسی وقت زہر مہرہ بے ہوش ہو کر گرا۔

یہ بے ہوشی۔ مارگیر بولا۔ یا شاید کچھ دیر کی موت۔ کیا یہ اس کے جاندار ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟ اور اس کے جاندار نہ ہونے کا کیا ثبوت ہے؟

اس نے زہر مہرے کو دودھ کے برتن میں سے نکال کر زخم سے چپکا دیا۔

تمھیں تعجب ہوگا۔ وہ کہنے لگا کہ میں سب سے زیادہ سانپ سے ڈرتا ہوں۔ مجھے واقعی تعجب ہوا اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا۔

لیکن کبھی کبھی سانپ سے بھی زیادہ ڈر مجھے زہر مہرے سے لگتا ہے۔ [مارگیر]

توتم نہ صرف یہ کہ قبیلے کے افراد کو ایک وجودی تشخص عطا کرتا ہے بلکہ قبیلے کی اجتماعی اور انفرادی سائیکی میں بھی مسلسل توانائی اور قوت کو منتقل کرتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ قبائل کے مختلف افراد کے درمیان میں ایک روحانی رشتہ بھی تشکیل دیتا ہے جو خونی رشتے سے بھی زیادہ گہرے اور بامعنی ہوتے ہیں۔ تعقلاتی سطح پر اس کی پرکھ نام نہاد جدید تہذیب میں اسے کسی حد تک مذہبی تفاعل کے مماثل قرار دیتی ہے لیکن اس کا پراسیس توتمی معاشرت سے تفریقی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ یوں توتم کی موجودگی اور اس کا احساس قبیلے کے تمام افراد کو توانا اور متحرک رکھتا ہے اور ان کی روحانی تجدید میں مسلسل مصروف رہتا ہے لیکن ساتھ ہی توتم کے تعلق سے کسی نوع کی تحریماتی سرگرمی پورے قبیلے کے لیے آفت و پریشانی کی موجب بھی ہو سکتی ہے لہٰذا توتمی معاشرت میں ٹیبو کا تفاعل بھی موجود ہوتا ہے۔ ایک طرف توتم قبیلے کی حفاظت کا واحد وسیلہ ہوتا ہے تو دوسری طرف یہی اس کی تباہی کا مرکزی محور بھی ہوتا ہے:



The totem is the comman ancestor of the clan; at the same time it is their guardian spirit and helper, which sends them oracles and, if dangerous to others, recognizes and spares its own children. Conversely, the clansmen are under a sacred obligation (subject to automatic sanctions) not to kill or destroy their totem and to avoid eating its flesh (or deriving benefit from it in other ways). The totemic character is inherent not in some individual animal or entity, but in all the individuals of a given class.

[Sigmund Freud: *Totem and Taboo,* p:3]

ترجمہ: توتم کسی قبیلے کا ایک مشترک جدامجد ہوتا ہے۔ ایک ہی وقت میں یہ ان کی آبائی روح اور مددگار ہوتا ہے جو کہ الہام بھیجتا ہے اور ساتھ ہی اگر یہ دوسروں کے لیے خطرناک ہے تو اپنے قبیلے والوں کو پہچان کر ان پر رحم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف قبیلے والے ایک مقدس فرض (جو کہ خود بہ خود لاگو ہو جاتے ہیں) سے بندھے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے توتم کو نہ تو قتل کریں اور نہ ہی تباہ۔ اس کے ساتھ ہی اس کا گوشت کھانے سے بھی پرہیز کریں (اور توتم سے کسی قسم کے دوسرے فائدے بھی نہیں اٹھانے ہیں)۔ توتمی کردار اپنے آپ میں کسی مفرد/ خاص جانور یا کسی دوسری چیز میں موجود نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ اس قبیلے کے ہر افراد میں داخل ہوتا ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو مارگیر کے پاس جب تک زہر مہرہ تھا وہ حرارت، حرکت اور بے خوفی کے احساس سے مملو تھا۔ بیانیہ میں اس کا ظہور ایک دیوہیکل شخص سے مماثل نظر آتا ہے اور اس کی اساسی وجہ یہ ہے کہ زہر مہرہ یعنی مارگیر کا توتم اسے مسلسل توانائی اور قوت عطا کرتا رہتا ہے اور اس کے روحانی ترفع سے کلی طور پر مربوط نظر آتا ہے لیکن جیسے ہی مارگیر کا توتم یعنی زہر مہرہ غائب ہوتا ہے یا اس کے توتم کی موت واقع ہوتی ہے، اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اس کے نفسی عوامل کی وضاحت کے لیے نیر مسعود نے جو بیانیہ گڑھا ہے اس کی تفصیل میں توتم اور انسان کے درمیان کا روحانی، مابعد الطبیعیاتی ارتباط اپنی پوری تجمیل میں اجاگر ہوا ہے:

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ مردہ سانپ چٹائی پر اسی طرح بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔ اس کے پھن کا رخ البتہ ذرا سا بدل گیا تھا۔ میں نے مارگیر کی طرف دیکھا۔

اب میں تمھیں اطلاع دے رہا ہوں، مددگار، اس کے سرد ہاتھ نے
میرے ہاتھ کو جکڑ لیا، زہرمہرہ غائب ہے۔ [مارگیر]

زہرمہرہ کا غائب ہونا اور پھر مارگیر کی موت کا واقع ہو جانا بظاہر ایک سادہ سا واقعہ ہے لیکن توتمیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان میں غیر معمولی ربط ہے۔ اصل میں توتمی معاشرت میں توتم کے ساتھ فرد کا تعلق مادی اور وجودی دونوں سطحوں سے منسلک ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے غیاب میں جو اشارے موجود ہیں اس کی رو سے اس بات کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ توتم اگر توانائی دیتا ہے تو توانائی اور قوت کو معدوم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ تمام معاملات، انسانی سائیکی میں اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ توتم کی موت فرد کی موت کے مماثل ہوتی ہے۔ اس کی دوسری سطح یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مارگیر کی موت ایک طرف اس کی جسمانی موت تھی تو دوسری طرف اس کی تخلیقی موت کی ضامن بھی تھی۔ مارگیر کا وجود ہی اس کے زہرمہرے یعنی توتم کی موجودگی کی اساس پر قائم تھا لیکن اس کی غیر موجودگی نے اسے روحانی اور مادی سطح پر اس حد تک مضطرب کر دیا کہ موت ہی اس کے ذہنی انفجار کے اختتام کا آخری وسیلہ ثابت ہوئی۔ یوں توتم کی گمشدگی اس کے روح کو سلب کر لیتی ہے اور 'اسے چٹائی پر مرے ہوئے سانپ کی طرح پھیلا دیتی ہے۔'

مارگیر کے متن کی مکمل فضا سری اور دھند میں ملفوف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی متن نامانوس اور نامعلوم معاشرت/توتمی تہذیب میں متشکل ہوتا ہے تو اس کی فضا میں سریت کے عناصر لامحالہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قاری اپنے معاشرتی اور تہذیبی عرصے میں ہی قرأت کے آداب وضع کرتا ہے۔ لیکن متن اس کے لیے تب معمہ بن جاتا ہے جب فن کار ایک ایسے منطقے کی روداد بیان کرتا ہے جو قاری کے لیے نامانوس ہوتے ہیں۔ مارگیر کی فضا بھی کہر میں لپٹی ہوئی دھند کے مانند ہے۔ جہاں صاف صاف کچھ واضح نہیں اور تمام احوال و کردار بیانیہ کے اسرار و دھند میں ملفوف ہیں۔ اردو قاری کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ جس نوع کے متون سے برسرِ پیکار رہتا ہے ان کی فضا عموماً اس کی جانی پہچانی ہوتی ہیں۔ اگر کبھی کبھی ـــــ بازگوئی ـــــ جیسی تخلیق سے اس کا واسطہ پڑتا ہے تو بھی اس کی اسطوری فضا میں نامانوسیت کا وہ احساس پیدا نہیں ہو پاتا جو 'مارگیر' کے بیانیہ کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے پر قائم ہوتا ہے۔ اصل میں 'مارگیر' کا ثقافتی منطقہ توتمی معاشرت سے کلی طور پر وابستہ ہے اور اس کا لسانی صیغہ بھی اسی تناسب سے تعمیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ ہمارے لیے ایک نامانوس سی فضا کی تشکیل کرتا ہے۔ جس میں چاروں طرف دھند اور اسرار کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جیسے ہی قاری اس دھند اور اسرار میں داخل ہوتا ہے، کھو جاتا ہے اور بے صبری کے ساتھ اس کے چھٹنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ نیر مسعود کا اسالیب بیان اس سری فضا کو مکمل طور پر



قائم رکھتا ہے یوں ہم اس دھند کے حصار سے باہر نکلنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ نیر مسعود کے بیانیہ کی تعبیر میں توتمی معاشرت کے احوال و کردار کو قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے؟ معاملہ یہ ہے کہ افسانے کے منجمد اور فرسودہ قواعد کے برخلاف نیر مسعود نے کہانیہ/افسانے کے ایک نئے اجتہادی پیٹرن کو خلق کیا ہے اور ایک ایسے سانچے کی دریافت کی ہے جو اپنی وضعیاتی شریانوں میں زندگی کے بھید بھرے احساس کو نمایاں کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں نیر مسعود کی ماضی پرستی ایک تخلیقی موقف کے طور پر اپنے کردار کی اناٹومی کو انگیز کرتی ہے۔ لیکن ماضی پرستی کا یہ قوی احساس منفیت، یاسیت اور ناامیدی کے انسلاکات کو کلی طور پر مسترد کرتا ہے اور ان کی تخلیقی واردات کو توتمی معاشرت میں ملفوف کر کے بیانیہ پیٹرن میں سجا دیتا ہے۔ ان سے قبل اس نوع کا تخلیقی تجربہ خال خال ہی اردو کی افسانوی روایت میں نظر آتا ہے۔ ہاں میراجی کی تخلیقی سرگرمیوں میں اس کا انکشاف مسلسل اور متواتر ہوا ہے اور جب ہم اسے میراجی کی تخلیقی اناٹومی میں توڑتے ہیں تو نیر مسعود کی کہانیہ ساخت حضرت انسان کی سرشت میں توتمی معاشرت کی تفریدی اور اجتماعی سائیکی کا سراغ دیتی ہے:

> زندگی کی ہر قدر، دن اور رات کی گردش سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے نور اور تاریکی ہی کا ایک پرتو بن گئی ہے مگر اس کے باوجود ہم گزرے زمانے کے خیالوں میں لذت حاصل کرتے ہیں..... گزرا ہوا زمانہ، ماضی..... جو ایک دھندلکا ہے، ایک ایسا دھندلکا جو انفرادیت کے دائرے سے آگے بڑھ کر تیرگی کا ایک گہرا عکس بن جاتا ہے..... [بحوالہ شعور: بلراج مین را (ترتیب) نئی دہلی: مارچ، ۱۹۷۸، ص: ۲۲]

تیرگی کے جس داخلی سوندریہ کی کہانی میراجی سناتے ہیں اسے اپنے بیانیہ میں نیر مسعود نے نہ صرف توڑا ہے بلکہ اس کی سائیکی کا بھی اکتشاف کیا ہے۔ 'مارگیر' کی توتمی ساخت میں ماضی اور دھندلکے کی مکمل فضا کا Visualisation ہوا ہے جو اپنے تمام متعلقات و مضمرات میں زندگی، کائنات اور انسان کی تثلیث کے اندرونی اور غائب شدہ کڑیوں کا تدارک بھی کرتی ہے۔ تدارک کی اس منطق میں نام نہاد مہذب سماج کی تعقل پسندی کی شدت کو غائب رکھا گیا ہے۔ اسی لیے نیر مسعود کے یہاں زمان و مکان کا واضح احساس اور اس کا کوئی بھی انسلاک و بُعد معدوم نظر آتا ہے۔

وارث علوی نے نیر مسعود کے بیانیہ کی ابہامی کیفیت کو انگیز کرتے ہوئے اس نوع کی رائے مرتب کی ہے:

> نیر مسعود کے افسانے بہت دلچسپ ہیں، کوئی گنجلک اور پیچیدگی

نہیں۔کوئی اشکال نہیں۔آپ افسانہ کی دنیا میں گھوم پھر کر واپس آ جایئے۔آپ کی حالت اس گونگے کی سی ہوگی جس نے گڑ کھایا۔یہ ابہام کی معراج ہے۔

[وارث علوی:افسانہ تشریح کے چند مسائل،نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،ص:۱۱]

وارث علوی سے اجتناب برتتے ہوئے محض اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ نیر مسعود کے بیانیہ کے اسرار و دھند کے اندر جا کر اس ساخت کو تلاش کرنا ہوگا جو ان کے متن کا محور و منبع ہے، جسے اپنی بساط بھر ہم نے کھولنے کی کوشش کی ہے۔لیکن جب تک اس نوع کے مطالعے کو ان کی مکمل تخلیقات کی ضمن میں کسی حد تک تھیوریا نہ لیا جائے تب تک ہمارے لیے نیر مسعود کے بیانیہ معمہ ہی رہیں گے اور اگر اس بیانیاتی معمے کو تھوڑا بہت حل کر بھی لیا گیا تو وہ ہمارے لیے واہمہ/فریب خیال کا قالب اختیار کر لیں گے کہ نیر مسعود کے بیانیہ متن کا کردار اسی نوع کا ہے۔یوں ان کے بیانیہ کی خالص شعریات کی تلاش ہمارے لیے مانوس خوشبو کے مانند ہوگی جسے ہم سونگھ سکتے ہیں،احساس کی سطح پر بھی اس سے معاملہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسے مکمل طور پر گرفت میں لینا،اس کی شناخت متعین کرنا ہمارے لیے کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ بیانیہ کا یہی اوجھل کردار ہی ان کے فن کی شعریات تشکیل کرتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Assistant Professor &
In-chargeDepartment of Urdu, Hindu College
Station Road, Moradabad, U.P. 244001
Mob: 7060934642


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب:تتلیوں کے رنگ | | نام کتاب: یہی کو لکا تا ہے! |
| صنف:افسانے | | صنف:نظم |
| مصنف:عثمانہ اختر جمال | | مصنف:ڈاکٹر امام اعظم |
| سن اشاعت:۲۰۲۳ء | | سن اشاعت:۲۰۲۳ء |
| صفحات:۳۷۰ | | صفحات:۴۳۲ |
| قیمت:۳۰۰/روپئے | | قیمت:۵۰۰/روپئے |
| ملنے کا پتہ: | | ملنے کا پتہ: |
| عرشیہ پبلی کیشنز،دہلی ۹۵ | | ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس،دہلی |




● ڈاکٹر سرفراز احمد خاں

# جدید انقلابی افکار کا منفرد شاعر:علی سردار جعفری

کوئے قاتل میں بھی ایک جرأت اظہار کا رنگ　　تو نے بدلا نہ کبھی حق کے پرستار کا رنگ
فیض کا جوش کا اقبال کے اشعار کا رنگ　　سب میں،اور سب سے جدا ہے علی سردار کا رنگ

علی سردار جعفری کا شمار اردو ادب کے اس عظیم فن کار میں ہوتا ہے جو بیک وقت نہ صرف ایک مایہ ناز ادیب،خطیب،شاعر،افسانہ نویس اور ڈراما نگار تھے بلکہ جسکی شخصیت برصغیر ہند و پاک میں مہتاج تعارف نہیں۔علی سردار بلرام پور کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں،جہاں کی ایک عالی شان حویلی میں ان کی پیدائش ہوئی۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد کسی قریبی مدرسہ میں انہیں داخل کرایا گیا۔جہاں انہوں نے دینی تعلیم کے علاوہ گلستان و بوستان وغیرہ پڑھی۔مگر بہت جلد یہاں کے مقامی اسکول میں داخلہ لیا اور ہائی اسکول میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کر کے ۱۹۳۳ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ان کی ابتدائی تعلیم سے علی گڑھ کا سفر کافی کرب آمیز رہا۔

علی سردار جعفری کا عہد بہت پر آشوب تھا اور اس عہد میں ہندوستان میں سماجی و سیاسی سطح پر بہت سی اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔اندرونی ہنگاموں اور مطالبات آزادی نے شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔اردو شعر و ادب کے ذریعہ جن قلم کاروں نیا پنے فن میں باغیانہ خیالات کا اظہار کیا ان میں مجاز،ساحر، فیض،خواجہ احمد عباس،کیفی اعظمی سجاد ظہیر،جذبی،مخدوم،سردار جعفری،کرشن چندر، ،جاں نثار اختر،خلیل الرحمن وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔انقلابی خیالات اور ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے می خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ٹیگور اور اقبال،پریم چند اور عبدالحق،جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو،آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نارائن جیسے عالموں اور ادیبوں اور سیاست دانوں نے اس تحریک کے مقاصد کو لبیک کہا اور ہر طرح سے ان کی ہمت افزائی کی۔ہر شہر اور ہر علاقہ میں نوجوان ادیب اس رجحان سے متاثر ہو رہے تھے اور ان کے تحریروں میں ایک نیا شعور اور نیا احساس جنم لے رہا تھا۔بنگالی زبان کے مشہور ماہنامہ ''پریچے'' نے اپنی

زبان کے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور نظموں کو خاص طور پر جگہ دینی شروع کی۔ حیات اللہ انصاری نے کانگریس کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار ''ہندوستان'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ جس میں ترقی پسند تحریک کی کانفرنسوں کی روئداد اور تقریروں کے علاوہ نئے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات بھی شائع ہونے لگیں۔''(۱)

اس تحریک نے ایک عہد ساز رول ادا کیا۔ زبان وادب میں ہندوستان کی وہ فرسودہ روایات جو مذہب اور رسومات کے سہارے پروان چڑھ رہی تھی، ترقی پسندوں کے زیر اثر ادباو شعراء کی نگارشات کے ذریعہ تقریباً خاتمہ کی طرف تھی اور پھر ایک نئی روایت کا آغاز ہوا جس نے شعور کی رو بدل دی۔ اگر چہ اس تحریک کی مخالفت بھی کی گئی۔ ان اعتراضات پر علی سردار جعفری کہتے ہیں۔

''ترقی پسند تحریک اور ادب پر اعتراضات پہلے بھی ہوتے تھے آج بھی ہوتے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ لیکن اس زمانے میں اعتراضات کا انداز بدل گیا ہے۔ خواہ وہ فن کے نام کیے جاتے ہوں یا ہنگامی موضوعات کے نام پر لیکن بار بار جو اعتراضات دہرایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے موضوعات پہلے سے طے شدہ ہیں اور طے شدہ موضوعات پر اچھا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اعتراضات اس لیے بے معنی ہیں کہ اس میں تاریخی بصیرت کی کمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب کے موضوعات ساری دنیا اور ہر زمانے میں اور ہر زبان میں پہلے سے طے شدہ ہیں''۔(۲)

اس قول میں ایک حد تک صداقت بھی ہے کیونکہ ان کی یہ وابستگی نہ صرف ترقی پسند شعر وادب ہی تک رہی بلکہ انہوں نے کمزوروں اور مزدوروں کی حمایت میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کا عملی مظاہرہ، جوان کے مضبوط عقیدے اور مربوط اعتماد کو نمایاں کرتا ہے۔ ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اور جس دور میں ان کے شعور کی آنکھ نے بصیرت عطا کی اس میں اس قسم کا میلان ورجحان کچھ تعجب خیز بھی نہیں تھا۔ بیسویں صدی کا یہ وہ دور ہے جب ہر جانب انقلاب کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کو متحد کرنے کی کوششیں تیز تر ہو رہی تھیں۔ خواتین کی بیداری اور انہیں با اختیار بنانے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ذرائع ترسیل وابلاغ کی مقبولیت کے سبب، دنیا کے انقلابات کے اثرات ہندوستانی سماج اور سوسائٹی پر مرتب ہو رہے تھے بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب ایک نئے انقلاب کی آمد آمد ہے۔ ہر چند کہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کی سازشیں بھی عروج پر تھیں۔ عدل وانصاف کا حصول دشوار ہی نظر آ رہا تھا۔ ایسے پر آشوب ماحول میں علی سردار کی شخصیت کی تشکیل وتعمیر ہوئی جسکی وجہ سے انکی شخصیت میں ہمیں ایک خاص کشش نظر آتی ہے۔

سردار جعفری کی تصانیف کی تعداد کافی طویل ہے۔ پہلا مجموعہ کلام ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ''امن کا ستارہ''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''خون کی لکیر''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب''، ''پیراہن



شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' وغیرہ، طویل اور مختصر نظموں کے مجموعے ہیں۔ تنقیدی بصیرت اور سیاسی شعور کے حوالے کے لیے ''ترقی پسند ادب'' ان کی اہم کتاب ہے۔ جلیاں والا باغ ایسا سانحہ تھا جسکا اثر انکے دل پر کافی ہوا۔ اس لیے انکی ابتدائی نظموں میں سیاسی عنصر نظر آتا ہے۔ ''پرواز'' انکا پہلا شعری مجموعہ ہے جو حیدر آباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ''مزدور لڑکیاں''، ''سرمایہ دار لڑکیاں''، ''اشتراکی''، ''ارتقا اور انقلاب''، ''جنگ اور انقلاب''، ''انقلاب روس''، جیسی سیاسی نظمیں ہیں۔ ان نظموں مین ہمیں انقلابی جوش اور شدت پسندی کا عنصر نظر آتا ہے۔

ادبی صحافت کے میدان میں انہوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دئے۔ لکھنؤ سے ۱۹۳۶ء میں ایک رسالہ ''نیا ادب'' کے نام سے جاری کیا۔ پھر سہ ماہی رسالہ ''گفتگو'' ۱۹۶۷ء میں بمبئی سے شائع کیا۔ یہ رسالہ ترقی پسند نظریات کا علم بردار تھا۔ بمبئی ہی میں علی سردار جعفری کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''قومی جنگ'' سے وابستہ ہو گئے جس کے ایڈیٹر سجاد ظہیر تھے۔

انکی تمام تصانیف مین کم وبیش غلامی، اسیری، اور استحصال کا موضوع ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ انکی شاعری کو پڑھ کر قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی دنیا کے طلبگار ہیں جہاں مساوات ودوستی ہو اور ترقی پسند تحریک کا مقصد بھی ایک غیر طبقاتی نظام اور معاشرے کی تشکیل تھا چنانچہ اس مقصد کے تحت اردو شاعری میں انقلاب پسندی اور حقیقت نگاری کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ انقلاب پسندی کے زیر اثر شاعری میں ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئیں جس میں بغاوت کا پیغام دیا گیا، مجاز کی نظم ''انقلاب''، جاں نثار کی نظم ''ساقی''، جذبی کی نظم ''دعوت انقلاب'' وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ جن موضوعات کو علی سردار جعفری نے اپنی تخلیقات میں برتا ان میں فاشزم کی مخالفت، اشتراکی نظام کی حمایت، انقلاب کا خیر مقدم، امن پسندی، آزادی، انقلاب، بغاوت، سرمایہ داری کی مخالفت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سردار جعفری کی کئی نظموں میں انقلاب اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ غربت، افلاس، بھوک، ظلم وستم، بغاوت، غلامی، آزادی خواب امن وغیرہ جیسے موضوعات کی عکاسی ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی چند نظموں کے مطالعہ سے ان کے شعری مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے:

رخ حیات کو بخشی تجلیاں تونے — بکھیر دی ہیں فضاؤں ں سرخیاں تونے
شگاف ڈال دیا تاج شہریاری میں — گرائیں ظلم کے خرمن پے بجلیاں تونے
نئے زمان و مکاں، انقلاب زندہ باد — نئی ہے عمر رواں انقلاب زندہ باد
دمک رہی ہے فضائیں انقلاب زندہ باد — بلند شعلۂ جاں انقلاب زندہ باد

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے عوامی زندگی کی پریشانیوں کو اپنے فن کا محور بنایا زندگی کے مسائل کو آئنہ دکھایا اور ہماری سماجی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جو ناہمواریاں ہیں ان کی

طرف اشارے کیے اور جاگیرداری نظام اور غلامی پر کڑی نقطہ چینی کی۔ ایک نظم وہ اکثر مشاعرہ میں سناتے تھے جسکا عنوان ہے ''نوالہ''؛ کیا خوبصورت چھوٹی سی نظم ہے اور معاشرے پر کیسا تیکھا طنز ہے :

ماں ہے ریشم کے کار خانے میں　　باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کے جب سے نکلا ہے　　بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا　　کارخانوں کے کام آئے گا

اس وقت وہ نظم جو ہندوستان پاکستان دوستی کے پس منظر میں لکھی گئی تھی بڑی مقبول ہوئی تھی۔ موجودہ تناظر میں اس نظم کی اہمیت بہت ہی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بند صرف ہند و پاک کے لئے دوستی کا پیغام نہیں بلکہ پورے عالم کے لئے امن کا پیغام ہے:

تم آو گلشن لاہور سے چمن بردوش　　ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لیکر
ہمالیہ کی ہواوں کی تازگی لیکر　　اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

سردار جعفری نے اپنی انقلابی شاعری کے ذریعے افسردگی مایوسی اور زندگی کی کشمکش کو کم کرنا چاہا اور مستقبل کے لئے کچھ ایسے خواب دیکھے جہاں مفلسی، تشنگی، جبر و استحصال، فسادات اور جنگ کا عنصر نہ ہو اور ایسی دنیا کی تشکیل ہو جہاں جابر حکمران معصوم لوگوں کے حقوق پامال نہ کریں اور ہر طرف امن و آشتی ہو، محبت ہو قوس وقزح کا رنگ ہو۔ انکی شاعری میں زندگی کا حسن اور زندگی کے تسلسل پر ایقان اور اعلی انسانی قدروں پر ان کا ایمان ایسی میراث ہے جس کی وجہ سے تاریخ کے اوراق پر انکا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائیگا۔

◂◂ ● ▸▸

**حواشی:**

۱۔ ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص، ۸۵، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲
۲۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، مرتبہ، قمر رئیس، عاشور کاظمی، ص، ۶۴، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، نئی دھلی، ۱۹۹۴ء
۳۔ افکار کراچی، سردار جعفری نمبر، نومبر- دسمبر ۱۹۹۱
۴۔ سردار جعفری نمبر، ایوان اردو، دہلی، ستمبر- ۲۰۰۰، ص-۱۴

◂◂ ● ▸▸

Asst: Professor
Dept: of Persian
504/122 Tagore Marg MANUU
Luckhnow Campus, Lucknow -226020



● ڈاکٹر امام اعظم

# اردو زبان کا بدلتا منظر نامہ اور صحافت

اردو صحافت کی ابتدا انیسویں صدی سے ہوتی ہے۔ صحافت کو پہلے تجارت کی بجائے عبادت کا درجہ دیا جاتا تھا اور اس سے مذہبی، سماجی اصلاح اور ترقی کے علاوہ ملک کی آزادی اور برطانوی سامراج کی غلامی سے نجات دلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ اردو صحافت کا جب ہم ارتقائی جائزہ لیتے ہیں تو ''جام جہاں نما'' (ایڈیٹر: سدا سکھ لال) اور ''دہلی اردو اخبار'' (مدیر: مولوی محمد باقر) وغیرہ کے بعد منشی نول کشور، منشی محبوب عالم، سرسیّد احمد خاں، عبدالحلیم شرر، تاجور نجیب آبادی، منشی سجاد حسین، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، راشد الخیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا محمد علی جوہر، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، اعجاز صدیقی، شاہد احمد دہلوی، محمد طفیل، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری وغیرہ اردو کے ایسے نامور صحافی گذرے ہیں جو صحافت کے ساتھ زبان و ادب کے کسی اور شعبے میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ اس زمانے میں اکبرالہ آبادی کا یہ شعر صحافت کے ضمن میں بے حد مشہور ہوا تھا:

کھینچو نہ کمانوں کو ، نہ تلوار نکالو　　جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں بیشتر بلند پایہ ادبا و شعرا صحافت کے میدان کے شہسوار بھی ہوا کرتے تھے اور اُن کی صحافت بامقصد ہوا کرتی تھی۔ پیشہ ورانہ صحافت کا تصور نہیں تھا بلکہ قوم و ملت کے مسائل کی نشاندہی اور ترقی و ترویج کی فکر اُس وقت کے صحافیوں کو مقصود تھی۔ انور غازی اپنے فیس بک پیج پر موجود مضمون ''صحافت اور ادب میں فرق جانیے'' میں لکھتے ہیں:

''اُس وقت صحافی اور رائٹر وہی بنتا تھا جو ادیب اور انشا پرداز ہوتا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ادب اور صحافت کے قاری میں کوئی فرق نہ تھا۔ صحافت کا قاری آسانی کے ساتھ ادبی تحریر بھی سمجھ لیتا تھا۔ اس وقت صحافت یعنی جرنلزم علیحدہ اور جداگانہ پیشے کے طور پر متعارف نہ ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اخبارات ایک ملکی اور قومی مشن کی حیثیت رکھتے تھے اور زیادہ تر اخبارات اور جرائد انفرادی صحافت (Solo Journalism) یعنی ایک شخص کی کارکردگی کے نمونہ اور آئینہ دار تھے۔ صحافی جو اس وقت ادیب ہی ہوا کرتے تھے، اپنی سوچ اور خیالات کو بڑے منظّم اور خوبصورت انداز میں قارئین تک پہنچاتے تھے۔''

عام طور پر واقعات، حقائق اور خیالات پر مبنی خبروں کے تجزیے اور ترسیل کو صحافت کہا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں صحافیوں کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ابتدائی دور میں صحافت مشن ہوا کرتی تھی۔ اس بات کو اردو کا ہر صحافی تسلیم کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس دور کی صحافت اور موجودہ صحافت میں زمین آسمان کا فرق آ چکا ہے۔ بزرگ اردو صحافی محمد وسیم الحق (مدیرِ اعلیٰ، روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا) کلاسیکی صحافت کی بنیادی تعریف کرتے ہوئے ایک فرض شناس اخبار اور اس سے منسلک صحافیوں کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں اپنی رائے کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''.....اخبار خبر کی جمع ہے یعنی کوئی اخبار اپنے قاری کو ساری دنیا، اپنے ملک اور اپنے علاقے کی تازہ خبروں سے واقف کراتا ہے۔ کلاسیکی صحافت کی تعریف یہ ہے کہ خبروں کو بے کم و کاست اُن کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے۔ اس میں نمک مرچ نہ لگایا جائے۔ تبصرہ اور تنقید کے لیے ادارتی کالم یعنی اداریہ مخصوص ہے۔.....اخبار محض خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے قاری کی ذہنی اور فکری آبیاری بھی کرتا ہے۔ اگر کسی معاملہ میں قوم بے حس ہو رہی ہو تو مدیر کا قلم انہیں کوڑے لگا کر حرکت کے لیے مہمیز کرتا ہے اور اگر قوم کسی بات پر اشتعال میں آجائے تو ایڈیٹر کا قلم اُس پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے۔ اگر کوئی اخبار ایسا کر سکا تو گویا اُس نے صحافت کا حق ادا کر دیا۔''

گذشتہ صدی میں سائنس اور تکنالوجی جہاں ہر شعبہ ہائے حیات میں داخل ہوئے وہیں میڈیا بھی اس سے دور نہیں رہا۔ انٹرنیٹ اور اطلاعاتی تکنالوجی کے عمل دخل سے جہاں دوسری زبانوں کی صحافت بامِ عروج کو پہنچ گئی ہے، وہیں اردو صحافت بھی اس تکنالوجی سے اپنا حصہ بخوبی حاصل کر رہی ہے۔ مسطروں پر لکھنے والے کاتبوں کا زمانہ ختم ہو گیا، اب تو صرف کمپوزنگ اور ڈیزائننگ سے اخبارات ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتابت کے ساتھ طباعت کے شعبے کے لئے بھی یہ تکنالوجی انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ ترقی کی ان سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے صحافت موجودہ سماج اور معاشرے کا جزوِ لازم بن گئی ہے۔ اسی لیے اب صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ عارف عزیز (بھوپال) اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''صحافت کی اس تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر اس کو حکمرانی کے چوتھے ستون کا درجہ دیا گیا ہے۔ بالخصوص جمہوری نظام میں مقنّنہ یعنی قانون سازی، عدلیہ یعنی انصاف اور انتظامیہ یعنی نوکر شاہی کے بعد چوتھی طاقت کی حیثیت سے اگر کسی کو تسلیم کیا جاتا ہے، تو وہ صحافت ہے اور اسی لیے ہر جمہوری نظام میں اخبارات کی اہمیت اور جمہوریت کی بقاء و استحکام میں ان کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' (مضمون ''صحافت، انسانیت کی خدمت کا سب سے موثر ذریعہ'' روزنامہ ''عکاس'' کولکاتا ۷ دسمبر ۲۰۱۵ء)



جب کہ انور غازی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''آسان الفاظ میں معیار کا مفہوم یہ ہے کہ صحافتی تحریروں میں کم از کم تین بنیادی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ (۱) معلومات، (۲) اسلوب، (۳) تناظر۔ صحافت ایک ایسا شعبہ ہے جس کا بنیادی کام معلومات فراہم کرنا ہے، چنانچہ صحافتی تحریروں میں اور کچھ نہیں تو کم از کم معلومات ضرور ہونی چاہئیں۔ مثال کے طور پر اگر لکھنے والا علامہ اقبال یا کسی اور شخصیت کے یومِ پیدائش یا یومِ وفات کے موقع پر کچھ لکھ رہا ہے تو اسے ان شخصیات کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنی چاہئیں۔ یہ معلومات اگر نئی ہوں تو اس تحریر میں ایک کشش پیدا ہو جائے گی۔''

صحافت کے تعلق سے دانشوروں کی رائے کا اجمال یہ ہے کہ یہ قابلِ اعتماد، پرقوت، عوام کی رہنمائی کا ذریعہ اور رائے عامہ ہموار کرنے کا ایک وسیلہ ہے اس لیے اسے جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ ملک و ملّت کی فلاح و بہبود کے اہم کام لئے گئے ہیں۔ ملک کے مختلف خطوں میں صحافت کے ذریعہ عوام کی رہنمائی اور دوسرے کارناموں کی تاریخ موجود ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو اخبارات کی طباعت و اشاعت کے تکنیکی اور کاروباری معاملات میں تبدیلی کے ساتھ صحافت کی زبان بھی زمان و مکان کے تغیر کے ساتھ بدل رہی ہے۔ جدید تکنالوجی، تجارتی امور اور صحافیوں کی زبان و ادب سے بے اعتنائی اس کی بنیادی وجوہات ہیں۔

نوجوان قلم کار ڈاکٹر عائشہ فاطمہ اپنے بلاگ میں شامل مضمون ''صحافتی زبان کا اسلوب و خصوصیات'' میں اس سلسلے میں لکھتی ہیں:

''خیالات احساسات اور علم و شعور کا اظہار زبان سے ہوتا ہے۔ یہ ابلاغ کا پہلا وسیلہ ہے۔ صحافت کا دار و مدار اسی وسیلے پر ہے۔ بہترین ابلاغ کے لیے ضروری ہے کہ زبان کو اس کے بہترین طریقے سے استعمال کیا جائے۔ صحیح مفہوم کے لیے صحیح لفظ اور صحیح جملے کا استعمال صحافتی تحریروں کی بنیادی کڑی ہے۔ جس طرح ہر تحریر ادب پارہ نہیں بن سکتی اسی طرح ہر تحریر صحافت کے زمرے میں نہیں آسکتی۔ اگرچہ اخبارات اور رسائل میں ہر قسم کا مواد شائع ہوتا ہے لیکن اس میں سے ہر مواد کو ہم صحافتی مواد نہیں ٹھہرا سکتے۔ صحافتی زبان مخصوص انداز کی حامل ہوتی ہے.....اگر تحریر میں واقعیت موجود نہیں ہے اور محض تخیلات اور تاثرات یا علمی فضائل کا اظہار کر رہی ہے تو اسے ہم صحافتی تحریر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح چونکہ صحافت کا تعلق عام قارئین سے ہے اس لیے اسے ہر قسم کے ابہام، تصنع اور بناوٹ سے پاک ہونا چاہیے۔ گویا ہم صحافتی زبان کی تعریف یوں کر سکتے ہیں: ''سلیس زبان میں ایسی تحریر پیش کرنا جو واقعیت پر مبنی ہو، جو ہر قسم کے ابہام اور تکرارِ لفظی سے پاک ہو اور جس میں انفرادی رائے کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔''.....(ڈاکٹر عائشہ فاطمہ کا بلاگ)

"https//:www.learnwithayeshaafatima.online"

گویا سادگی اور سلاست صحافتی زبان کے بنیادی اوصاف ہیں۔ اس کا مخاطب عام قاری ہوتا ہے۔ اس میں ادبیت اور لفاظی بھی نہیں ملتی۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے صحافتی لسانیات یعنی ذرائع ابلاغ کی زبان پر بھی علمی وادبی مباحث دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ صحافتی لسانیات دراصل مختلف ذرائع ابلاغ میں زبان کے عملی استعمال کا مطالعہ ہے۔ ہندوستان میں بالعموم صحافت اور بالخصوص اردو صحافت کی عمر تقریباً دوصدی یا اس سے کچھ زیادہ ہے۔ اس طویل عرصے میں صحافت کی زبان میں تبدیلی آنا معمولی اور فطری امر ہے۔

ایک اہم نکتہ جو اس سلسلے میں قابلِ غور ہے کہ اب عام اردو لسانی آبادی معرب اور مفرس زبان کے استعمال سے گریز کر رہی ہے۔ اردو والے عام بول چال میں ایسے الفاظ کا بکثرت استعمال کر رہے ہیں جو انگریزی اور ہندی کے علاوہ مقامی زبانوں کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہم موجودہ اردو اخبارات کی سرخیوں سے لے کر خبروں کے متن تک میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک سرخی پر اپنا تاثر پیش کرتے ہوئے کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''عرب ملکوں کے اخبارات اور نشریاتی اداروں نے امریکہ کی طرف سے اسرائیل کو مزید جنگی طیارے سپلائی کرنے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔''

''اخبارات'' بھی رائج ہے لیکن اردو طریقے سے جمع ''اخباروں'' بہتر ہے۔ عربی، فارسی قاعدوں سے جمع بنانے کا رجحان ثقالت کی طرف لے جاتا ہے، کیوں کہ باقی لفظ بھی ایسے ہی استعمال ہونے لگتے ہیں۔ ''نشرگاہوں'' کے بجائے ''نشریاتی ادارے'' کا استعمال بھی ضروری نہ تھا۔ سرخی اس طرح لکھی جاتی تو بہتر ہوتی:

''اسرائیل کو اور جنگی ہوائی جہاز دینے کے امریکی فیصلے پر عرب ملکوں کے اخباروں اور ریڈیو نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔'' (''اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان'' ص:۳۴۹)

اس سلسلے میں یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ تقریباً ایک سو برس قبل ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی زبان جسے آج بھی اردو صحافت کی معراج تسلیم کیا جاتا ہے، عصرِ حاضر کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتی ہے۔ مثال دیکھیے:

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاشِ زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ وتحسین کے نہیں بلکہ نفرت ودشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے



ہیں۔ دنیا کے زر وسیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا؟ اور پھر ایسے عقل فروشوں کو آپ کی اعانت فرمائیاں کیا نفع پہنچا سکیں گی؟

بدہ بشارتِ طوبیٰ کہ مرغِ ہمتِ ما　　براں درخت نشیند کہ بے ثمر باشد

(''الہلال'' جلد:۱، شمارہ:۳، صفحہ:۲)

دراصل مولانا کی انشاپردازی میں فرانسیسی ادب کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ فرانس میں انشاپرداز پہلے جب اپنی بات کہتا ہے تو اس کے یہاں الجھاؤ کی نشان دہی ملتی ہے جس کو عام فہم ذہن بہ آسانی نہیں سمجھ پاتا لیکن اس مرصع تحریر کو پھر وہ تحلیل کرتا ہے اور تحلیل کرتے کرتے پہلے اس کی معنوی ساخت کا تجزیہ کرتا ہے، پھر اس کے حجاب میں پوشیدہ تشکیک کے پردے الٹتا ہے پھر کسی محور یا مرکز پر گھومتا ہے اور آخر میں اسے اس مقام تک پہنچا دیتا ہے کہ قاری کا ذہن اس انشاپردازی کے سیلاب میں بہہ جائے اور اس کے مختلف اَبعاد کے بارے میں سوچتا ہے اور خود بھی اس میں شامل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

مولانا آزاد کی تحریروں کا اگر جائزہ لیں اور ان کی انشاپردازی پر غور کریں تو ہمیں وہی ساری کیفیتیں موجود ملیں گی جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ پہلا حصہ بہت ہی دقیق ہوتا ہے اور پھر اسے وہ سہل بناتے ہیں اور سہل بنانے کے بعد اس کی پرتیں الٹتے ہیں، مختلف زاویوں سے اسے دیکھتے ہیں اور ایک محور پر آکر اسے اتنا تحلیل کر دیتے ہیں کہ قاری محظوظ بھی ہوتا ہے اور اس کی دلچسپی میں اتنا اضافہ ہو جاتا کہ تحریر کو پڑھنے کے بعد بھی اس کا دماغ اور ذہن مکمل مسحور ہو جاتا ہے اور تحریر کی گہرائی اور علمیت کے ان پہلو؟ں کو اپنے طور پر مزید سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

بیسویں صدی سے پیچھے چلتے ہوئے انیسویں صدی میں جائیں اور ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے بھی ۷۰ برس پرانے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں جس میں عربی وفارسی تراکیب کی اس قدر کثرت ہے کہ خالص اردو کے دو چار الفاظ ڈھونڈے نہیں ملتے:

''ہر چند مضمونِ صداقت مشحون تولج اللیل فی النہار وتولج النہار فی اللیل اور مشاہدۂ روز مرہ آسمانِ بے ستون ونور وظلمتِ روز وشب وابر وباد وطلوع وغروب مہر وماہ وروئیدگی دانہ وگیاہ وبالیدگی اشجار واثمار وصحت ومرض انسان وموت وحیات ہر ذی روح وجان وغیر ہا اموراتِ بے پایان واسطے ثبوتِ قدرت واقتدار وجود ذی جود واجب الوجود کے شہدۂ عدلہ واسطے صاحبانِ ادراک وبصیرت وایقان وعرفان کے کافی ووافی ہیں۔.....'' (دہلی اردو اخبار، شمارہ: ۷ مئی ۱۸۵۷ء ؁)

انیسویں صدی کے دیگر اردو اخبارات کی اگر بات کی جائے تو اس زمانے میں انگریزی الفاظ کا

بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ دہلی اردو اخبار سے حد سے زیادہ معرب تحریر کا ایک نمونہ اوپر پیش کیا گیا لیکن اسی دہلی اردو اخبار کے ابتدائی دور میں انگریزی الفاظ کا بھی بے دریغ استعمال ہوتا تھا اور کیوں نہ ہوتا، انگریز اس وقت صاحبِ اقتدار تھے اور انگریزی نے دفتری زبان کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ مغلوں کے دور میں انتظامی، عدلیاتی، تعلیمی اور دیگر شعبوں میں استعمال کی جانے والی فارسی اور عربی روزمرہ اصطلاحیں ڈھیرے ڈھیرے انگریزی میں منتقل ہونے لگیں۔ اس کا اثر خبروں کی زبان پر بھی پڑا۔ بہرحال یہ ایک مثبت پہلو ہے کہ اردو زبان نے اس وقت بھی ان انگریزی لفظوں/ اصطلاحوں کو بخوبی اپنا لیا اور اردو والے بھی ان کا استعمال اپنی گفتگو میں کرنے لگے۔ ضمیر حسن دہلوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''خواجہ احمد فاروقی نے دہلی اردو اخبار کے چند ابتدائی پرچوں کا جائزہ لے کر انگریزی کے متعدد الفاظ جمع کیے ہیں جو انیسویں صدی کے وسط تک اردو زبان میں بے تکلف استعمال کیے جاتے تھے۔ ان میں سے چند یہ ہیں: ایجنٹ، مجسٹریٹ، ڈپٹی، سٹرٹیفکیٹ، پولیس، اسٹامپ، لیفٹیننٹ، روینو، نیشن، کلکٹر، سیشن اور ریذیڈنٹ وغیرہ وغیرہ۔ اردو میں ان الفاظ کے بے دریغ استعمال کیے جانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان اپنے تعمیری عہد میں دروازے کھلے رکھتی ہے اور عصری شعور کی ترجمانی کا فریضہ اسی وقت ادا کر سکتی ہے جب وہ ہر قسم کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر نئے افکار اور علمی پیش رفت کا ساتھ دے سکے۔......''

(مضمون ''زبان کے فروغ میں صحافیوں کا کردار'' مشمولہ کتاب: اردو صحافت مرتبہ: انور علی دہلوی ص: ۲۵۲-۲۵۳)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اردو صحافت کے ابتدائی دور میں نامور ادبا و شعرا ہی صحافی ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اس زمانے میں خبروں کی زبان آج کل کی طرح بالکل سادہ اور سپاٹ نہیں تھی بلکہ ان میں ادبی انداز بخوبی ملتا تھا۔ یہاں تک کہ اخباروں کے دیگر مشمولات مثلاً اداریے اور اشتہارات بھی مقفّیٰ مسجع عبارتوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ لکھنؤ سے شائع ہونے والے ایک اخبار ''سحر سامری'' کی ایک خبر کچھ اس طرح تھی:

''اِن دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانیِ خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے، آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی آہِ شرربار سے خرمنِ ماہ جل گیا۔''

(''سحر سامری'' نومبر ۱۸۵۶ء ؁ بحوالہ ''اردو صحافت کا ارتقا'' از: معصوم مرادآبادی ص: ۹۸)

اقتباساتِ بالا اس بات کا ثبوت پیش کرنے کے لیے کافی ہیں کہ زبان کے بدلتے پس منظر اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ اردو صحافت نے بھی خود کو بدلا ہے۔ یہ سلسلہ ''جامِ جہاں نما'' کے دور سے جاری ہے اور آگے بھی جاری رہے گا بلکہ اردو کے معاملے میں صحافیوں پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوگی جیسا کہ ممتاز اردو



صحافی احمد سعید ملیح آبادی کی رائے ہے:

''درس گاہوں میں اردو زبان کی تعلیم بند ہونے یا ناکافی ہونے کی وجہ سے اِدھر اردو صحافت کا معیار زبان اور ادب کے لحاظ سے گرتا جا رہا ہے۔ فی الحال اسے بچانے کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ اردو صحافی اپنے طور پر اردو ادب کا کثرت سے مطالعہ جاری رکھیں تاکہ ان کی تحریر کا رنگ اور حسن نکھرتا رہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کی تحریر پڑھنے والے اچھی اردو سیکھ سکیں۔ اردو زبان کو بگڑنے سے بچانے اور پھیلانے کی ذمہ داری اردو صحافیوں پر زیادہ آ پڑی ہے۔''

(کتاب: ''اکیسویں صدی میں اردو صحافت'' مرتب: ڈاکٹر امام اعظم فلیپ سے اقتباس)

اس سلسلے میں ایک نکتہ مزید پیش کیا جا سکتا ہے کہ طنز و مزاح سے عوام کو ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔ طنز و مزاح کی ہلکی پھلکی، شگفتہ اور سادہ زبان لوگوں کو متاثر کرتی آئی ہے۔ اردو صحافت کی زبان نے بھی اسی وقت سے کروٹ لینا شروع کر دیا جب اردو میں پہلے طنز و مزاح پر مبنی اخبار ''اودھ پنچ'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ''اودھ پنچ'' میں لکھنے والے قلم کاروں نے خواص کی زبان سے ہٹ کر عوام کی زبان میں صحیفہ نگاری شروع کی اور اس کا راست اثر صحافت کی زبان پر پڑا۔ اس ضمن میں آصف جیلانی اپنے مضمون ''اردو ادب اور صحافت'' میں رقم طراز ہیں:

''اردو میں طنز و مزاح کو جو فروغ حاصل ہوا، وہ خالص اردو صحافت کی دین ہے۔ اس صنف کا آغاز سرشار اور سجاد حسین سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنے مزاحیہ مضامین کی ابتدا ''اودھ پنچ'' سے کی۔ خود سجاد حسین اس زمانے میں ''اودھ پنچ'' کے ایڈیٹر تھے۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت ہجر، منشی احمد علی کسمنڈوی اور جوالا پرشاد برق اسی زمانہ کے نامور مزاح نگار تھے۔ بعد کے طنز و مزاح نگار رشید احمد صدیقی، ملا رموزی، پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی اور کنہیا لال کپور کتابی طنز و مزاح نگار ہیں۔ بعد کی مزاح نگار نسل میں چراغ حسن حسرت، ابراہیم جلیس، ابنِ انشا، نصر اللہ خان، مجید لاہوری، حاجی لق لق، فکر تونسوی، طفیل احمد جمالی اور عطاء الحق قاسمی وغیرہ ان سبھوں نے اردو صحافت کے ذریعہ اپنی تخلیقات کو جلا دی اور عوام تک پہنچایا۔ (ویب سائٹ)

http//:www.humsub.com.pk/3718/asif-jilani-3/

مختصراً یہ کہا جائے کہ اردو صحافت جو دو سو برسوں سے ہندوستان اور اب ساری دنیا میں پھیلی اردو بستیوں کے باشندوں کی علمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دیتی آ رہی ہے، اس کے معماروں یعنی صحافیوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بدلتے زمانے میں بدلتی تکنالوجی اور بدلتے امورِ تجارت و معیشت

کے ساتھ زبان کے بدلتے منظرنامے پر بھی نظر رکھنا ان کا فرضِ اولین ہے۔انہیں ترجیحی طور پر زبان کے نئے اور معاصر پس منظر کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا تبھی وہ عام اردو داں افراد کو اپنے حلقۂ قارئین میں شامل رکھ سکیں گے۔

◄◄ ● ►►

## حوالہ جات:


۱- روزنامہ ''عکاس'' (مدیر) کریم رضا مونگیری کولکاتا ۷ دسمبر ۲۰۱۵ء

۲- ''اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان'' کمال احمد صدیقی، ناشر: قومی اردو کونسل، نئی دہلی، اشاعت: ۱۹۹۸ء

۳- ہفتہ وار ''الہلال'' جلد:۱، شمارہ:۳ (مدیر) ابوالکلام آزاد کلکتہ شمارہ: ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء

۴- ہفت روزہ ''دہلی اردو اخبار''، شمارہ: ۷ مئی ۱۸۵۷ء (مدیر) محمد باقر شمارہ نمبر: ۲۰، جلد: ۱۹

۵- ''اردو صحافت'' مرتب: انور علی دہلوی ناشر: دہلی اردو اکاڈمی، دہلی اشاعت: ۱۹۸۷ء

۶- ''اردو صحافت کا ارتقا'' معصوم مرادآبادی ناشر: دہلی اردو اکاڈمی، دہلی اشاعت: ۲۰۱۳ء

۷- ''اکیسویں صدی میں اردو صحافت'' مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی اشاعت: ۲۰۱۶ء


◄◄ ● ►►


Regional Director (Maulana Azad National Urdu University)
Kolkata Regional Centre
1-A/1, Chatto Babu Lane, (Mohsen Hall),
3rd Floor Kolkata-41
Mobile : 08902496545 / 9431085816
Email: imazama96@gmail.com
Blog: drimazam.blogspot.com


'ایک اچھا افسانہ وہ ہے جس میں کوئی کہانی ہو
اور ایک اچھی کہانی وہ ہے جو افسانوی انداز میں لکھی گئی ہو'

**اقبال حسن آزاد**



● **محمد غالب نشتر**

# شاہد اختر کا افسانوی کینوس

''۱۹۹۰ء کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں اُن میں شاہد اختر اور خالد جاوید کے نام سب سے نمایاں ہے۔وہ بہت بہتر لکھ رہے ہیں۔'' (نیر مسعود)

شاہد اختر کی افسانہ نگاری کے حوالے سے پروفیسر نیر مسعود کا یہ جملہ معنی خیز ہے۔ایک چھوٹے سے جملے میں انھوں نے تین باتیں کہی ہیں:

[۱] شاہد اختر کا شمار نوے کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

[۲] اپنے عہد کے فکشن ادیبوں میں اُن کا نام سب سے نمایاں ہے۔

[۳] وہ بہت بہتر لکھ رہے ہیں یعنی اردو ادب کو اُن سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔

نیر مسعود نے شاہد اختر کے حوالے سے جن نکات کی طرف اشارے کیے ہیں، وہ ایک افسانہا فسانہ نگار کی بنیادی خوبی ہونی چاہیے۔گزشتہ تین دہائیوں سے جو افسانے لکھے جا رہے ہیں اُن میں موضوع سے زیادہ ہیئت کی قدر و قیمت ہے کیوں کہ موضوعات تو ہمارے اردگرد وہی ہیں البتہ اندازِ تحریر کسی بھی فنکار کو بڑا یا اہم بناتا ہے۔بیسویں صدی کے آخری عشرے میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کرنے اور نئی افسانوی فضا ہموار کرنے کی جد و جہد کی اُن میں شاہد اختر، خالد جاوید، احمد صغیر، صغیر رحمانی، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔اگر مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کا موازنہ اپنے ماقبل یعنی آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں سے کریں تو یہ بات واضح ہوگی کہ ہر عہد اور ہر قبیل کے فنکاروں نے اپنی شناخت قائم کرنے کی سعی مسلسل کی ہے۔آٹھویں دہائی کے فنکاروں (شموئل احمد، طارق چھتاری، شوکت حیات، حسین الحق، عبدالصمد، اقبال حسن آزاد، سید محمد اشرف، غضنفر، ذوقی) کے سامنے اپنی شناخت کا مسئلہ زیادہ اہم تھا کہ وہ جدیدیت سے مابعد جدید عہد میں داخل ہو رہے تھے اور افسانے میں کہانی کے عنصر کو داخل کرنے کی کامیاب کوششیں بھی کر رہے تھے اور وہ اس مشن میں کامیاب بھی ہوئے لیکن بیسویں صدی کے آخری عشرے کے فنکاروں کے لیے یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہو گیا کہ وہ اپنے ماقبل فعال فنکاروں کے ہوتے ہوئے کن بنیادوں کا خیال رکھیں اور علاحدہ پہچان بنائیں کیوں کہ اُن کا عہد بھی الگ تھا اور موضوع بھی۔نوے کے عشرے کے افسانہ نگاروں نے موضوعات کے حوالے سے بھی اور اسلوب کے حوالے سے بھی

اپنی علاحدہ شناخت قائم کرنے کی کامیاب کوششیں کیں جس کی واضح مثال شاہد اختر کے وہ افسانے ہیں جسے انھوں نے تیس سال کے عرصے میں سست رفتاری سے لکھے ہیں۔ تاہنوز اُن کے تین افسانوی مجموعے 'برف پر ننگے پاؤں' (۲۰۰۱ء) 'مونٹی' (۲۰۰۸ء) اور 'خوابگینے' (۲۰۱۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔

شاہد اختر کے کم وبیش چار درجن افسانوں کا یہ سفر مقدار کے لحاظ سے تو کم ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ اس دورانیے میں انھوں نے کئی اہم موضوعات پر افسانے رقم کیے۔ فکشن پر اُن کی نظر گہری ہے اور وہ خالص فکشن کے ادیب ہیں۔ افسانہ اور ناول اُن کا خاص میدان ہے۔ ہر فنکار میں تنقیدی شعور لازمی ہے لہٰذا کبھی کبھی قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے تنقید کی گلیوں کا طواف بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ ایسی صنف ہے جس پر حالیہ دنوں میں کئی فنکار طبع آزمائی کر رہے ہیں، ایسے میں خالص فنکار کی پہچان کافی دشوار کام ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک فنکار کی بیشتر یا تمام کہانیاں اعلیٰ درجے کی ہوں۔ اس مضمون میں شاہد اختر کی افسانوی کائنات پر ہلکی سی بات کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہد اختر کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ اُن کے افسانوں کا ایک اہم موضوع 'جنس' ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے کئی افسانے لکھے جن میں ٹکلا نواب، دو پیر کا گھوڑا، الرشیدان، سینٹر ٹیبل، گروگھنٹال، چھوٹے بڑے دائرے وغیرہ اہم ہیں۔ ہم جنسیت کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں ایک اہم افسانہ ''دو پاؤں کا گھوڑا'' ہے جس کا مرکزی کردار 'ببلو' زندگی میں کامیابی کی جتنی منازل طے کرتا ہے، اپنی نظروں میں اسی طرح گرتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایسے پیشے سے منسلک ہے جسے سماج میں معیوب کے ساتھ ذلت بھری نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ وہ ہم جنسیت کی طرف مائل ہے اور اسی پیشے کو اختیار کر کے گلف چلا جاتا ہے اور وہاں اُس وقت سرشار نظر آتا ہے جب ایک شیخ سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ بھی اسی قماش کا فرد ہے۔ کام ختم ہونے کے بعد جب شیخ اجرت دیتا ہے تو وہ پیسے لینے سے صاف منع کرتا ہے کہ وہ اپنی برادری والوں سے پیسے نہیں لیتا۔ شیخ کی حیرت زدگی اس افسانے کا انجام ہے۔ ہوموسیکس کے حوالے سے دو اور افسانے ''گروگھنٹال'' اور ''سینٹر ٹیبل'' اہم ہیں لیکن شاہد اختر کے افسانوں کا یہ مزاج نہیں ہے۔ انھوں نے جنس کے حوالے جو بھی لکھا، وہ سماج کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا اور اس میں کسی فن کار کی تقلید نہیں۔ جنس پر کوئی بھی فنکار افسانے لکھتا ہے تو قارئین، منٹو کی نقالی کا الزام تراشتے ہیں جب کہ ایسا نہیں۔ ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، شموئل احمد سے لے کر حالیہ دنوں میں لکھے جانے والے افسانوں کا یہی حال ہے۔ شاہد اختر نے جنس کو موضوع بنا کر افسانے ضرور لکھے ہیں لیکن اُن کے افسانوں کا یہ غالب رجحان نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک افسانہ ''مونٹی'' ہے جو جنسی جبلت اور اُس کے ردعمل کا افسانہ ہے۔ پروین اس



افسانے کا مرکزی کردار ہے جس کی شادی گھر کے ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے نہیں ہو پاتی ہے۔ بچپن میں جب وہ گڈے گڑیے کا کھیل کھیلتی تو شادی کی رسومات میں غایت درجہ دلچسپی لیتی لیکن ایک خاص عمر گزر جانے کے بعد وہ عجیب سی ذہنی الجھن میں گرفتار ہے اور اُسی ردعمل کے نتیجے میں مرغی پالتی ہے اور جب مرغی کڑک ہو جاتی ہے تو اُسے گھر سے نکلنے سے بھی منع کرتی ہے کہ کسی طرح مرغ سے ملاپ کے بعد وہ انڈے نہ دینے لگے۔ جنس ذی روح کی ایسی جبلت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ پروین کے اس ردعمل کے نتیجے میں مرغی کے اندر بھی احتجاج کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا اظہار وہ چونچ مار کر کرتی ہے اور دربے میں چلی جاتی ہے۔ اس کیفیت کو شاہد اختر نے بہترین طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی سے منسلک ایک اور افسانہ ''ربو'' بھی ہے جس کا مرکزی کردار طوائف ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی پیشے میں گزارا ہے۔ وہ کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتی البتہ یہ جذبہ اُس کے اندر موجود ہے۔ شاہد اختر نے اس افسانے میں 'ربو' کی داستان حیات اپنے منفرد انداز سے بیان کی ہے۔ افسانے کے آخر میں طوائف انتقام کے جذبے سے معمور ہے جب پولیس کا عملہ اُس پر زیادتی کرتے ہوئے جنسی استحصال بھی کرتا ہے تو خاموشی سے سب سہہ جاتی ہے لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'ایڈس' جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے اور انتقام کے جذبے سے سرشار ہو کر کسی بھی پولیس سے کچھ بھی نہیں کہتی۔ یہی افسانے کا انجام ہے کیوں کہ ہر مظلوم شخص کے اندر انتقام کا جذبہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتا ہے اور 'ربو' کا یہ عمل اس کے سکون قلب کا باعث ہے۔

مذکورہ افسانے ایسے تھے جن میں جنس کے عمل کا خاص دخل تھا کیوں کہ 'جنس' ہمارے سماج کا ناگزیر باب ہے، اس کے بغیر حسین زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ شاہد اختر نے سماج کے مسائل کو ہی افسانوں میں نمایاں کیا ہے۔ سماج میں پھیلی ہر طرح کی گندگی کو انھوں نے ابھارنے کی سعی کی ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ ''حساب'' کو ہی لیں۔ اس افسانے میں کہانی نویس نے غریب مظلوم خادمہ کی کہانی کو موضوع بناتے ہوئے کئی اہم سوالات قائم کیے ہیں۔ ملازمہ کی تئیں، راوی کا تجسس اس لیے بڑھتا ہے کہ وہ 'مردوالی' خصوصیات سے متصف ہے، اس کی باتوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دلچسپی جنسی نہیں ہے بلکہ دوسری طرح کی ہے۔ ملازمہ یعنی عائشہ کی باتوں سے راوی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ریاکاری برت رہی ہے اور تصنع سے کام لے رہی ہے اور حساب کتاب کے معاملے میں بھی کمزور ہے۔ ''حساب'' جو افسانے کا بنیادی نکتہ ہے۔ اُس کا پہلا مرحلہ ایسے وقت میں آتا ہے جب عائشہ کے بچے بھوکے ہوتے ہیں اور اُس کی ماں کے چہرے پر اُس کے آثار نظر آ رہے ہیں تو مالکن روز قیامت کے شر کا واسطہ دے کر اُس کی مدد کرتی ہے اور دوسرا مرحلہ اُس وقت آتا ہے جب فرزانہ بھابی کا حساب، خادمہ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ حساب کا ہی شکوہ کرتی ہے اور حساب سے ہی خود کو بیزار کرتی ہے۔ راوی

کے ذہن میں یہ بات کچوکے لگاتی ہے کہ خادمہ یعنی عائشہ کی باتوں میں تضاد کیوں ہے؟ اس لیے وہ افسانے کے آخری جملے میں یہی سوالات دہراتا ہے کہ کیا واقعی عائشہ حساب میں کمزور ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال استفہام انکاری ہے کہ واری کو اس بات کا اندازہ ہے کہ جو شخص محنت سے پیسے کماتا ہے وہ حساب کتاب میں کمزور نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہی اُس کی کمائی ہوتی ہے جس کے خلط ملط ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ افسانے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ملازمہ کے پیسے کہاں گئے اور کس نے غصب کیے، یہ بات راوی نے قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ آج کا قاری افسانے کے تجسس کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔

ہندستان میں یوں تو فسادات ہوتے رہتے ہیں اور اس ضمن میں اردو کے فنکاروں نے بھی خوب طبع آزمائی کی ہے اور افسانے رقم کیے ہیں۔ جنگ آزادی سے لے کر اب تک ہندستان میں دہشت گردی کی قدیم روایت رہی ہے۔ شاہد اختر نے معاشرتی تشدد کے حوالے سے کئی اہم افسانے لکھے ہیں جن میں ''کتا'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ افسانہ ''کتا'' حالات حاضرہ کو مدنظر رکھ کر رقم کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں دو واقعات ایک ساتھ چلتے ہیں جو آخر میں ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتے ہیں۔ افسانے کا آغاز کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے اور کہانی کا مرکزی کردار اسلام حیدر خوف و ہراس کی ردا میں اس لیے لپٹا ہوا ہے کہ اتنے سال گزرنے کے بعد انھیں ایک کتے نے کاٹ لیا ہے۔ اس کہانی کا دوسرا رخ بڑھاپے کی تنہائی کا بھی ہے۔ اسلام حیدر کے بیٹے بیرون ملک میں تلاش معاش کے چکر میں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ وہ ڈالر کمانے میں اتنے مدہوش ہوگئے ہیں کہ والدین کی خواہشات کا احترام بھی نہیں کر پاتے اور شکایتوں کے عوض بس پیسے بھیجنے پر یقین رکھتے ہیں کہ پیسے سے تمام مسائل حل ہوجاتے ہیں۔

پہلے نکتے کو واضح کریں تو پتا چلتا ہے کہ کہانی کے آغاز میں ایسے شخص سے متعلق بات کی گئی ہے جو اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتا ہے اور اُس پر گائے کے گوشت کا الزام لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ پھر کہانی میں مخصوص کھانے کا ذکر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ملک کے سیاسی نظام پر تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے اور تمام باتوں کا سرا اُس کتے سے جوڑا جاتا ہے جو گلیوں محلوں میں گھوم گھوم کر کاٹ رہا ہے۔ یہاں پر آتے آتے ''کتا'' موجودہ نظام حکومت کے صدر کا علامتی پیکر بن جاتا ہے جسے وہی لوگ نظر آتے ہیں جو تنہا ہیں اور اقلیت کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں حتیٰ کہ انھیں نماز پڑھنے سے باز رکھنے کی کوششیں بھی جارہی ہیں۔ اسلام حیدر جب بھی اپنی زندگی یا حالات سے عاجز آتا ہے تو یادِ ماضی کو سہارا بنا کر خود کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتا ہے کہ ''جب ملک تقسیم ہوا تو ہمارے آباواجداد نے خوشی سے اس ملک کا انتخاب کیا'' لیکن اب یہی ملک ہمیں اجنبیت کا احساس دلا رہا ہے۔ انھی باتوں سے تنگ آکر افسانے کا مرکزی کردار کہتا ہے



کہ ''ہم جلد از جلد یہ مکان چھوڑ کر اپنوں کے پاس چلے جائیں گے۔'' اس جملے میں ''اپنوں'' سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں کہ یہ ملک اب اپنا نہیں رہا۔

اسی ضمن میں دو اور افسانے 'زندگی' اور 'سرنگ کے بعد اندھیرا' اہم ہیں۔ افسانہ ''زندگی'' میں حیدر ایسے علاقے میں رہائش پذیر ہے جہاں ایک بھی مسلمان کا گھر نہیں ہے۔ جب بھی علاقے میں کوئی فساد رونما ہوتا ہے تو حیدر کے اہل وعیال رات بھر خوف و ہراس میں رہتے ہیں حتیٰ کہ اپنی شناخت مٹانے کے لیے اپنے گھر کے باہر نیم پلیٹ کو ہٹا کر 'اوم' لکھ دیتے ہیں۔ خوف و ہراس میں رات گزارنے کے بعد حیدر جب اپنے علاقے میں آتا ہے تو یہاں بھی حالت ویسی ہی ہے۔ لوگ اجنبی شخص کو مار رہے ہیں تو حیدر اُسے اپنوں کے عتاب سے نجات دلانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رات میں گھر کی چھت سے نعرۂ تکبیر کی آواز بلند ہونا افسانے کا کلائمکس ہے اور اسی پر افسانہ ختم ہوجاتا ہے۔ شاہد اختر نے علامتی انداز میں افسانے کا کلائمکس تیار کیا ہے۔ افسانے کے آغاز میں حیدر کو پھوڑا ہونے سے ہوتا ہے تو دوسری طرف فساد کا ماحول ہے، دونوں فریقوں کی جانیں جارہی ہیں اور دہشت گردی عروج پر ہے۔ ایک طرف وہ خوف زدہ ہے تو دوسری طرف کلاوا پہنا شخص نعرۂ تکبیر بلند کررہا ہے یعنی سب اپنی جان بچانے کی فکر میں ہیں۔ یہی ہمارے جمہوری ملک کا المیہ ہے۔ ایک طرف شاہد اختر نے ملکی تشدد کی بات کی ہے لیکن دوسری طرف انھوں نے مسلم سماج میں دقیانوسیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی دقیانوسیت کو واضح کرنے کے لیے شاہد اختر نے افسانہ ''لیبرا ڈرو'' رقم کیا ہے جس میں انھوں نے حجاب کی دقیانوسیت کے ساتھ اُس کے اندر پنپ رہے مسائل کو بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک حجاب کا شعار ہے لیکن اس کا غلط فائدہ تشویش کا باعث ہے۔ ایک طرف مولوی صفت باپ اپنی بیٹیوں کو پردہ کا سخت پابند بناتا ہے تو دوسری طرف وہی لڑکیاں گھر کے ڈرائیور کے ساتھ جنسی رشتے استوار کرتی ہیں۔ جنسی جبلت ہر شخص میں کم وبیش موجود ہے اسی لیے اُن لڑکیوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ ڈرائیور اچھوں کہ گھر کے فرد ہی کی طرح ہے اسی لیے برقعہ پوش لڑکی بھی چاہتی ہے کہ گھر کی عزت گھر ہی میں رہے تو اچھا ہے۔ اس افسانے میں شاہد اختر نے جنسی بھوک کی شدت کو بتانے کی کوشش کی ہے اور افسانے کے آخر میں 'کتے' سے ان کا موازنہ کیا ہے جیسا کہ افسانے کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔

شاہد اختر نے ''بڑا گھر'' میں قرآن کی ایک آیت کو بنیاد بنا کر زمانی فرق اور تغیر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے تو افسانہ نگار نے نئے اور پرانے زمانے کے فرق کو واضح کیا ہے جس کی وجہ سے کہانی فلیش بیک میں چلی گئی ہے۔ دونوں زمانوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

ا۔ پرانے زمانے میں غیروں کے بچوں پر ڈانٹ پھٹکار معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اب تو اساتذہ

بھی زدوکوب کریں تو والدین لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں۔

۲۔ پہلے کا خاندان بڑا ہوتا تھا اور لوگ رزق کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے تھے اور گھر خوشیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اب فیملی پلاننگ ہوتی ہے اور رزق کے لیے ہر طرح کے ہتھ کنڈے اپنائے جاتے ہیں۔

۳۔ پہلے لوگ بڑے کا گوشت خوب کھاتے تھے۔ اب سماجی اسٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے فاسٹ فوڈ کا استعمال کرتے ہیں اور مہذب بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ اب کھانے میں دسترخوان کا رواج بھی تقریباً ختم ہو گیا ہے اور اُس کی جگہ ڈائننگ ٹیبل نے لے لی ہے۔

۵۔ پہلے لوگ رشتے داری خوب نبھاتے تھے اور مہمان نوازی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اب لوگوں نے رشتے داروں کے یہاں آنا جانا ہی بند کر دیا ہے۔ بس شادی بیاہ میں اور کسی کی موت پر ہی جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔

افسانے کا راوی تمام باتیں بیان کرنے کے بعد جب پرانے گھر میں قدم رکھتا ہے تو اُسے اپنا ہی لمبا چوڑا گھر تنگ نظر آنے لگتا ہے اور وہ سوچ کر حیران ہو جاتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ تب اسے قرآن کی وہ آیت یاد آتی ہے کہ ''وہ زمین بھی تنگ کر دیتا ہے۔''

شاہد اختر کا ایک افسانہ ''سچ جھوٹ کے درمیاں'' بھی ہے جس میں انھوں نے فلم نگری ممبئی کے پوسٹ کولونیل کلچر کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ شاہد اختر نے فلم نگری میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے، وہاں کی تہذیب کو قریب سے دیکھا ہے اور فلم انڈسٹری کی بدکاریوں کو بھی قریب سے محسوس کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ایک ناول ''شہر میں سمندر'' بھی تحریر کیا جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی جس میں انھوں نے فلم انڈسٹری میں پھیلی گندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ ''سچ اور جھوٹ کے درمیاں'' میں انھوں نے ممبئی کی جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مفلس و نادار لوگوں کا المیہ اور اسی حال میں خوش رہنے کی عادت کو موضوع بنایا ہے۔ یہاں انھوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ ممبئی کی بیشتر آبادی جھگی جھونپڑیوں میں بسر کرتی ہے اور وہاں کے بدترین حالات کو اپنا مقدر گردانتی ہے۔ افسانہ نگار نے لوگوں کی نفسیات کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے کہ اُن کے سوچنے کا کیا انداز ہے اور تہذیبوں کا تصادم کن حالات میں ہوتا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم پر ایک اور افسانہ ''بکولی'' کا ذکر ضروری ہے۔ اس افسانے میں دو متضاد کلچر کو پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے سماج میں ایسے واردات رونما ہوتے رہتے ہیں اور معاشرہ انھیں قبول بھی کرتا رہتا ہے۔ ہندستان میں شہر اور دیہات کی زندگی، رہن سہن اور تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پوسٹ



کولونیل ایج میں اس طرح کے سانحات واقع ہوتے رہتے ہیں اور یہی تضاد انسانی المیے کی بنیاد ہے۔ شہری آدمی اپنا ایک وجود رکھتا ہے، وہ اپنے اردگرد ہالہ بنائے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ریاکاری، فریب اور تصنع ہی اصل زندگی اور اُس کا حاصل ہے جب کہ دہقانی آدمی اس طرح کے تصنع سے پاک ہوتا ہے۔ سلطان غیاث کا باپ پرانی تہذیب کا پروردہ بھی ہے اور نمائندہ بھی جب کہ غیاث اور اُس کی اولاد نئی تہذیب کے پروردہ۔ انھیں ریاکاری زیادہ پسند ہے اور یہی ریاکاری شہری کلچر کا حسن ہے۔

افسانہ ''درخت'' موجودہ عہد میں 'برتھ کنٹرول' اور اُس کے نتیجے میں ہونے والی پریشانیوں کو مدنظر رکھ کر رقم کیا گیا ہے۔ نئے عہد میں موڈرن بننے کی خواہش انسان کو جہنم میں لے جا رہی ہے۔ لوگ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور غیر قوموں کی تقلید کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس افسانے میں فرید میاں اور اُن کی اہلیہ کا بھی یہی حشر ہوا۔ پہلے تو انھوں نے فیملی پلاننگ کی اور جب 'عارف' کی ضرورت ہوتی ہے تو بیٹا اُن سے دور ہوتا ہے۔ یہی آج کے معاشرے کا المیہ ہے اور اس موضوع پر اردو میں ڈھیر سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔ افسانہ ''خاک کے اوپر والی مٹی'' میں بھی بیٹے کی بے رخی اور باپ کی ملازمت سے سبکدوشی کا المیہ بیان ہوا ہے۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں جب والدین کو بچوں کی سخت ضرورت پڑتی ہے تو بیٹا اپنے بچوں کے ساتھ مگن رہتا ہے اور خوش ہوتا ہے جب کہ اُسے احساس نہیں کہ جس طرح سے اُس نے اپنے باپ کو چھوڑا یا نظر انداز کیا ہے، اس کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے۔ یہ نظام زندگی ہے اور یہ نظام اسی سرکل پر گردش کر رہا ہے۔ افسانہ ''رہائی کے بعد کی قید'' کا بھی یہی قصہ ہے جس میں ملازمت کے بعد کی سبکدوشی کا المیہ بیان ہوا ہے۔ ایک شخص جو زندگی بھر مصروف رہا اور اچانک اسے فرصت کے لمحات میسر ہو جائیں اور وہ وقت گزاری کے لیے کام تلاش کرنے لگے اور بچوں کو شدت سے محسوس کرے، ایسے ہی حالات کو مدنظر رکھ کر افسانہ رقم کیا گیا ہے۔

شاہد اختر کو جانوروں سے بے حد لگاؤ ہے اور اُسی انسیت کی بنا پر انھوں نے ''میں زندہ ہوں'' جیسا افسانہ تخلیق کیا ہے۔ اردو میں جانوروں کی نفسیات کو بنیاد بنا کر جن افسانہ نگاروں نے فن پارے تخلیق کیے ہیں اُن میں سید رفیق حسین، ابوالفضل صدیقی، عبداللہ حسین، ابن کنول اور سید محمد اشرف وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ شاہد اختر نے بھی اس حوالے سے یہ افسانہ لکھا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جانوروں پر دنیا بھر میں جو مظالم ہوتے رہے ہیں، ان کا تدارک کس طرح سے کیا جائے اور چرند و پرند کو ہم کیسے محفوظ رکھیں، انھیں اپنی زندگی جینے کی مکمل آزادی ہو۔ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں، پرواز کر سکیں لیکن آج کے معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں نے اپنی پسند و ناپسند کی بنیاد پر پرندوں کو قید کر رکھا ہے اور 'کتوں' سے اتنی محبت پیدا کر لی ہے کہ اسے انسان سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

افسانہ ''خرگوش'' میں شاہد اختر نے دو کرداروں (ضیا اور طلعت آرا) کو پیش کر کے میاں بیوی کی ذہنی ناہمواری کو بتانے کی کوشش کی ہے۔ میاں کی طبیعت میں خوش مزاجی ہے جب کہ طلعت ذہنی طور پر بیمار ہے۔ ضیا شعر و ادب سے شغف رکھتا ہے اور طلعت تمام علوم سے بے بہرہ۔ اُسے فقط جانوروں سے پیار ہے۔ اس کے گھر میں چرند و پرند کی بہتات ہے جس کی خدمت میں وہ لگی رہتی ہے گویا گھر میں پل رہی تمام بے زبان مخلوق کی ذمے داری طلعت آرا پر ہی تھی اور اُس کام کو وہ خوش اسلوب سے انجام دیا کرتی تھی۔ شوہر کی خدمت بھلے ہی نہ کر پاتی ہوں لیکن جانوروں کی خدمت کرنے میں کوتاہی نہیں برتتی تھی۔ وہ اکثر اوقات طعنے دینے سے بھی باز نہیں آتی، کبھی تو یہاں تک کہہ دیتی کہ ''میرے ہی کرم پھوٹے ہوئے تھے کہ ابو نے تمہارے حوالے کر دیا ورنہ تمہیں کون پوچھتا؟'' چوں کہ ضیا، ادب کے آدمی تھے اس لیے یہ باتیں اور بھی بری لگتیں اور وہ نہ جانے کیا کیا مطلب نکالا کرتے۔ افسانہ نگار نے ''خرگوش'' کا عنوان قائم کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گھر میں خرگوش اور ضیا صاحب کی حیثیت ایک جیسی تھی۔ دونوں دو قسم کے واقع ہوئے تھے، دوسروں سے ڈر سہم کر رہتے تھے حتیٰ کہ دونوں میں ذہنی مناسبت بھی کم و بیش ایک سی تھیں۔ نفسیاتی رو سے دیکھا گیا ہے کہ جس شخص کی قدر گھر میں نہیں ہوتی۔ وہ قدرے جھنجھلایا ہوا ہوتا ہے اور باہر کے لوگوں سے انکساری سے ملتا ہے تا کہ اُسے بھی عزت ملے اور یہی عمل ضیا صاحب نے بھی اپنایا ہوا ہے۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتے ہیں تو بڑوں کے علاوہ بھی چھوٹوں سے بھی انکساری سے پیش آتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

''چودھری ضیا اپنی زندگی پر مختلف زاویوں سے غور کرتے ہیں۔ عجیب طرح کی باتیں بھی ذہن میں آتی ہیں کہ سوچنا ایک فطری عمل ہے۔ مسئلہ یہاں آ کر الجھتا ہے کہ انھوں نے کیا پایا اور کیا نہیں۔ اطمینان اور بے اطمینانی کے درمیان معلق خالی وقتوں میں اکثر کتاب زیست کے اوراق الٹتے۔ کاش کسی ایسے گھر میں پیدا ہوئے ہوتے جہاں تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے تو شاید خاطر خواہ تعلیم حاصل کر لی ہوتی اور کسی دفتر میں افسر بن گئے ہوتے۔ اپنی ایک شناخت ہوتی۔ پرانی فائلوں میں ان کے دستخط کتنے دنوں تک باقی رہتے۔ جہاں جاتے لوگ احترام کی نظر سے دیکھتے۔ اس تعظیم کا فرق الگ ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو سکا تو کاروبار میں ہی صورت حال اس کے برعکس ممکن تھی۔ تجارتی دنیا میں بھی کیا کر لیا گو کہ صبر و شکر والے آدمی تھے پر خیال آتا کہ طرز زندگی کچھ اور ہونی چاہیے تھی۔''

یہ ذہنی کشمکش ضیا صاحب کے اندر ہوتا طے ہے کیوں کہ وہ ایسے ہی مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ اس افسانے میں شاہد اختر نے سماجی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کے حالات ایک سے نہیں رہتے بلکہ اُس میں تغیر لازمی ہے اور اسی میں انسان کی خوشی و غم بھی پنہاں ہے۔ جانوروں سے محبت کی بات چلی



ہے تو افسانہ ''ایک بلی کی موت'' کا ذکر نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جانوروں سے محبت اس افسانے کا تھیم ہے جسے ہم نفسیاتی افسانے کے ضمن میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ رابعہ کی گم شدگی سے زیادہ 'منو بلّی' کے مرنے کا غم اس افسانے کا موضوع ہے۔ شاہد اختر کو چرند پرند سے زیادہ لگاؤ ہے اور مطالعہ کائنات سے اپنے افسانوں میں رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔

مجموعی طور پر شاہد اختر کے افسانوں کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ افسانے میں اچانک کود نہیں پڑتے بلکہ خراماں خراماں پلاٹ سازی کے عمل میں خود بھی داخل ہوتے ہیں اور قاری کو بھی دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں یہ عنصر کارفرما ہے۔ ان کے افسانوں میں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ قاری اکتاہٹ محسوس کرے یا کہانی مکمل کیے بغیر آگے بڑھ جائے بلکہ قاری کا عالم یہ ہوتا ہے کہ وہ دوزانو ہو کر کہانی سننے پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ شاہد اختر طے شدہ پلان کے تحت افسانے نہیں لکھتے بلکہ موضوعات ہی انھیں لکھنے پر اکساتے اور مشتعل کرتے ہیں۔ اُن کا اپنا اسٹائل اور اسلوب ہے، وہ دوسرے فنکار کے اسلوب کی پیروی نہیں کرتے بلکہ اسلوب خود وضع کرتے ہیں۔ ان کا بیانیہ دلکش اور گٹھا ہوا ہوتا ہے، ساتھ ہی جزئیات نگاری میں وہ کمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مکالمہ نگاری کے اعلیٰ نمونے اُن کے بیشتر افسانوں میں مل جاتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

Lane No. 3
Sallar Colony
Bariatu, Ranchi 834009
(Jharkhand)
Mob:9897858093

**اقبال حسن آزاد کی کتابیں**

قطرہ قطرہ احساس (افسانے) مردم گزیدہ (افسانے)

پورٹریٹ (افسانے)

نثری اصنافِ ادب اور طنز و مزاح کی روایت (تحقیق)

**زیر طبع** : اوس کے موتی (افسانے)، اقبال حسن آزاد کے افسانے (کلیات)

● **انجم قدوائی**

# نسترن احسن فتیحی کا ناول ''نوحہ گر''

ذات کا کرب جب سماجی خارزاروں کے درمیان لہولہان ہوتا ہے تو وہیں کسی درد کی لہر سے ایک روشنی کی کرن بھی پھوٹتی ہے اور اس کی روشنی سے ہر جانب اجالا پھیلانے کی کوشش میں اپنا وجود فراموش کر دینا، یہ ہے ''نوحہ گر''۔

آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ ذوق سخن اور ذوق قلم دونوں کا معیار کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور خاص کر اردو زبان کے شیدا ناپید ہوتے جا رہے ہیں، ایسے پر آشوب دور میں یہ عظیم و ضخیم ناول منظر عام پر آیا ہے جس وقت کسی پختہ اور حقیقی تحریر کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ناول علم و ادب کے پیاسوں کے لئے ایک میٹھی ندی کے مانند اپنے جملوں اور منظر نگاری سے سیراب کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نسترن فتیحی صاحبہ کے نئے ناول ''نوحہ گر'' کا ذکر کر رہی ہوں۔ جسے ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے۔ ۵۰۴ صفحات پر مشتمل یہ ناول جب ایک بار آپ پڑھنا شروع کر دیں تو اس طرح اس ناول کی دنیا کا حصہ بن جائیں گے جیسے آپ وہیں کہیں موجود ہیں۔

یہ ناول ان قبائیلیوں کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے جن کے مسائل اور جن کی زندگی کو ہمارے نظام نے حاشئے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو ہمارے ہی درمیان رہتے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتے یا انہیں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا، مگر اس کا موضوع ان قبائیلیوں تک محدود نہیں ہے یہ کہانی بہار کے ایک بے حد پچھڑے ہوئے علاقے سے شروع ہو کر حالیہ سیاست کے دہلی کے منظر نامے تک پہنچتی ہے اور بغیر کسی رپورٹنگ یا تقریر کے ہمیں اس آئینے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے جہاں ہر اقلیتی طبقہ خود کو حاشئے پر چھوٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس حاشئے پر جہاں سے استحصال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جو بے لگام ہٹلر شاہی نظام کی سیاست کے مظالم کا شکار ہوتا ہے۔ جہاں ایک طبقے کو شعوری کوشش کے طور پر اتنا پس ماندہ اور مفلس کر دیا جاتا ہے کہ ان پر بلا تردد حکومت کیا جا سکے، ان کا حق اور ان کے املاک پر قبضہ کیا جا سکے۔ امراء اور غریب کے درمیان اتنی گہری کھائی کھودی جا سکے کہ اسے پاٹنے کا تصور بھی ناممکن ہو۔ لیکن جنگل اور گاؤں میں حاشئے پر پڑے ہوئے طبقے کی کہانی احساس کے ایسے دھاگے سے بنی گئی ہے کہ کوئی بھی کردار یا جگہ آپ کو اجنبی نہیں لگتی۔ آپ اس درد کے سفر میں خود کو مکمل طور پر شامل پائینگے۔ یہ ناول سرسری ورق گردانی کے لئے نہیں ہے نہ ہی ایک نشست میں پڑھی جانے والی کہانی ہے۔ یہ وقت لے کر پڑھنے والی کتاب ہے۔ جس کی دنیا میں اگر آپ شامل ہو جائیں تو



آخیر تک پہنچ کر ہی دم لینگے۔ یہ نہ تو کوئی تاریخی ناول ہے اور نہ ہی سیاسی مگر اس کا موضوع بہت خوبی کے ساتھ ہماری تاریخ اور سیاست کے ایسے اندیکھے گوشے کو مرکز میں لا کر لکھا گیا ہے جو ہمارے معاشرے کی اس حقیقت کو برہنہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے جس سے حکومتیں جان بوجھ کر اور فرد مجبوری میں چشم پوشی کرتے رہے ہیں۔ اور جن پر گہرائی سے سوچنے اور اس کے سدباب کے لئے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

برجستہ و برمحل تخلیقی جملوں سے مزین ناول ''نوحہ گر'' کے الفاظ کا چناؤ، جملوں کی چاشنی اور ان کی بنت اور جزیات نگاری ناول کے طویل ہونے کے باوجود ایسی دلچسپی قائم کر دیتا ہے کہ اس طوالت سے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ دریا کی روانی کی طرح الفاظ کا بہاؤ اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے۔

راحت کے کردار کے ذریعے ایک طرف سنہری روایتوں، ادبی ثقافت، ہمارا تہذیبی اور مذہبی ماحول دکھایا جاتا ہے تو دوسری طرف سماجی نابرابری اور ناانصافی، انسانی نفسیات، غربت اور کسمپرسی کو دیکھنے کا وسیلہ بھی ''راحت'' کا کردار ہی بنتا ہے..... اس کا کردار، ایک عام کردار نہیں بلکہ وہ اپنی ماں کا صبر ضبط دیکھ کر شعور کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے ساری دنیا دو دائروں میں قید نظر آتی ہے۔ ایک طرف ہنسی کے آبشار ہیں بے فکری ہے عیش کوشی ہے اور دوسری طرف صبر و ضبط کی منزل ہے اور ایک سرمئی سی اداسی ہے۔ یہ اداسی پورے ناول پر محیط ہے۔

'راحت' اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک ڈاکٹر ہے۔ اس کے سامنے مستقبل کی بڑی سنہری راہیں کھلی ہوئی ہیں مگر وہ اپنے آبائی وطن کی کسمپرسی، والد کے خواب اور اپنے عزم کو سامنے رکھ کر اپنے روشن مستقبل کی قربانی دیتی ہے۔ اس کی یہ قربانی، اس کا یہ عزم اور اس کی راہ میں حائل تمام مشکلیں راحت کے کردار میں ایسے کئی سوشل ایکٹیوسٹ کی جھلک یاد دلاتے ہیں جو اپنے اپنے وقت میں معاشرے کے لئے ہمیشہ فعال رہے اور ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ اپنے انتساب میں نسترن خود بھی لکھتی ہیں.....

''صفدر ہاشمی، بنائیک سین اور میگھا پاٹیکر جیسے ایکٹیوسٹ کے نام آج کے سماج میں جن کا کردار اس ناول کو لکھنے کی تحریک بنا.....''

اس میں کوئی شک نہیں کہ راحت کا کردار اس ناول کا ایک ایسا مضبوط مزاحمتی کردار ہے جو ان سارے ایکٹیوسٹ کے شانہ بہ شانہ آ کر کھڑا ہو گیا ہے اور اس ناول کو پڑھ لینے کے بعد اسے بھول پانا مشکل ہے۔ اس طرح اس ناول کے ذریعے نسترن نے ان سماجی کارکنوں کو بہترین خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ جو اپنی بے لوث خدمت سے معاشرے میں حاشئے پر چھوٹ جانے والوں کی بھلائی کے کام میں خاموشی سے لگے رہتے ہیں۔ اور جس کی وجہ سے بعض دفع انھیں اپنی جان تک کی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔

یہ ناول ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے زندگی ہے۔ جس میں زندگی سے جڑے بڑے

گمبھیر مسائل پر بات کی گئی ہے اور حیرت اور خوشی یہ ہوتی ہے کہ ایسے سنجیدہ اور روکھے موضوع کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ناول میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنے گردوپیش سے بھی بے خبر ہو جاتے ہیں۔ناول کے شروع میں ہی وہ اس میں پیش ہونے والے موضوع کا پس منظر یوں بناتی ہیں کہ راحت زینہ سے ہوتی ہوئی اس چھت پر آتی ہے جہاں ایک طرف سے اسے ایک دائرے کی چکا چوند روشنی نظر آتی ہے دوسری جانب یادوں میں بسا ویران اداس کھنڈر۔اس کا دل اداس ہے مگر پر ہمت بھی، اداسیوں کو ختم کرنے کے سبب کی تلاش بھی۔اور یہیں سے قاری کے تجسس کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے جو کتاب کے اختتام تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔

پورے ناول میں کھیت کھلیان، جنگل، روشنی، سورج چاند بادل اور استوں کی خوبصورتی کو لفظوں میں اس طرح ڈھال دیا گیا ہے کہ قدرت کی صناعی نظر آنے لگتی ہے۔

گاؤں کے راستے، کوئل کی کوک۔خرگوش کی معصومیت، ان سب چیزوں نے مل کر تحریر کو ایک نرمی اور ایک خوبصورت کیفیت سے دوچار کیا ہے۔

آپ مرکزی کردار کی اس کشمکش کو دیکھیں جب اس کی ذات دو متضاد دنیا سے تال میل بٹھانے میں شعور کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ایک اس کے اندر کی دنیا ہے۔مصالحت پسند، پرسکون، پر محبت اور دوسری حقیقی اور عملی دنیا۔کشاکش سے بھری، پر تصنع اور کرپٹ.....مثال دیکھی۔

''بہت شروع سے شاید شعور کی سرحد کے کہیں بہت پہلے سے اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے اندر بھی ایک دنیا تھی جو باہر کی دنیا سے بالکل الگ تھی۔اور ہر وقت بڑی خاموشی سے اس کے ساتھ شب و روز کا سفر طے کرتی۔اس دنیا میں کوئی شور نہ تھا کوئی مصروفیت نہ تھی مگر ایک سرگوشی تھی جو ہر وقت اس کی توجہ باہر سے اندر کھینچنے کی کوشش کرتی رہتی.....اندر کی دنیا میں بے پناہ اداسی بھری رہتی۔شاید باہر کی دنیا میں اس کی شمولیت اندر کی دنیا کو پسند نہ تھی.....اندر کی دنیا..... جہاں کے رشتے نرم و نازک جھاڑیوں کی طرح محبت کی ہوا کی خنکی سے ہلکے ہلکے کانپتے ہلکورے لیتے ہوئے سانس لیتے۔اور جن میں معصوم خرگوش جیسے جذبے اپنی چمکتی سرخ آنکھوں کو میچتے ہوئے یہاں وہاں پناہ لیتے۔پھدک کر نکلتے اور پھر ان میں ہی جا کر چھپ جاتے۔ان معصوم جذبوں کو وہ جب چاہے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیتی۔انہیں سہلاتی، پچکارتی اور پھر ان ہی جھاڑیوں میں چھوڑ دیتی۔تب اسے معلوم نہ تھا کہ آنے والا وقت اس کے سامنے دونوں دنیاؤں میں تال میل بٹھانے کی اجازت کبھی نہ دیگا۔باہر کی دنیا کے اپنے اصول تھے.....اس کا اپنا قانون تھا۔'' (نوحہ گر: صفحہ۔۱۵)

اس باہر کی دنیا کی ناانصافی، نابرابری نے اس کو کم عمری میں ہی بہت دکھ درد دئے، جس سے



نبرد آزما ہونے کے لئے خود کو کیسے تیار کیا۔مثال دیکھیں۔

''بعد میں راحت نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا.....اس شوق اور اس جنون کے ساتھ کہ وہ اس زمین پر ہمیشہ مظلوموں کے ساتھ ناانصافی کے خلاف کھڑی رہے گی۔اس نے پڑھا تھا کہ دھات کو تپا کر جتنا پیٹا جاتا ہے وہ اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے اور اس کی ہر تہ میں بورک ایسڈ ڈالا جاتا ہے تاکہ پرتوں کے بیچ سے آکسیجن نکل جائے اور اس میں زنگ نہ لگے۔اس نے بھی اپنی زندگی کے اس عظیم حادثے کے درد کو یادوں کے ہتھوڑوں سے اتنا پیٹا تھا کہ اس کا دل کافی پختہ اور مضبوط ہو چکا تھا۔ہر گناہ، جبر اور زیادتی کے خلاف ہمیشہ لڑنے کے لئے اور ہر گزرتے لمحے کی تہ میں وہ محنت شاقہ کے بورک ایسڈ سے اپنا ارادے کو زنگ لگنے سے بچاتی رہتی تاکہ آرام و آسائش کی آکسیجن کسی تہ میں باقی نہ رہ جائے اور اس کے ارادے کو زنگ نہ لگ جائے۔'' (نوحہ گر: صفحہ۔۱۶)

ماحولیات سے محبت اس ناول کی ایک اور خاصیت ہے۔منظر نگاری میں وقت کا ذکر ہو، گاؤں یا جنگل ندی کا ذکر ہو یا کھیت کا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔یہاں چند مثالیں پیش ہیں۔

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی مشرقی کھڑکی کے سامنے سورج کا گولا بالکل پورے چاند کی طرح ٹھنڈا سیاہی مائل آسمان کی پیشانی پر سہاگن کی بندی کی طرح چمک رہا تھا۔ماں نماز سے فارغ ہو کر اپنے بستر کو درست کر رہی تھیں۔اس نے حیران ہو کر سورج کی طرف دیکھا۔راحت کی آنکھ کھلتی دیکھ کر وہ مسکرائیں۔نماز نہیں پڑھی دیکھو طلوع آفتاب کا وقت ہو گیا۔اٹھ جاؤ میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔آج اتنے دنوں بعد ایسی فرصت سے امّی کے کمرے میں سونا اور جاگنا اُسے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔جسم کے پور پور سے جیسے تھکن بوند بوند ٹپک کر باہر نکل گئی ہو اور جسم بالکل ہلکا پھلکا اور دماغ بالکل پرسکون ہے اس وقت، جی چاہ رہا ہے کہ صبح صادق کا وقت یوں ہی تھم جائے۔اور کھڑکی کے چہرے پر طلوع آفتاب کی بندی یوں ہی ٹنکی رہے۔مگر یہ کیا۔ان چند لمحوں میں سورج کی بندی کھسک کر اوپر چلی گئی تھی اور اب کھڑکی سے آدھی نظر آ رہی تھی۔اُس کی سرخی کے ساتھ اب اُس کے چہار طرف روشنی کی سپیدی کا ایک ہالہ سا بھی بن گیا تھا۔راحت غور سے اُدھر دیکھتی رہی اور اُسے احساس ہوا کہ وہ بہت تیزی سے کھسکتا جا رہا تھا۔شاید اُسے دنیا کو جگانے کی بہت جلدی تھی۔اور ایک پل گنوائے بغیر وہ اپنے سفر پر گامزن تھا۔لوگوں کی سُستی دیکھ کر اُس کا جلال اور بھی فزوں ہو رہا تھا۔راحت کو یقین تھا جب وہ کمرے سے باہر جا کر اُس کی طرف دیکھے گی تو اُس سے نظریں نہ ملا پائیگی۔اب وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر کھڑکی کے باہر اُس نے اپنے وجود کی روشنی کے پہرے بٹھا دئے تھے۔راحت نے کسلمندی سے انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر دیوار کی طرف رخ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ابھی وہ اس آلسی صبح کو پکڑے رہنا چاہتی تھی۔'' (نوحہ گر: صفحہ۔۱۴۔۱۵)

''راحت نے دور ندی میں دن کے آخری مدھم اجالے کو ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ پانی پر شام کے سلیٹی رنگ کے سائے پگھل کر پوری ندی پر پھیلتے جا رہے تھے۔ جنگل کی طرف سے ایک دہشت بھری سرسراہٹ، ایک بہکی ہوئی جنگلی خوشبو کے ساتھ، ہوک بن کر اس کے دل میں اتر گئی۔'' (نوحہ گر: صفحہ۔ ۲۹۵)

''جیپ پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی اور راحت گم تھی اپنے ہی خیالوں میں، ہوا راحت کے سائے کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔ راحت نے جانے پہچانے اس مانوس ماحول میں اپنی روح کو سرشار ہوتے ہوئے پایا۔ سورج تمام دنیا کو اپنی ضوفشانی کے دائرے میں لیے ہوئے تھا۔ اس نے تیز ہوا میں اپنا سر اوپر اٹھایا اور اسے محسوس ہوا کہ زمین کا یہ لامتناہی سلسلہ، یہ عظیم الشان آسمان اور آزادی اور مسرّتوں سے مالا مال وطن کا یہ تمام علاقہ اس کے دل کی وسعتوں میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ اسے لگا زمین کا یہ ٹکڑا..... دنیا کا سب سے خوبصورت حصّہ ہے، بلکہ بہشت سے مشابہ ہے۔'' (نوحہ گر: صفحہ۔ ۱۸۰)

وہیں آدی واسیوں کے درد کو اس ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ جھک جھور کر رکھ دیا ہے۔ صاف ہوا پانی بھی میسّر نہ ہو تو زندگی کی نمو کہاں ممکن ہے۔ آدی واسیوں کی پسماندگی راحت کی حساس طبیعت کو نشتر چبھوتی ہے۔ یہ سارا ماحول کچھ اس قدر فطری انداز میں پیش کیا ہے کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ جنگل کا ذکر ہو یا شہر کا، گاؤں ہو یا گھر آپ کی یادداشت میں بس جائیگا۔ کوئی اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ راحت کا باغیانہ انداز اس کی محرومیوں کا بدلا ہے۔ اس نے محسوسات اور تخیل کو ایک نئی مضبوط دنیا سے متعارف کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ مظلوم کے لئے طاقت بن کر وہ اس دنیا کو جینے کے قابل بنانا چاہتی ہے۔

اس ناول میں رشتوں کی پائیداری بھی ہے، محبت کی میٹھی میٹھی کسک بھی۔ اب وہ رشتہ انسانیت کا ہو، ماں کا، چچا کا یا محبوب کا۔ یہ چند اقتباسات دیکھیں.....

''وہ اس کی نظروں میں اعتماد کے ساتھ اپنے لئے الفت بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ نہ جانے کب سے..... شاید ہمیشہ سے ہی، لیکن احساس بعد میں ہوا۔ کیونکہ اس کے دراز سبک بالوں کے درمیان اس کا انتہائی سنجیدہ اور متین نظر آنے والا چہرہ ان کی کمزوری بن گیا تھا، وہ یہ بھی نہ کہہ سکے کہ مسکرانے سے پہلے اس کے گال پر گہرا سا گڑھا جو رقصاں دکھائی دیتا تھا، وہ دل کی کدورتوں کو دھو کر پاک کر دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ اور اس کے تمام حرکات وسکنات جو شائستگی اور سبکدوشی کا مظہر تھیں، اور اس کا خاموش شرمیلا پن جو بہت ساری دوسری خوبصورتیوں کے معیار سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ ان کے جیسے متین شخص کا دل بھی جیت بیٹھے تھے۔'' (نوحہ گر: صفحہ۔ ۱۹)

''ساری دنیا سے اپنے غم چھپانا کتنا آسان ہے، مگر ایک ماں سے ناممکن..... وہ جو اتنی دور ہی مگر اس کی بے چینیاں انہیں وہاں قرار نہیں لینے دیتی۔ ان سے بات کرنے سے پہلے، اپنی آواز، سارے آنسو



پونچھ دینا چاہتی تھی جو اس کے دل میں قطرہ قطرہ گر کر اس کی آواز کو گلوگیر کر رہے تھے۔ اس نے کچھ دیر خود کو نارمل کیا۔ ایک گلاس پانی مانگ کر پیا پھر چائے بھی پی لی۔ اب اسے لگا، وہ ماں سے بات کر سکتی ہے۔ اس نے فون لگایا..... ''ہیلو..... کون'' عالیہ بیگم کی آواز میں ایک ایسا اضطرار تھا کہ راحت کی ساری تیاری دھری رہ گئی۔ نہ جانے کہاں سے آنسوؤں کا سیلاب امڑ آیا اور وہ خاموش رہ گئی۔''

اس دنیا میں شروع سے خیر و شر کے تناسب سے جو خلفشار جاری ہے اور یقیناً قیامت تک جاری رہیگا وہی اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔ اور کہیں نہ کہیں ناول کے یہ کہانی ہمیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ انسانیت اور رشتوں سے محبت یہ دو ایسی طاقتیں ہیں جو ہمیں ہر حال میں صرف جینے کا حوصلہ ہی عطا نہیں کرتیں بلکہ بھلائی کو جاری رکھنے کا حوصلہ بھی دیتی ہیں۔ شر کی طاقت چاہے کتنی بھی بڑھ جائے خیر اس کے سامنے کبھی ہار نہیں مانتا۔ اس ناول میں سارے وہ مشاہدات اور تجربات ہیں جو وقتاً فوقتاً سامنے آکر حیران کرتے ہیں۔ اور ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ نوحہ گر وقت کے صفحات پر لکھا گیا ایک ایسا نوحہ ہے جسے ہر حساس انسان اپنی روح سے محسوس کر سکتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Flat No:B,First Floor
Ruby Apartment
Near Habib Manzil
Badar Bagh Aligarh-202002(U.P)
Mob:9599396218

**اقبال حسن آزاد**

کا

**تیسرا**

**افسانوی مجموعہ**

**پورٹریٹ**

(۲۰۱۷ء)

● نازیہ تبسم

# جیلانی بانو کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی

اردو ادب کی دنیا میں جہاں ہم ہزاروں افسانہ نگاروں کو جانتے ہیں جنہوں نے اردو ادب میں بہترین کارناموں کو انجام دیا ہے، اسی فہرست میں چند خواتین افسانہ نگار بھی شامل ہیں۔ اردو افسانے کی خاتونِ اول رشید جہاں کو مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر جیسی مشہور مصنفہ اردو ادب میں چمکتے دمکتے ستارے کی طرح موجود رہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے دور سے ہی اردو ادب ایک اور نام سے روبرو ہوتا رہا ہے جسے ہم جیلانی بانو کے نام سے جانتے ہیں۔ جیلانی بانو اردو فکشن میں خواتین کی سب سے مستحکم نسل کی آخری کڑی کے طور پر آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سے انھیں الگ راستہ منتخب کرنا تھا۔ اپنے سابقین کی طرح انھوں نے زبان اور موضوع کے چٹخارے کو اپنے لیے رہنما نہیں بنایا۔ انھوں نے اُن مشہور موضوعات کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جنھیں ان کے سابقین نے مستعدی کے ساتھ اپنایا تھا۔ جیلانی بانو نے عورت کی زندگی کے اور بھی روپ تلاش کیے۔ عورت صرف عشق و عاشقی کی ہار جیت میں مبتلا نہیں بلکہ زندگی کی ٹھوس زمین پر اس کے لیے نہ جانے کتنی شکست خوردگیاں مقدّر رہیں۔

جیلانی بانو کی تخلیقات میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی شعور کی پختگی کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ جیلانی بانو نے جس عہد میں ہوش سنبھالا، وہ جاگیردارانہ ماحول اور معاشرے کی ٹوٹتی بکھرتی روایتوں اور قدروں، سیاسی و سماجی تغیرات اور تحریک آزادی کا دور تھا۔ اس دور کے حالات اور مسائل نے ان کے حساس ذہن کو متاثر کیا۔ اور جب انھوں نے قلم اٹھایا تو اپنی تمام فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور دیگر سیاسی، سماجی مسائل کو کہانیوں کے پیرائے میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئیں۔

جیلانی بانو کی پہلی کہانی ''موم کی مریم'' ہے جس میں معاشرے کی ایک جذباتی لڑکی کی دردناک کہانی کو پیش کیا گیا ہے جس میں لڑکی ہر دکھ درد کو اپنے ہی اندر جذب کر لیتی ہے مگر اُف تک نہیں کرتی ہے۔ ان کا یہ افسانہ 'موم کی مریم' نے ماہنامہ 'سویرا' میں شائع ہوتے ہی انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد لگاتار ان کے افسانے منظر عام پر آنے لگے۔ ان کے مشہور افسانوں میں 'اے دل اے دل



''موم کی مریم' ایک دوست کی ضرورت ہے' 'یہ شہر بکاؤ ہے' 'اجنبی چہرے' 'پتھر کا شہزادہ' 'جوائے' 'بات پھولوں کی' 'پرایا گھر' 'اپنے مرنے کا دکھ' 'ڈریم لینڈ' 'گڑیا کا گھر' 'نروان' 'پرامس' 'ادو' وغیرہ ہیں۔

جیلانی بانو نے ۲۰۰۲ء میں ایک افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان ہے'' عباس نے کہا'' جسے صلاح الدین پرویز نے اپنے ادبی جریدے'' استعارہ'' میں شائع کیا تھا۔ یہ افسانہ عراق پر ہونے والی جنگ میں امریکہ کی بربریت کی کہانی سناتا ہے۔ اس میں انھوں نے امریکہ کے جابرانہ رویے، عراق پر اس کے پے در پے حملے اور دہشت و تباہی کی حقیقی تصویریں نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ عراق میں ہونے والی جنگ انسانی ظلم و بربریت کی ایک ایسی لرزہ خیز داستان ہے جس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل خراش آہوں، سسکیوں اور قتل و غارت گری کی وہ ساری تصویریں زندہ ہو جاتی ہیں جو امریکہ کے اشارے پر عراق کے چپے چپے کی بے بسی کی داستانیں سناتی ہیں۔ وہ ستم زدہ داستانیں جو سفید حویلی میں مقیم اربابِ اقتدار کے اشارے پر رقم کی گئیں اور اپنی رعونت اور گھمنڈ کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔

اسی طرح جیلانی بانو کے اور بھی افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے ہر افسانے میں سماج میں ہو رہے ظلم و ستم، لاچاری اور بے بسی کی زندگی کا سچا نمونہ ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جیلانی بانو کا افسانہ ''ادّو'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں غریبی اور مفلسی کی ایک عجیب و غریب داستان بیان کی گئی ہے جو آج بھی ہمارے سماج کی ترقی میں کہیں نہ کہیں روڑا بن کر ڈس رہی ہے۔ ادّو ایک ایسا غریب اور ایماندار آدمی ہے جو چونی سے زیادہ روپے کا مالک نہ تھا۔ ادو جب تھکا ماندہ بستر پر جاتا تو عید ہونے کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کی عید آئے گی تو بیگم صاحبہ اسے عیدی کے روپ میں ایک چونی دیں گی، یہ چونی ہی اسکی زندگی کی وہ خوشی تھی جس کے لیے وہ ہر روز اپنے مالک کی کار کو دھکا دیا کرتا تھا۔ غریبی اور مفلسی کی آگ میں جل رہا ادو ہمیشہ ایک روپے کا خواب دیکھا کرتا اور اپنی خواہشوں کو ہر روز یوں ہی دفن کرتا۔ ایک دن دھوکے سے مالک کی جیب سے ایک روپیہ گر جاتا ہے جس پر ادّو کی نظر پڑتی ہے اور وہ روپیہ ادو اٹھا لیتا ہے۔ یہ ایک روپیہ ادو کے ہاتھ آتے ہی ادو کی خوشی کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔ اس کے اندر خوشی کی ایک عجیب سی لہر اٹھنے لگی تھی۔ اس کا بیان افسانے کے اس اقتباس میں ملاحظہ کریں۔

> '' آج ادّو اچانک بہت بڑا اور اہم بن گیا تھا۔ جیسے پتھر اپنوں سے کٹ کر خدا بن جاتا ہے۔ ادو کو بھی آج دنیا کی ہر چیز حقیر اور نا قابل تسخیر نظر آ رہی تھی، کیوں کہ آج وہ اپنے آپ کو صاحب کی طرح اونچا محسوس کر رہا تھا۔ آج اس کی جیب میں ایک روپیہ تھا۔ سچ مچ کا ایک روپیہ۔ اس لیے تو جیب کی طرف سے وہ

ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ آج اسے یہ معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز اپنے آپ بغیر کسی ڈور کے سہارے آسمان سے کیسے اڑتا ہے۔ صاحب کی موٹر کیسے زن سے چل نکلتی ہے اور سرکس میں پہلوان کیسے ہاتھی کو اپنے سینے پر کھڑے کر لیتے ہیں۔''

''یہ سب پیسے، کا کس بل ہے میاں!'' اس کا چچا مستان ٹھیک کہتا تھا۔'' پیسہ جیب میں لیے وہ سارا دن بازار کی ہر سہاونی چیز کو کھانے کی خواہش لیے گھومتا ہے مگر ایک بھی چیز اسے میسر نہیں آتی ہے۔ ایک طرف خواہشوں کا انبار ہے تو دوسری طرف اس کا ضمیر اسے جھنجھوڑتا ہے اور نہ جانے کتنی ہی عذابیں وہ اپنی تصور میں ہی جھیل لیتا ہے۔ آخر کار وہ پیسے بیگم صاحبہ کو واپس کرنے کی ٹھان لیتا ہے اور خود کی ایمانداری پر فخر کرتے ہوئے پیسہ بیگم صاحبہ کو دیتا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ آج ایک ایماندار نوکر کے خطاب سے اسے نوازا جائے گا مگر یہاں تو الگ ہی نظارہ تھا۔ انعام کے طور پر ملا تو تھا اسے ایک زوردار تھپڑ اور چور کا خطاب۔

جیلانی بانو کا افسانہ ''پرامس'' بھی سماجی مسائل کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ہمارے سماج میں رشتوں کی اہمیت کھوتی چلی جارہی ہے۔ اس کی تصویر کشی اس افسانے میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسی سچی اور کھری بات سامنے آتی ہے جو موجودہ زمانے میں تقریباً ہر گھر کی کہانی بن کر رہ گئی ہے۔ افسانہ ''پرامس'' میں اموا اور اس کے چار بیٹے کی کہانی ہے۔ اموکے تین بیٹے بڑے ہو کر بدیس رہنے لگے ہیں اور چوتھا سیاسی لیڈر بن گیا ہے۔ وقت کی تنگی اور مشغولیت کی وجہ سے چاروں بچے ماں باپ کی خدمت تو دور، خیریت لینے میں بھی انھیں پہاڑ توڑنے جیسا محسوس ہوتا ہے۔ اس افسانے کا خاص موضوع یہ ہے کہ چاروں بچوں نے اپنی ماں سے یہ پرامس کیا تھا کہ ماں کے جنازے کو وہ کاندھا ضرور دیں گے۔ اموجب موت کے قریب پہنچتی ہے تو گھر کی نوکرانی ان کے بیٹوں کو یہ اطلاح دیتی ہے۔ تین بیٹے گھر آجاتے ہیں اور چوتھا بیٹا مشغولیت کی وجہ سے نہیں آپاتا ہے۔ اب تینوں کو یہ انتظار ہے کہ ماں جلدی سے مرتی کیوں نہیں، آخر وہ لوگ انھیں کاندھا دینے آئے تھے، انھیں اپنا وعدہ پورا کرنا تھا۔ سیاسی بیٹا اپنی ماں کی موت کو بھی سیاست کے گندے کھیل سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے، ان کی زبانی، اقتباس ملاحظہ کریں:

''بھائی جان میری بات سنیے۔ اگر خدانخواستہ اموکو آج رات کچھ ہو گیا تو پرائم منسٹر مجھے پرسہ دینے آئیں گے لیکن پرسوں ہماری منسٹری ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے آپ اموکو فوراً کسی اچھے شاندار ہاسپٹل میں لے جائیں۔ ان کے انتقال کی نیوز۔ ٹی۔ وی۔ پر آئے تو ہاسپٹل کا نام بھی ہونا چاہیے۔''

ماں کی موت بھی اب سیاست کا حصہ بن چکی ہے۔ تینوں بیٹوں کی تین دن کی چھٹی بھی پوری ہوگئی مگر



ماں ابھی حیات سے ہے۔ آخر میں ان کے بیٹے جانے لگتے ہیں اور نوکرانی کو ڈالروں کے ساتھ ساتھ ہدایت بھی دیتے جاتے ہیں کہ ماں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ بیٹے کے جاتے ہی ماں کی موت ہو جاتی ہے۔

کہانی کے آخر کا اقتباس غور کریں:

''خواجہ بی اندر آئی اور یہ دیکھ کر ڈر گئی کہ اموکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید انھوں نے اپنے بیٹوں کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ پھر اس نے ایک دکان کا نمبر ملایا۔

'ہیلو..... میّت لے جانے والی ایک لاری بھیج دیجیے اور ساتھ میں چار آدمی بھی ہوں۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔ ان کے لڑکے ہر چیز کا انتظام کر گئے ہیں'۔

جیلانی بانو زمین سے جڑی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ خیالی باتوں کے مقابلے اپنے تجربے میں آنے والی زندگیوں کو اپنے فکشن کا موضوع بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے کردار ہمارے سماج کے ایسے چہرے ہوتے ہیں جو نہ صرف ہمارے قریب کے ہوتے ہیں، بلکہ وہ ہمارے اپنے بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ حسبِ ضرورت طنز کا بھی استعمال کرتی ہیں اور کبھی انسانی دردمندی کے معاملات ایسے ابھر کر سامنے آنے لگتے ہیں جیسے وہ نوعِ انسانی کا مرثیہ لکھ رہی ہوں۔ ان کے بعض افسانوں کو پڑھ کر ہم خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہزار محبوبیت کے باوجود جیلانی بانو کے پاس ایک ایسا قلم ہے جس میں وہ میر انیس کے لفظوں میں مختصر پڑھ کر رلا دینے کی ترکیب جانتی ہیں۔ اس سے ان کے فکشن میں تاثر آفرینی کے مضمرات مزید روشن ہوتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

Research Scholar
Patliputra University, Patna
7033339769


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب: تدریس نامہ<br>درسی کتاب<br>مدیر: پروفیسر شہزاد انجم<br>سن اشاعت: مارچ ۲۰۲۳ء<br>صفحات: ۳۲۰<br>ملنے کا پتہ:<br>جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ | | نام کتاب: کلیات رمز عظیم آبادی<br>صنف: شاعری<br>مرتب: امتیاز احمد کریمی<br>سن اشاعت: ۲۰۱۹ء<br>صفحات: ۳۳۶<br>ملنے کا پتہ:<br>اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار پٹنہ |

● غازی جی۔ حسین

# اتلافِ عظیم

''میری زندگی کی ساری متاع لٹ گئی۔ میں ذہنی مریضوں کے اسپتال میں زیرِ علاج ہوں۔ اب تو کئی ماہ گزر گئے ہیں۔ کتنے ماہ؟ مجھے یاد نہیں ہے۔'' وہ دائیں ہاتھ میں کسی تیز عطر کی شیشی پکڑے وقفے وقفے سے سونگھ رہا تھا اور رسان سے میرے ساتھ بات کر رہا تھا۔ مجھے تو وہ کسی طور بھی ذہنی مریض نہیں لگ رہا تھا۔

میں ایک دوست کے کہنے پر اس شخص سے ملنے گیا تھا۔ اس کی کہانی سننے گیا تھا۔ بقول اس کے کئی ماہ سے اسے کوئی ملنے نہیں آیا تھا۔ اس کی صحت اچھی دکھائی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''آپ کی عمر محض تیس بتیس سال ہے۔ آپ تو ماشاءاللہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو اس فاؤنٹین ہاؤس (دماغی امراض کے مریضوں کے لیے بستیوں سے دور، دو بڑی نہروں کے درمیان، نہایت خوبصورت عمارات پر مشتمل اسپتال، جو مخیّر حضرات کے چندے پر چلتا تھا) سے نکالنے کا بندوبست کروں؟'' وہ چھت کو دیکھنے لگا گیا..... کچھ سوچنے لگ گیا۔ میں پاس بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ پھر وہ بولا۔

''باہر کی دنیا ویسی نہیں جیسی 'وہ' چاہتی تھی۔ میں اب اس دنیا میں واپس جا کر سانس نہیں لے پاؤں گا (وہ وقفے وقفے سے عطر کی بند شیشی کو سونگھتا جاتا) میں یہاں تب تک بالکل سکون سے رہتا ہوں جب تک یہ لوگ مجھے ڈسچارج کرنے کی بات نہیں کرتے۔ یہاں میری خود کلامی کو 'وہ' با آسانی سن سکتی ہے..... اور بعض اوقات جب رات خوب بھیگ جاتی ہے تو وہ مجھے سرگوشیوں میں جواب بھی دیتی ہے۔ مجھے جب بھی ڈسچارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں میں خوف کے مارے باقاعدہ پاگل ہو جاتا ہوں۔''

(آخری جملہ بولتے ہوئے اس نے مسکراتے ہوئے باقاعدہ دائیں آنکھ دبائی۔)

میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہ کون ہے جو رات بھیگ جانے کے بعد آپ کے پاس آ کر سرگوشیوں میں جواب دیتی ہے؟''

اب کی بار اس نے عطر کی شیشی کھولی اور زور زور سے سونگھنا شروع کر دیا۔ کمرہ تیز خوشبو سے بھر گیا۔ پھر گویا ہوا۔

''اس نے ہی مجھے خوشبو جسم اور کپڑوں پر چھڑکنے کی بجائے سونگھنے پر لیکچر دیا تھا۔ تب سے ہی میں



خوش بو سونگھتا رہتا ہوں۔ قریب ہو کے دیکھ لو..... سونگھ لو..... مجھے کئی دن گزر گئے نہائے ہوئے، میرے بدن سے کوئی بو آتی ہے؟ 'وہ' بھی مکمل طور پر مجسم، دار چینی کے درخت کی ڈال بن چکی تھی..... ہر وقت مہکتی۔''

مجھے لگا، اس نے میرا سوال سمجھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے دوبارہ پوچھا۔

''بتائیے بھی میرے صاحب! 'وہ' کون ہے جو راتوں میں آ کر سرگوشیاں کرتی ہے؟''

وہ ایک دم تن کر سیدھا بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں چمک بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''وہ مجھے ایک بڑے شہر میں منعقدہ تقریب میں ملی تھی۔ ایک دوست نے تعارف کروایا تھا۔ زیست فاطمہ..... ہاں زیست فاطمہ!'' وہ گردن ہلائے جا رہا تھا اور مجھ پر آنکھیں گاڑے اس کا نام پکارے جا رہا تھا۔

یارو! کیا اداکار بندہ تھا۔ 'اس' کا نام لیتے لیتے اس کے چہرے پر ایسا رنج والم کھنڈنا شروع ہو گیا جس نے میرے دل کو مسوس کے رکھ دیا۔ پھر چند لمحات بعد ہی ایسے دھاڑیں مار مار کر رونے لگ گیا جیسے اس نے کسی دل کے قریب رہنے والے کا مردہ چہرہ دیکھ لیا ہو۔ ایک عجیب پریشانی اور گھبراہٹ نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے اس طرح یک دم موڈ بدل لینے اور فلک شگاف بینوں نے مجھ پر عیاں کر دیا کہ وہ واقعی اسی عمارت میں رہنے کے لائق تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر ہسپتال کا عملہ اس کمرے میں پہنچ گیا۔ انھوں نے درشت لہجے میں، مجھے فوراً وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا..... اور میرے پاس باہر نکل جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ سٹاف اسے قابو کر کے کوئی ٹیکہ لگانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں اسپتال کے MS کے کمرے میں آ بیٹھا۔ میں نے دوبارہ آنے اور اس مریض سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے دبے دبے سے انداز میں ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نے پچیس ہزار روپے کا چیک برائے بہبودی فنڈ کاٹ کر دیا اور ساتھ ہی اس مریض سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے ڈاکٹر کو وضاحت دینی پڑی کہ میں اس کے اسپتال کے لیے اپنے وسیع تعلقات کی بنا پر کافی فنڈز جمع کر سکتا تھا۔ تب اس نے کھسیاتے ہوئے میرا فون نمبر مانگا اور کہا کہ میں انتظار کروں، وہ خود فون کر کے مجھے کسی مناسب دن بلائے گا۔

میں جب اسپتال سے نکل کر ساٹھ برس قبل کھودی گئی بڑی گم نہر کے پل پر پہنچا تو نہر کے دونوں کنارے کٹاؤ کا شکار نظر آئے۔ نہر کے دونوں کناروں پر، ساٹھ برس قبل نہر کھود کر نکالی گئی مٹی کے بلند ٹیلے تھے۔ ان ٹیلوں پر خودرو جھاڑیوں کا بے ترتیب سبزہ اگا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا ان جھاڑیوں میں ہر طرح کے زہریلے حشرات کی آماج گاہیں بن چکی تھیں۔ عجیب اداسی کا منظر تھا۔ یوں لگتا تھا نہر کا کوئی والی وارث نہ تھا..... شاید اب تو پورے ملک کا ہی کوئی والی وارث نہ تھا۔ اداسی تھی..... عجیب حدت کا احساس تھا۔

جس دوست نے مجھے اس اسپتال میں قید شخص کا بتایا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اس سے بڑا

مچلہ بلکہ مکار شخص نہ دیکھا تھا، جو زندگی کی عام ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے مصنوعی پاگل پن کا ڈھونگ رچا بیٹھا اور اب مزے سے خیراتی ادارے میں جیون بیتا رہا تھا۔

کوئی ہفتہ بعد مجھے فاونٹین ہاوس کے MS کی فون کال موصول ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا اب میں جب مرضی پیشگی اطلاع دے کر اس مریض سے ملنے آ سکتا تھا۔ اس نے دبی دبی خوشی میں میرا دیا ہوا چیک بھی کلیئر ہونے کی خبر سنائی۔ ساتھ ہی اس نے دوستوں سے چندہ جمع کرنے کی طرف اشارہ بھی دیا۔

میں اگلے دن، صبح دس بجے اسپتال میں ڈاکٹر کے کمرے میں موجود تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا آپ، اس دن، اس مریض کے یک دم فلک شگاف رونے کی وجہ بتا سکتے ہیں؟'' ڈاکٹر کا جواب تھا۔

''دیکھیے! بظاہر وہ ایک نارمل انسان ہے۔ بس، اپنے ماضی میں اپنے آپ سے جڑی کسی شخصیت کے متعلق وہ اپنے جذبات کسی کو نہیں بتا پایا۔ ہم اسے جب اس شخصیت تک لے جاتے ہیں تو وہ رونے لگ جاتا ہے۔ ہم نے مختلف ادویات دے کر بھی اس سے اس شخصیت کے متعلق اگلوانے کی کوششیں کی ہیں۔ لیکن اس کے تحت الشعور میں ماضی کے حوالے سے کوئی ایسی گرہ بندھ چکی ہے کہ اب نہ وہ کچھ بتانا چاہتا ہے اور نہ ہی اپنی کہانی سنانا چاہتا ہے۔ اگر ماضی پر بات نہ ہو تو وہ بالکل نارمل انسانی رویہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ ہمارے کچن کے کاموں اور ہسپتال کے گرد پھیلے باغیچوں کی دیکھ ریکھ میں بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اور ہم نے جب بھی اسے یہاں سے ڈسچارج کرنے کی بات کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ جاتا ہے۔ وہ عام انسانی سماج سے خائف ہو چکا ہے۔''

''ہمم! ڈاکٹر صاحب! کیا وہ تاعمر یہیں رہے گا؟'' ڈاکٹر نے فرمایا۔

''دیکھیے وہ سوچ کے جس بلیک ہول میں گر چکا ہے، اگر اس سے کبھی باہر نکل آیا تو ممکن ہے وہ نارمل سماج کی طرف لوٹ جائے ورنہ تادمِ مرگ اسے یہیں رہنا ہوگا۔''

میں اور ڈاکٹر کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر ایک رجسٹر میں کچھ لکھتا رہا اور میں ڈاکٹر کی میز پر شیشے کا پیپر ویٹ گول گول گھماتا رہا۔ پھر ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آپ کہانی نویس ہیں۔ کہتے ہیں ادیبوں کا وجدان بھی کسی ماہرِ نفسیات سے کم نہیں ہوتا۔ اگر آپ کوشش کریں تو شاید وہ ان وجوہ کو بیان کر دے اور اس کی روح اس منحوس غبار سے باہر نکل آئے۔''

''ہمم! مجھے آپ کا مثبت اور پورا تعاون میسر رہا تو شاید ایسا ممکن ہو جائے۔''

میں نے اس دن کے بعد وقفے وقفے سے اس ہسپتال کے نو دورے کیے۔ ہر بار میں اس سے موسم، پھولوں، فلموں، ناولوں، افسانوں بلکہ ہر اس موضوع پر گفتگو کرتا جس میں اس کی دلچسپی ہوتی۔ وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ یونیورسٹی میں سوشیالوجی اور اضافی مضمون فلسفہ کے ساتھ ایم فل کا ڈگری ہولڈر



تھا۔ ایم۔ایس سی اور ایم فل میں تھیسز لکھنے کے لیے اسے ased stratifictional social genderstudies پر تحقیقات کے لیے مختلف طبقات اور اداروں میں جانے کے مواقع ملتے رہے تھے۔ وہ سماج میں فرقہ وارانہ نفرت کے ملکی و غیر ملکی اسباب، ذات برادری کی بنیاد پر عناد اور قتل و غارت، استحصالی طبقات کی معاونت کرنے والی سرکاری مشینری کی کارستانیوں اور گپت میکانزم پر مکمل شعور رکھتا تھا۔ اور کسی کالج میں لیکچرار بن کر بقیہ زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔

میں اپنے ہر دورہ کے اختتام پر اس سے اس کی پسند کی کوئی چیز بطور تحفہ لانے کا پوچھتا۔ اور وہ رسان سے مجھے اپنی فرمائشیں نوٹ کروا دیتا۔

آج میرا دسواں دورہ تھا۔ آج میرے پاس اس کے لیے اس کی فرمائش کے موجب سب سے مہنگا تحفہ تھا..... ایک سارنگی! جب کہ اس سے قبل زیادہ تر اس نے مجھ سے پھلوں کے چھلکوں سے کشید عطریات منگوائے تھے۔ ایک بار اس نے مبادیاتِ سوشیالوجی کی کتاب..... پھر آرٹ پیپر اور خاص طرح کی ڈرائنگ پنسلیں بھی منگوائی تھیں۔ سوشیالوجی کی کتاب مجھ سے پکڑ کر اس نے کہا تھا۔

''یارا! مجھے ڈر ہے کہیں میں سوشیالوجی ہی نہ بھول جاؤں۔'' (یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے دائیں آنکھ بھی ماری۔)

میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ مجھے اس سے انس نہیں بلکہ محبت ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اپنے ملک کی نوجوان نسل کا بلند شعور نمائندہ محسوس ہونے لگ گیا تھا۔ سلجھا ہوا، حساس، زیرک..... لیکن میرے محبوب وطن کے سارے نوجوان اس کی طرح کسی پاگل خانے میں قید تو نہیں تھے۔

میرے دسویں دورے پر جب اس نے سارنگی دیکھی تو وہ اسے لینے کے لیے جھپٹ پڑا۔ اس نے عطر کی شیشی سے خوب لمبے سانس بھرے..... عطر کی شیشی احتیاط سے ایک طرف رکھ دی۔ خوشبو کھینچنے کے بعد وہ سارنگی کے تار کسنے لگ گیا۔ اس نے سلائی پر بندھے گھنگرو گنے ان کو ہلا کر بجا کر دیکھا۔ کئی منٹ وہ پوری محویت میں سارنگی کو بجانے کی حالت میں لانے پر مصروف رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں..... سر دائیں جانب ڈھلکا لیا..... سارنگی کو بائیں کندھے اور ٹھوڑی کے درمیان ٹکا کر سلائی چلانی شروع کر دی۔ سلائی کے ساتھ بندھے گھنگرو آہستہ بج رہے تھے۔ چند ساعتوں کے بعد ہی میں نے محسوس کیا گھنگروؤں کی تھاپ بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا، کسی گزر چکے نامعلوم زمانوں کی نامانوس زبان کی تانیں بکھرنا شروع ہو گئی ہوں۔ موسیقی جس بھی زبان میں تھی..... تھی مسحور کن۔ کوئی دس منٹ تک سارنگی سے اداس موسیقی جاری رہی..... اور آخر میں گھنگھروؤں کی تھاپ بلند ترین سطح پر پہنچ گئی۔ غالباً اس کی روح برستہ آہنگ روحانی دنیا میں کسی کو آواز دی رہی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کی بند آنکھوں سے آنسوؤں کی باریک دھاریں

اس کے ناک کے بانسے کے دونوں جانب ٹھوڑی تک پہنچ کر اس کے دامن میں گر رہی تھیں۔ میں اس کی محویت دیکھ کر اور ان جانی مگر مسحور کن دھن سن کر مبہوت و ساکت تھا۔ میرا جسم شل ہو چکا تھا۔ میں صرف آنکھوں کی پتلیاں گھما سکتا تھا۔ اس حالت میں دنیا کا کوئی بھی ذی شعور اسے پاگل نہ مانتا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا، کوئی دس منٹ سے اوپر ہو گئے تو اس نے سارنگی بجانا روک دیا۔ آنسوؤں کے وضو سے نتھری آنکھیں مجھ پر گاڑتے ہوئے بولا۔

''جی صاحب جی! تو آپ اس دن زیست فاطمہ کے متعلق پوچھ رہے تھے؟''

میں گہرے ٹرانس سے چونک کر باہر نکلا۔ جھٹکے سے جسم سیدھا کیا اور بلا ارادہ میری زبان سے نکلا۔

''جی میرے آقا!'' (مجھے یوں لگا تھا کہ وہ میری قوم کے نوجوانوں کا نمائندہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ اپنی عدن سے دیس نکالے پر نکلا کوئی دیوتا تھا۔) اس نے بولنا شروع کیا۔

''میں اسے ایک بڑے شہر میں منعقدہ تقریب میں ملا تھا۔ تقریب میں موجود تمام خواتین سے الگ شخصیت۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراوزرز اور شارٹ شرٹ میں ملبوس۔ سیدھا لانبا قد، نہایت کسا ہوا نسوانی جسم جیسے کوئی رقاصہ..... عمر یہی کوئی چالیس کے آر پار۔ اس دن یومِ کشمیر پر تقاریر تھیں۔ وہ صدرِ محفل تھی۔ اپنے صدارتی خطبے میں اس نے ایک نہایت اہم نکتہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ ہم کبھی بھی مقبوضہ کشمیر کو آزاد نہیں کروا سکتے جب تک ہم اپنے زیرِ انتظام کشمیر کو مکمل طور پر ایک آزاد ریاست نہ مان لیں۔ وہاں اپنی اور اپنے دوست ممالک کے سفارت خانے قائم نہ کریں۔ اور جب تک اس آزاد کشمیر کو UNO میں رکنیت نہ دلا دیں۔ تب مقبوضہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کو ایک بین الاقوامی قانونی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ کشمیر کی مکمل آزادی تک پاکستان ایک قانونی معاہدہ کر کے آزاد کشمیر کا دفاع اپنے پاس رکھے۔ ہمیں کروڑوں کشمیریوں کی تڑپتی روحوں کو آزاد کروانا ہے نہ کہ علاقے فتح کرنے ہیں۔'' پورا ہال ساکت تھا۔ اس کے چہرے کا جلال اس کی آواز میں بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ ایک مذہبی شدت پسند حکومت کبھی دوسری مذہبی شدت پسند حکومت سے جنگ نہیں کرتی۔ اس نے مثال دی کہ غاصب عربی بادشاہتیں کبھی اسرائیل سے جنگ نہیں کریں گی۔ اسرائیل لقمہ بہ لقمہ فلسطینی علاقے ہڑپ کرتا جائے گا۔ اس نے رک کر مجھے پوچھا۔

''کیا آپ میری بات سن اور سمجھ رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''I am all ears'' وہ دوبارہ بولنا شروع ہوا۔

''میں تیس سال کی عمر تک 'محبت' کے کچھ کچھ تجربات سے گزر چکا تھا لیکن من میں تنہائی کا احساس ختم نہیں ہو سکا تھا۔ اور پھر اس روز مجھے 'عشق' ہو گیا۔''

میں آپ کو بتاتا چلوں کہ اس روز میں MS صاحب کو بہبودی فنڈ کا دوسرا چیک پیش کر کے 'اس'



کے ساتھ رات گزارنے کی اجازت لے چکا تھا لہذا میرے پاس اس کی کہانی سننے کے لیے ساری رات پڑی تھی۔ کہتے ہیں جوں جوں رات گزرتی ہے تو وجدان اور اسرار باہم یک جان ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ عارفین کہیں ایسے لمحوں میں ہی عرفان و آگہی کی منزل پاتے ہیں۔ میٹا فزکس کے ان دیکھے جہانوں میں پڑے گھمسان کے رن خاص حالتِ تدبر و تفکر میں وجدان کے عروج پر پہنچے ذہنوں کے پردہ شعور پر کچھ خاص اترتا ہے۔ قدرت شعور سے لاشعور پھر اس سے بھی آگے شعورِ حقیقی تک رسائی عطا کرتی ہے..... تب دنیا بھر سے سوجھوان، دانش ور، سائنس دان، صوفیا اور شعرا انمٹ لکھتیں لکھ دیتے ہیں۔

اس دوران اسپتال کا ہیڈ کک ہمارے کمرے میں چائے کا تھرماس اور دو کپ رکھ گیا۔ میں نے اسے چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی بات جاری رکھیے۔'' اس نے سلسلہ کلام دوبارہ شروع کیا۔

''میں نے اپنے دوست سے اس کا سیل نمبر حاصل کر کے رات ہی اسے کال ملا دی اور صاف کہہ دیا۔ محترمہ! مجھے آپ سے عشق ہو گیا ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا کرتے ہو؟''

''جی! میں ٹیوشن مل جائے تو پڑھا لیتا ہوں، رپورٹ رائٹنگ کر لیتا ہوں۔ کبھی کبھی اخباروں یا جرائد کے لیے فری لانسر کے طور چھوٹے موٹے تحقیقاتی آرٹیکل اور مضامین لکھ لیتا ہوں۔ چھڑا چھانٹ ہوں۔ اپنے اچھے گزارے کے لیے کما لیتا ہوں۔ اور حال مست رہتا ہوں۔ اس نے لمبا ہمم کہا۔ پھر مجھے فون پر ایک دو لمبے سانس کھینچنے کی آواز آئی۔ بولی، تم میرے فلیٹ پر کل شام ۵ بجے آؤ گے اور رات ۹ بجے تک رہو گے۔'' میں نے بھی جھٹ جواب دیا۔ ''اوکے!''

وہ کچھ دیر رکا۔ پھر بولا۔

''جناب! میں نے مرنے سے پہلے ہی اپنی موت کی طرف قدم اٹھا لیا تھا۔ یا یوں کہیے میں نے ان جانے میں اپنی ایک نئی پیدائش کے لیے حامی بھر لی تھی..... عشق کر لیا تھا۔ بعد میں زیست فاطمہ نے سچ ہی تو کہا تھا..... کیسے ممکن ہے کہ انسان عشق کا دعویٰ کر دے اور تبدیل بھی نہ ہو۔ جیتے جی ایک نیا جنم نہ لے۔

اگلے دن میں اس کے بتائے ہوئے پتہ پر بروقت پہنچ گیا۔ اس نے بانہیں وا کرتے ہوئے مجھے گلے لگانا چاہا لیکن پھر بجلی کی سی سرعت سے مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے خود بھی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ انتہائی ناگواری سے بولتے ہوئے کہنے لگی۔ اتنا تیز پرفیوم؟ بندہِ خدا! کسی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آئے ہو یا کسی جیتے جاگتے انسان سے ملنے آئے ہو؟ اگر تم مجھ جیتے جاگتے انسان سے ملنے آئے ہو تو تم تو میری خوشبو محسوس کرو گے پر تمھاری اس تیز خوشبو میں دبی لاش کو کیوں سونگھوں؟ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ مجھے لگا میرے بدن سے سارا خون

خشک ہو گیا تھا۔ وہ دوبارہ بولی۔ اب آ ہی گئے ہو تو اندر آ جاؤ۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ باتھ روم ہے۔ خوب مل مل کے نہاؤ اور یہ جعلی خوشبو اتار پھینکو۔ ممکن ہو تو اپنی قمیض بھی پانی میں نتھار لو۔ میں استری کر دوں گی..... تب تم زندوں میں تو شمار ہو سکو۔''

وہ خاموش ہو گیا اور میں دم بخود اسے دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے ادراک ہو چکا تھا کہ آج رات عرفان کی رات ہے۔ ایک لمبا سانس بھر کے اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

''اس کا گھر میرے لیے مقدس آستانہ بن گیا (حالانکہ وہ میری اس بات پر کراہت کا اظہار کرتی تھی)۔ بقول زیست فاطمہ اس کی تربیت و پرورش ایسے آزاد ماحول میں اور ایسے نابغہ لوگوں کے زیر سایہ ہوئی تھی جنہوں نے صدیوں سے چلتے آ رہے فلسفہ کے سبھی دبستانوں سے تعارف کروا دیا تھا۔ جنہوں نے اسے عالمی ادب پڑھنے پر مہمیز کیا تھا۔ انھوں نے اسے اوائل عمری میں ہی تاریخ عالم (خاص کر نو آبادیات میں سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں معصوم انسانوں کے ہر طرح کے استحصال کی تاریخ ازبر کروادی تھی) مذاہب کے تقابلی مطالعے اور خاص طور پر وطن عزیز میں سامراجیوں کے بغل بچوں کے ذریعے مذہب کو عوام کی غلامی کے طور پر استعمال کرنے کے ہتھکنڈوں سے روشناس کروا دیا تھا۔ سماجیات کے ارتقاء اور سماجی تجرید پر اس کی فکر کو صیقل کر دیا گیا تھا۔ وہ بتاتی تھی کہ اس کا نانا اس کے لیے علم کا جن تھا۔ وہ علوم پر دسترس کے لیے سکولی تعلیم کے خلاف تھا۔''

وہ ذرا دم لینے کے لیے رکا۔

''وہ مجھے بتاتی تھی کہ اس کے نانا مختلف ساز بجانے والوں کو بلا لاتے اور پھر وہ راگی اسے سازوں کے اسرار پر تعلیم دیتے۔ انھوں نے ہی مجھے گھنگرو، ڈھول، بانسری، تان پورا، طبلہ اور سارنگی کے اسرار سمجھائے۔ وہ جدید پرفارمنگ آرٹس اور سٹریٹ تھیٹر میں تربیت یافتہ تھی۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی علاقائی رقص ہو گا جس میں اسے مہارت اور علم نہ ہو گا۔ سادہ طرز زندگی پر اس کا ایمان تھا اور اس کے ساتھ رہ رہ کر میں بھی روائیتی اناج کھانا چھوڑ گیا۔ وہ تصوف اور مراقبہ میں اتنی درک رکھتی تھی کہ سیل فون پر ہی دور دراز درد میں تڑپتے ہوئے کسی بھی انسان کو رہنمائی دے کر منٹوں میں شانت کر دیتی۔ اس کی آمدن کے کئی ذرائع تھے لیکن ان میں جسم فروشی ذریعہ آمدن نہ تھا۔ اس نے مجھے ایک روز بتایا تھا کہ اسے ایسا اصل مرد ملا ہی نہیں تھا جس کا من و جسم ہر بو سے پاک ہوتا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ 'ہماری زندگیاں نارمل تب تک نہیں ہو سکتیں جب تک عوام باشعور نہیں ہو جاتی اور یہ بے بس اکثریت مردار خور اقلیت اشرافیہ پر غالب نہیں آ جاتی۔'

اس کی باتیں اتنی تفصیلی تھیں کہ آدھی رات سر پر آ گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور سارنگی پر ایک مدھم سا راگ چھیڑ دیا۔ جدائی میں چیختی کونج کی کرلاٹ جیسا راگ۔ میں نے بھی کپ چائے سے بھر لیا۔ چند منٹوں بعد اس نے سارنگی بجانی روک دی اور پھر بولنا شروع کیا۔



''اس کا فلیٹ جڑی بوٹیوں کی خوشبوؤں سے مہکتا رہتا۔ اس نے مجھے بھی عطر سونگھنے پر لگا دیا۔ اس کے فلیٹ میں چند آلات موسیقی بھی تھے۔ وہ بتایا کرتی تھی..... تان پورہ صرف محبت کے سروں کے لیے بنا ہے..... بانسری روح کی نمائندہ ہے..... ڈھول مرکب ہے درخت اور کھال کا نر اغیض و غضب کا اظہار..... سارنگی روح کی شارح اور گھنگرو مخنثوں اور طوائفوں کی غلامی کی علامت۔ اور طبلہ ٹین ایجرز کی چنچلتا کا غماز اور کتھک پر اکسانے والا۔ اب غور کرو تو سارنگی کی سلائی پر گھنگھروں کا گچھا سارنگی سے روح کے رنگوں میں کبھی خوشی کا تاثر دیتا ہے اور کبھی غلامی کے متعلق چیخ کر ساتھ دیتا ہے۔ وہ ان سب سازوں کو بجانے کی ماہر تھی۔ لیکن اس نے مجھے صرف سارنگی بجانی سکھائی۔ وہ بیچ بیچ میں کئی کئی دن کے لیے مختلف علاقوں کے دوروں پر نکل جاتی۔ وہ مجھے سیل فون پر اپنی تصاویر بھیجتی۔ اگر وہ کسی ایک مرد یا زیادہ مردوں کے جھرمٹ میں ہوتی تو مجھے جلن محسوس ہوتی۔ ایک روز اس جلن کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے پوچھ ہی لیا کہ اس کے ساتھ کھڑا مرد کون تھا؟ اس نے الٹا مجھے سوال پوچھ لیا۔ یہ بتاؤ جب میں اپنی اکیلی کی کوئی تصویر تمھیں بھیجتی ہوں تو تم اس میں کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا آپ کو اور ارد گرد منظر کو۔ وہ منظر جو تصویر کا حصہ ہوتا ہے۔ اس نے کہا جب میں مردوں کے ساتھ تصویر بھیجوں تو تم صرف مجھے دیکھا کرو۔ باقی تو فطری منظر کا حصہ ہوتے ہیں۔

اسے اپنی وطنی عوام سے عشق تھا۔ اسے اسٹیبلشمنٹ اور اس کے گماشتہ اداروں پر ترس آتا تھا۔ وہ ان کو عوام کے لیے عذاب خداوندی نہیں بلکہ شیطان کا سایہ قرار دیتی تھی۔ اسے اپنے ملک میں مذہبی قوانین کے تحت سزاؤں میں عوامی حقوق کی پامالی اور عذاب خداوندی نظر آتا تھا۔ اسے صوفیا سے عشق تھا۔ وہ سترہویں صدی کے سندھی صوفی عنایت کی اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کو اپنا آئیڈیل مانتی تھی۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی نوجوانوں کو بھیجنے کے خلاف بات کرتی تھی۔ جب کہ اپنے ملک میں صوبائی سطح پر حقوق کے حصول کے لیے پیکار میں لگی تحریکوں کی حامی تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ وطن عزیز ایک طاقتور اقلیت کے ہاتھوں یرغمال ہو چکا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب عوام کے تار و پود بکھرنے لگ گئے تھے۔ اشرافیہ کی مکاریاں عام عوام میں اخلاق کا جنازہ نکال رہی تھیں۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ وہ اس کے ان نظریات کی تفصیلات بتا رہا تھا جن کو میرے جیسا بزدل راوی لکھ ہی نہیں سکتا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، نیند جیسا اسم مجرد اس کمرے میں اپنی معنویت کھو چکا تھا۔ وہ سارنگی کے ساتھ سر ٹکائے نیم دراز ہو گیا۔ اس کی نیم وا آنکھوں سے آنسوؤں کے لہریئے پھر رواں ہو گئے۔ تب وہ یک دم بولنا شروع ہو گیا۔ مجھے گمان گزرا وہ اپنے سینے پر پڑی یادوں کی بھاری سلوں کو جلد از جلد اتار دینا چاہتا تھا۔

''غالباً چھ ماہ گزر گئے تھے..... مجھے اس سے ملتے ہوئے۔ میں بھول چکا تھا کہ اسے کہوں مجھے آپ

سے عشق ہے۔ وہ عامل تھی، میں اس کا معمول۔ ایک دن ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ خود ہی پوچھنے لگی۔ ہاں! تو مسعود میاں وہ جو تمھیں مجھ سے عشق ہوا تھا، اس کا کیا بنا؟ میں پسینے میں نہا گیا۔ میں نے لجاجت سے جواب دیا وہ تو اب اور بھی سوایا ہو گیا ہے جی! وہ آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ دیکھو میں نے آج تک کسی مرد کو اپنے بدن کو چھونے کی اجازت نہیں دی۔ وجہ؟؟؟ وجہ یہ ہے کہ وہ سب زمین بن کے محبت کے متلاشی رہتے ہیں۔ اور میں چشمہ ہوں۔ زمین پوجا چاہتی ہے۔ چشمہ رواں رہتا ہے۔ چشمے کا جوہر اس کا مقطر آبِ رواں ہوتا ہے۔ وہ آبِ مقطر چلتا رہتا ہے..... ندیوں میں جا ملتا ہے..... ندیاں دریاوں کی بانہوں میں اور دریا آخر کار سمندروں کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ اب ایک چشمہ کسی زمینی ٹکڑے سے کیسے محبت کرے؟ تم مجھ سے محبت کرو۔ چشمہ بن سکتے ہو تو بن جاؤ۔ ہم ندی میں ایسے اکٹھے ہوں گے کہ پھر ابد تک جدا نہ ہوں گے۔ ورنہ، کم از کم گل بنفشہ بن کر میرے سوتے کے گرد اگ جاؤ۔ میں خزاں رتوں میں تجھے الوداع کہا کروں گی اور ہر بہار میں خوش آمدید کہا کروں گی۔ تمہاری مہین جڑیں ہمیشہ مجھ سے تازگی کشید کرتی رہیں گی۔

میں منمنا کر بولا، میں آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ بس آپ کے اردگرد رہنا چاہتا ہوں۔ اس آگے میری سوچیں جواب دے چکی ہیں۔ تب اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے پہلی بار گلے لگایا۔ میرے قویٰ مختل پڑ گئے۔ بس ناک میں دارچینی کی بھینی بھینی خوشبو اور چرخے سے اترے تازہ تازہ ریشم کے لچھے کا احساس میری یاداشت میں نقش ہو گیا۔ مجھے ہمیشہ کے لیے دنیا کی ہر عورت سے دور کر گیا۔

پبلک پارک کے ایک سرسبز کنج کے نیچے اس بنچ پر وصل کی اس صورت (اور میرے تئیں وصل کی یہ حد بھی تھی) اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا، مسعود! غور سے سنو! یہ قوم اتلافِ عظیم کا شکار ہو چکی ہے۔ ہم سب کو شادی وادی جیسی نازک اور عام سوچیں پسِ پشت ڈال کر جدوجہد کرنی ہے تاکہ وطن عزیز کی اکثریت اس بے دل، بے ضمیر اور قوم فروش اقلیت پر غالب آ سکے۔ ہمیں نہی عن الشر اور امر بالخیر کا نعرہ لگانا ہے۔ اگلی نسلیں ہماری خاک پر حقیقی مسرتوں کے گلستاں آباد کریں گی۔ پھر وہ شادیاں کریں گے۔ ہم پھر انہیں فضاؤں میں آب وگل کے نئے روپ میں ظاہر ہوں گے۔''

رات اپنے اختتام کے قریب لگ رہی تھی۔ ہسپتال کی مسجد سے پہلی اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی..... میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مسعود سے پہلی ملاقات پر کرب والم میں رونے کی دھاڑیں آج نہ تھمنے والے آنسوؤں کی شکل میں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مجھے خوف لاحق ہو گیا کہیں وہ دوبارہ سے اسی دن والی حالت سکر میں نہ چلا جائے۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے ہی بولا۔

پھر ایک شام اس کی مجھے کال آئی۔ لمبی بات چلی۔ اس نے مجھے کہا یاد رکھنا میں نے تجھے دیمک کے کیڑوں سے بچا لیا ہے۔ تم کبھی بے مراد نہ رہو گے۔ فکر کو دیمک نہیں لگے گی۔ وہ مجھے دنیا کا مستقبل بتا



رہی تھی۔ اور آخر میں اس نے کہا وہ اگلے دن علی الصبح روانہ ہو جائے گی۔

جناب! پھر وہ چلی گئی۔ وہ گم ہو گئی۔ بہتا چشمہ کسی ندی میں جا گرا۔ اور ندی کسی دریا میں شامل ہو گئی۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ دریا کسی سمندر میں جا شامل ہوتے ہیں۔ جوہر تو پانی ہی ہے ناں! سنا ہے وہاں کی سرزمین پر کئی دریا پھوٹتے ضرور ہیں لیکن ان کو سمندروں کی وسعت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ اپنی گزرگاہوں میں آنے والے کسی ریگزار یا دشت کے عشق میں زیرِ زمین چلے جاتے ہیں..... غائب ہو جاتے ہیں..... گم ہو جاتے ہیں۔''

پو پھٹ رہی تھی۔ میں نے مسعود میاں کا ہاتھ پکڑا، اس کی سارنگی اور سلائی اٹھائی۔ اسے فاونٹین ہاوس کے مشرقی سبزہ زار میں لے گیا۔ مشرق میں گم نہر کے کنارے اونچے ٹیلوں پر خودرو جھاڑیوں کے اوپر سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ میں مسعود کے گردندھوں پر بازو رکھ کر، بالکل چپک کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کے سراپا سے دارچینی کی بھینی بھینی مہک سی اٹھتی بہت بھلی لگ رہی تھی اور وہ سارنگی پر کوئی قدیم راگ چھیڑ رہا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

Principal Noor Pur Public High school
JOIYANWALA MOOR
P.O MONO PUR SHEIKHUPURA
Punjab Pakistan.0323 5518363

**اقبال حسن آزاد**

کا

**چوتھا افسانوی مجموعہ**

**اوس کے موتی**

**(زیر طبع)**

● اقبال حسن آزاد

# عورت کا نشہ

سلطان کے دادا نے تین شادیاں کی تھیں۔لیکن اس کے باوجود ان کی پیاس نہ بجھتی تھی،سو وہ اکثر و بیشتر بالا خانوں کی بھی سیر کر لیا کرتے تھے اور قوت باہ برقرار رکھنے کے لیے مقوی اشیاء کا بکثرت استعمال کیا کرتے تھے۔وہ سگریٹ فیکٹری میں سپر وائزر کے عہدے پر فائز تھے اور ساتھ ہی ساتھ آم کے باغات اور کھیت کے مالک بھی تھے لیکن ان کی عیاشیوں کی وجہ سے ان کی آمدن کا بڑا حصہ بالا بالا خرچ ہو جایا کرتا تھا۔نوبت بہ ایں جا رسید کہ دھیرے دھیرے کھیت اور باغات فروخت ہوتے گئے اور اب لے دے کے بس ایک نوکری رہ گئی تھی جس کی آمدنی میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔بالا خانوں کی سیر بند ہو چکی تھی اور اب بیویوں کا سہارا تھا۔بڑی اور منجھلی تو مصلیٰ بچھا کر تائب ہو چکی تھیں البتہ چھوٹی بیوی میں کچھ دم خم باقی رہ گیا تھا۔

انہیں اپنی بیویوں اور بچوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا اور بیٹیوں کو تو وہ وبال جان سمجھتے تھے۔چنانچہ چھوٹی کے بطن سے جب بیٹی پیدا ہوئی تو وہ منھ بناتے ہوئے باہر نکل گئے۔دایا اپنا محنتانہ وصول کرنے کے لئے چوکھٹ پر بیٹھی تھی مگر گھر میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔سلطان کے والد فرحان کی عمر اس وقت سولہ سترہ برس کی رہی ہوگی۔انہوں نے اپنا کرتہ پاجامہ پہنا اور سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔وہاں دن بھر مزدوری کرنے کے بعد جو رقم حاصل ہوئی اس سے انہوں نے دایا کا حساب چکتا کیا اور باقی پیسوں سے نوزائیدہ کے لئے چند چھوٹی موٹی اشیاء خریدیں۔یہ باتیں سلطان کو اس وقت معلوم ہوئیں جب وہ میٹرک کا امتحان پاس کر چکنے کے بعد کالج میں داخلہ لینے کے لئے کوشاں تھا۔اس وقت تک اس کے دادا حضور مرغن اور مچرب غذاؤں کے بکثرت استعمال کے نتیجے میں فالج کا شکار ہو کر جنت مکانی ہو چکے تھے۔ان کے انتقال کے بعد پشتینی مکان کو اونے پونے فروخت کر دیا گیا تھا اور سبھی متعلقین اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے تھے۔فرحان میاں نے اپنے حصے کی رقم سے اپنی دو بیٹیوں کی شادی کی اور اپنے افراد خانہ کے ساتھ شہر کے ایک گنجان علاقے میں کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔یہاں پانی کی بڑی قلت تھی اور انہیں دور دور سے پانی بھر کر لانا پڑتا تھا۔اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ بچا تھا چنانچہ انہوں نے چوک بازار میں واقع کپڑوں کی دکان پر سیلز میں کی نوکری اختیار کر لی تھی۔سلطان اس وقت تک بی اے پاس کر چکا تھا اور اس نے بھی محلے کے چھوٹے چھوٹے



بچوں کو ٹیوشن دینا شروع کر دیا تھا۔پھر بھی آمدنی بہت کم تھی اور گذارا بڑی تنگی ترشی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ایک روز جب وہ رات کو ٹیوشن پڑھا کر گھر لوٹا اور رات کے کھانے پر بیٹھا تو پایا کہ رکابی میں چند سوکھی روٹیوں کے ساتھ دن کا بچا ہوا سالن دھرا ہے۔وہ سمجھ گیا کہ گھر میں پیسے ختم ہو چکے ہیں اور بنیئے اور سبزی والے نے ادھار دینا بند کر دیا ہے۔اس کے دل میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور وہ بغیر کھانا کھائے اٹھ کھڑا ہوا۔ماں سے کہہ دیا کہ جہاں ٹیوشن پڑھانے گیا تھا وہاں سے ناشتہ کر کے لوٹا ہوں۔بھوک نہیں ہے۔

ایک روز فرحان میاں دکان سے لوٹے تو ان کا چہرہ فرط جذبات سے تمتما رہا تھا۔گھر والوں نے انہیں اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے مالک نے بازار میں کپڑوں کا ایک بڑا شوروم بنوایا ہے اور جمعہ کے روز اس کا افتتاح ہونے والا ہے مگر اصل خوشی کی بات تو یہ ہے کہ وہ سلطان کو وہاں کا منیجر بنانا چاہتے ہیں اور تنخواہ کافی اچھی خاصی ہوگی۔سلطان نے یہ سنا تو اسے بھی خوشی حاصل ہوئی۔وہ بھی ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے بور ہو چکا تھا۔زیادہ تر بچے پس ماندہ خاندان سے تھے جن کا تلفظ بھی درست نہ تھا۔ذہن بھی بس اوسط درجے کا ہے۔ان کے ساتھ مغز پچی کرتے کرتے اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔اور پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری سے تیسری جگہ آتے جاتے اس کا دل کوفت سے بھر جاتا تھا۔اس نے چشم تصور میں خود کو شاندار ایئر کنڈیشن شوروم میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا پایا جہاں خوشبوؤں میں لپٹی حسینائیں ہنستی کھلکھلاتی رنگ و نور کی برسات کر رہی تھیں۔سلطان ابھی جوان تھا لیکن جوانی کی کوئی نشانی اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔لیکن اسے بارہا یہ خیال آتا کہ:

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غم زندگی سے ہم

جگمگاتی روشنیوں اور لہراتے آنچلوں کے درمیان جب اس شوروم کا افتتاح ہوا تو سلطان خود کو سچ میں سلطان سمجھنے لگا۔سیٹھ صاحب نے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھایا۔شہر کے سارے شرفاء،امراء اور رؤسا اس روز مدعو تھے۔ڈی۔ایم صاحب نے فیتہ کاٹ کر شوروم کا افتتاح کیا۔تالیاں بجیں،مٹھائیاں تقسیم ہوئیں اور پھر سلطان نے کاؤنٹر پر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔اس موقع پر سیٹھ جی کی فیملی بھی آئی ہوئی تھی۔اور فیملی بھی کیا.....سیٹھ جی بیگم اور ان کی بیٹی.....نیلوفر۔نیلوفر.....نیلو.....جیسے نیلگوں آسمان.....چاند ستاروں سے سجا.....سلطان نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا.....مبہوت سا۔

اس رات جب سلطان سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اسے پنے جسم میں نئی طرح کی ترنگ اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔کوئی ان سنی موسیقی،کوئی ان دیکھی خوشی،کوئی ان چھوا رنگ،کوئی گم شدہ امنگ.....کیو پڈ

اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ رات اس نے جیسے تیسے کاٹی۔ اور پھر وقت مقررہ پر شوروم کے لیے روانہ ہو گیا۔ آج بھی دن بھر دکان میں رش رہا لیکن جس صنم کو بے چین آنکھیں تلاش کر رہی تھیں وہ دکھائی نہیں دیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ کوئی کل چین نہ تھا۔ ایک بے قراری تھی.....ایک اضطراب، ایک ہلچل۔ اسے سارا کچھ بے کیف سا لگ رہا تھا۔

پھر ایسے کئی بے کیف دن آئے اور گئے کہ اچانک ایک روز جیسے آنکھوں کے سامنے قوس قزح پھیل گئی۔ وہ اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ ہنستی مسکراتی شوروم میں داخل ہوئی تھی۔ چاروں طرف خوش رنگ اور خوش نما پھول کھل گئے۔ خوشبوؤں سے ساری فضا معطر ہو گئی۔ وہ جدھر جدھر جا رہی تھی ادھر ادھر اس کی نظریں بھی گھوم رہی تھیں۔ اس کی سہیلیاں کچھ کپڑے پسند کر رہی تھیں اور وہ فخر وانبساط سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم و جاں برق سی لہرا گئی ہو۔ اس کا سارا بدن سہرا اٹھا۔ وہ بھی ٹھٹک سی گئی۔ ایک بار اسے کنکھیوں سے دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔ کوئی بہار کا جھونکا تھا جو پل بھر کے لیے آیا، پھر گزر گیا اور جاتے جاتے اسے ملول کر گیا۔

وقت گزرتا گیا اور فراغت اور اطمینان نے سلطان کے چہرے پر شادابی اور رونق کے رنگ بکھیر دیئے۔ اب وہ ایک وجیہ نوجوان تھا۔ حسینائیں اسے ایک بار دیکھتیں تو پھر دوبارہ دیکھتیں۔ اس کی وجہ سے شوروم دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس بات کو سیٹھ جی بھی محسوس کر رہے تھے۔ سلطان اسے ہر لحاظ سے پسند تھا۔ گو کہ غریب تھا لیکن اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پڑھا لکھا اور شریف تھا۔ انہوں نے نیلوفر کے لیے اسے پسند کر لیا تھا۔

شادی کے پانچ سال بعد سلطان کی دنیا بہت کچھ بدل گئی تھی۔ اس دوران اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور سیٹھ صاحب بھی راہی ملک عدم ہو چکے تھے اور وہ اپنے سسرال میں عیش و آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔ دولت کی ریل پیل نے اس کے بدن کو فربہ اور چہرے کو بارعب بنا دیا تھا جبکہ دو بچوں کی ماں بننے کے بعد نیلوفر کا جسم ڈھیلا اور لجلجا ہو گیا تھا۔ اب جب سلطان اسے چھوتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی ٹھنڈے اور بے جان ربر پر اپنی انگلیاں پھیر رہا ہو۔ ایسے لمحات میں اس کے دل سے یہ آواز آتی:

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے

اور یہ وسعت سلطان کی پہنچ میں تھی۔ وہ جس میدان میں بھی نکل جاتا وہ اس کے لیے پلے گراؤنڈ بن سکتی تھی۔ ان دنوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے دادا کی روح اس کے جسم میں حلول کر گئی ہو۔ وہ ہر عورت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کے گھر پر ایک پرانی البم ہوا کرتی تھی جس میں اس کے دادا کی بھی ایک تصویر تھی۔ بھرا بھرا چہرا، چڑھی ہوئی آنکھیں اور گھنی مونچھیں۔ لوگ کہتے کہ اس کی



شکل دادا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ بس ذرا مونچھیں رکھ لے تو سر مو فرق نہ ہوگا۔ مگر اسے مونچھوں کے خیال سے ہی وحشت ہوتی تھی۔

ایک روز ایک نہایت پرکشش عورت اس کے شوروم میں آئی۔ اس کی شخصیت میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ بے اختیار اس جانب کھنچا چلا گیا اور سیلز مین کو ہٹا کر خود سے ڈیل کرنے لگا۔ عورت جہاندیدہ اور گرگ باراں دیدہ تھی۔ فوراً اس کی نگاہ شوق کو بھانپ گئی۔ اور اس سے ذرا پرے ہو کر اس کے آتش شوق کو بھڑکانے لگی۔ وہ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک وہاں رہی لیکن بغیر کچھ خریدے یہ کہہ کر نکل گئی کہ پھر آؤں گی۔ سلطان کو ایسا لگا جیسے پانی اس کے ہونٹوں تک آ کر دور ہو گیا ہو۔ اس کی تشنگی اور بڑھ گئی۔

شکاری جال بچھا کر دانہ ڈال چکا تھا مگر پرندے کو صرف دانہ نظر آ رہا تھا جال نہیں۔ وہ بار بار آتی اور ہر بار بس ذرا سا قریب آتی۔ سلطان کے لیے اب صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر ایک روز ہمت کر کے اس نے بل کے ساتھ اپنا پرسنل نمبر بھی اسے دے دیا۔ اس کے بعد وہ کئی روز تک نہیں آئی۔ سلطان امید و بیم کے درمیان جھولتا رہا۔ آخر ایک روز اس کا میسیج آیا۔ اس کا نام مسکان تھا اور اس نے سلام بھیجا تھا۔ سلطان کو گویا دو جہاں کی سلطانی مل گئی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے پیغام بھیجا۔ اِدھر شکار کے چہرے پر ایک بھوک لہرا رہی تھی اور ادھر شکاری کے چہرے پر ایک ایک شاطرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پہلے میسیج، پھر کال اور اس کے بعد ویڈیو کال۔ سلطان آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ آخر ایک روز ایک ہوٹل میں ملاقات ٹھہری۔ نیم تاریک کیبن، ریشمی لمس، کانوں میں ٹپکتی شہد کی بوندیں اور.....اور.....اور.....

اور پھر ملاقات کا سلسلہ دراز تر ہوتا چلا گیا۔ حجابات اٹھ گئے اور دوریاں نزدیکیاں بن گئیں۔ سلطان سسر کے پیسے پر سلطانی دکھا رہا تھا اور مسکان اپنی مدھ بھری مسکراہٹ سے اسے لوٹ رہی تھی۔ ایک روز وصل کا مزہ لوٹنے کے بعد نہایت ناز و ادا سے کہنے لگی۔

''سلطان! میں نے جیولری شاپ میں ایک خوبصورت موتیوں کا ہار دیکھا ہے۔ وہ ہار مجھے بار بار خواب میں آتا ہے لیکن خواب تو خواب ہی ہے۔ کیا آپ میرے خواب کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں؟'' اب وہ سلطان کو اس کے نام سے پکارنے لگی تھی۔ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر سلطان پر ایک سرشاری سی چھا جاتی۔ نیلوفر نے کبھی اس کا نام لے کر اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ اور آج تو اس کے لہجے میں ایک عجیب سی لپک تھی۔ سلطان انکار نہ کر سکا۔

موتیوں کے ہار کی قیمت تو کچھ خاص نہ تھی بلکہ اب وہ بغیر فرمائش کے ہی اسے قیمتی تحفے دینے لگا تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے مسکان کی فرمائشوں کی فہرست طویل ہوتی چلی گئی۔ ایک دن وہ اداس لہجے میں کہنے لگی۔

''سلطان! کرائے کے گھر میں رہتے رہتے جی اکتا گیا ہے۔ میرا بہت دل کرتا ہے کہ ایک ذاتی

مکان ہو۔آپ ہوں اور ہم ہوں۔کوئی تیسرا درمیان میں نہ ہو۔''

سلطان ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا۔اسے لگا جیسے پانی سر سے اوپر ہو رہا ہے۔اس کی بے توجہی کی وجہ سے شوروم میں اب ویسی چمک باقی نہ رہی تھی۔اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ نہ صرف گھاٹا ہو رہا ہے بلکہ جمع پونجی بھی دھیرے سرک رہی ہے۔نیلوفر کو بھی اس کی بھنک لگ چکی تھی اور وہ بھی کبیدہ خاطر تھی۔ایک دو بار دونوں میں نوک جھونک بھی ہو چکی تھی۔سلطان کا موڈ بھی اب خراب رہنے لگا تھا۔اس کے اندر مسکان کے تئیں بھی اب وہ گرم جوشی باقی نہ رہی تھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ادھر مسکان اسے اس طرح نچوڑ رہی تھی جیسے گنّے کو آخری قطرے تک نچوڑا جاتا ہے۔اسے ایسا لگنے لگا جیسے پرانا وقت دھیرے دھیرے دبے پاؤں واپس آ رہا ہے۔اس کی آہٹ اسے سنائی دے رہی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ بہت پریشان تھا۔مل مالکوں کے بل کی ادائگی وقت پر نہ ہو سکی تھی۔ادھر سیلز ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے نوٹس بھی آ گئی تھی۔اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز وہ گھر لوٹا تو خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کیا۔نیلوفر کی نگاہوں میں بھی اب وہ التفات نہ بچا تھا لیکن بیوی تھی لہٰذا اس کی ضروریات کا خیال رکھنا فرض عین سمجھتی تھی۔اس کے گھر پہنچتے ہی کھانا ٹیبل پر چن دیا گیا۔اس نے بے دلی سے چند لقمے زہر مار کئے اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ رہا۔مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے بستر پر کانٹے اگ آئے ہوں۔کبھی اس کروٹ تو کبھی اس کروٹ۔دل اور دماغ الگ تھکے ہوئے تھے۔اسے اپنی زبان کا ذائقہ بدلتا ہوا محسوس ہوا۔اسی حیص بیص میں رات کو نہ جانے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔خواب میں اسے اپنے دادا حضور کے درشن ہوئے۔کیا دیکھتا ہے کہ ایک فرش مکلّف بچھا ہوا ہے جس پر وہ فروکش ہیں۔ سامنے جام و مینا دھرے ہیں۔چند خوش جمال حسینائیں مثل پروانہ ان کے گرد گھومتی ہیں۔عجب سرور و مستی کا عالم ہے کہ اچانک اندھیرا چھا گیا۔تاریکی ایسی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مارے گھبراہٹ کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔پھر اچانک اندھیرا چھٹ گیا اور سورج کی روشنی کمرے میں در آئی۔اب نہ مینا و جام ہیں اور نہ ساقی گلفام۔اور نہ ہی دادا جان کا کہیں نام و نشان۔ ہر طرف ایک ویرانی چھائی تھی۔خالی کمرہ دیکھ کر وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔آنکھ کھلی تو پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

◂◂ ● ▸▸



● عطاء اللہ عالی

# پاگل

کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک سکرپٹ لکھنے کو کہا گیا یہ ایک پاگل خانے کی کہانی تھی۔میں نے پروڈیوسر کو سمجھایا کہ میرا پاگلوں کا تجربہ صرف اپنی ذات تک ہی محدود ہے بہتر ہوگا یہ کام آپ کسی ایسے رائیٹر سے کروائیں جسے پاگل خانے کا تجربہ ہو۔ میں نے تو منٹو صاحب کا صرف وہ افسانہ پڑھ رکھا ہے ٹوبہ ٹیک سنگھ وہ بھی منٹو صاحب نے پاگل خانے سے شفایاب ہونے کے بعد لکھا تھا۔اس طرح انہیں وہاں کا تجربہ اور مشاہدہ دونوں حاصل تھا۔اسے ڈراما ٹائیز ڈ بھی کیا گیا سرحد کے دونوں طرف اس کا پس منظر تقسیم کا تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد پاگل سمجھ نہیں پاتے کہ وہ راتوں رات ایک ملک سے دوسرے ملک کے شہری کیسے بن گئے وغیرہ وغیرہ.....۔

پروڈیوسر نے جواب دیا آپ پاگل خانے جا کر مشاہدہ کر لیں۔خیر ایک جاننے والے ڈاکٹر نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ایک مددگار کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔میں پہلے دن وہاں پہنچا تو اسلم نامی لڑکا جو فاؤنٹین ہاوس میں ہی ملازم تھا کوئی میڈیکل اسسٹنٹ ٹائپ میرے استقبال کو باہر آیا۔خاصا خوش مزاج لڑکا تھا مجھے اندر لے آیا بہت بڑی بلڈنگ ہے جو انگریزوں نے ہی بنوائی تھی۔بعد میں اس میں ترمیم و اضافے ہوتے رہے۔ ہم چلتے چلتے خاصا اندر آ گیے میں قدرے خایف تھا۔چلتے چلتے وہاں پہنچ گئے جہاں دو طرفہ گراسی پلاٹس کے بیچ ایک طویل و عریض فرش پر پتھر کے بینچ نصب ہیں۔ان میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔اسلم ان لوگوں میں سے تھا جن سے آپ کو کچھ پوچھنا نہیں پڑتا وہ آٹو پہ لگے ہوتے ہیں۔سب کچھ خود بخود بتاتے رہتے ہیں۔

اسلم نے بتایا کہ وہ سامنے اوپر کی دوسری منزل پر وہ پاگل قید ہیں جو بہت خطرناک ہیں اور اپنے آپ کو اور ارد گرد کے لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔آپ سن رہے ہیں چیخ پکار کی آوازیں آ رہی ہیں۔یہ ہم انہیں سدھارتے ہیں یہ علاج کا حصہ ہے۔میں حیران ہوا یعنی مارا پیٹا جاتا ہے کیا۔بولا جیسے جانوروں کو مار مار کے سدھایا جاتا ہے کچھ عرصے میں ان کا agression نکل جاتا ہے پھر یہ دوسرے درجے میں آ جاتے ہیں۔یہاں ان مزید ٹریننگ یعنی علاج کا دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن ان کو آزاد نہیں چھوڑا جاتا اس مرحلے کے بعد ان کو آزاد نقل و حرکت کی آزادی ہوتی ہے۔اس نے سامنے اشارہ کیا آپ کے ارد گرد پلاٹس میں جو مریض پھر رہے ہیں یہ ان مراحل سے گزر آئے ہیں پھر بھی آپ محتاط ہی رہیے گا۔ میں آپ کی

ملاقات کرواتا ہوں کچھ مریضوں سے.....۔آپ ان سے سوال و جواب کر سکتے ہیں۔میں نے اسلم کو روک دیا اور بتایا کہ اس طرح کے سوال و جواب سے میرا کوئی فایدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی مقصد پورا میں ان میں مکس اپ ہونا چاہتا ہوں اور اس طرح کہ یہ خود بخود مجھ سے گفتگو کریں لیکن یہ تو سرجی کئی دنوں کا کام ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ مجھے کوئی جلدی نہیں اس نے کندھیا چکا دئے۔

یوں میں نے وہاں روز جانا شروع کر دیا سردیوں کا موسم تھا میں بینچ پر جا کر بیٹھ جاتا اور ان کی حرکات وسکنات باڈی لینگویج، انداز گفتگو غرض بہت باریک بینی سے ہر چیز کا جایزہ لیتا رہتا۔ظاہر یہ کرتا جیسے دھوپ سینکتے ہوئے اخبار پڑھ رہا ہوں۔آہستہ آہستہ کچھ پاگلوں نے میری موجودگی محسوس کرنا شروع کر دی وہ میرے قریب آنے لگے۔میں کچھ فروٹ سنیکس نمکین ساتھ لے جاتا تھا وہ کوئی چیز لے کر کھانے میں بہت محتاط رہتے۔جانے کیوں ایک دو سے آشنائی ہوگئی مجھے دیکھ کر قریب آجاتے مگر دو جار باتیں کر کے چلتے بنتے۔

ایک ہفتے تک میرے پاس خاصا مواد جمع ہوگیا جو مجھے درکار تھا۔ایک مشترکہ بات یہ کہ وہ سب ماحول اور ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے مگر صرف اپنے بارے میں ایک پاگل کبھی دوسرے کی بات پہ دھیان دیتا نہ سنتا۔وہ سب بہت مہذب تھے۔دھیمی آواز میں بات کرتے سب کی کامن بات یہ تھی کہ جیسے ہی مجھ پر نظر پڑتی سلام کرتے باتوں میں تسلسل تو کسی کے بھی نہیں تھا ایک بات کو بار بار دہراتے۔بلکہ ہر ایک کا اپنا الگ بیان یا تقریر ہوتی۔جو وہ دن میں دس دفعہ بھی ملتا تو وہی دہراتا ان کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

میرے مشاہدات جواب تک مجھے یاد ہیں کہ ہر پاگل کو یہ وہم تھا کہ پوری دنیا اسے مارنا چاہتی ہے۔ہر پاگل خود کو بہت اہم شخصیت سمجھتا۔کئی ایک کو وہم تھا وہ کوئی پیغمبر وغیرہ ہیں کوئی خود کو دنیا کا سب سے علم والا۔ایک پاگل نے مجھے بتایا کہ اسے بار بار زہر دیا گیا میں نے پوچھا کیوں بولا (ایک برگزیدہ ہستی کا نام لیا) کیونکہ میں وہ ہوں کیا آپ کو اب بھی یقین نہیں؟ایک کامن بات اور وہ سب صرف اپنے بارے میں بات کرتے کسی نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور ادھر یہ جھک کیوں مار رہا ہوں۔

اسلم اب میرے ساتھ نہ ہوتا آ کے کبھی کبھار حال چال پوچھ لیتا وہ ان سب مریضوں کی مجھ سے بے تکلفی پر بہت حیران رہتا۔میرا کام ہو چکا تھا اب وہ میری لائی ہوئی چیزیں بھی کھانے لگے تھے۔ان کا تو پتہ نہیں مگر مجھے ان سے انسیت سی ہوگئی تھی۔میں نے اسلم سے کہا میں ان کی پارٹی کرنا چاہتا ہوں۔اسلم مجھے انہی نظروں سے دیکھنے لگا جن نظروں سے انہیں دیکھتا تھا۔

"نہیں سرجی انتظامیہ سے اجازت لینی پڑے گی۔آپ روز تو ان کے لیے کچھ نہ کچھ لاتے ہی ہیں۔میں



اسلم کو لیکر ان سب سے اجازت لے کر فاؤنٹین ہاؤس سے باہر آ گیا وقت رخصت ان کا ردعمل کچھ نہ تھا بس ایک دو پاگل مجھے جاتے ہوئے دیکھتے رہے مجھے یقین ہے اس وقت بھی کچھ اور سوچ رہے ہوں گے۔وہ اسلم اور میں سڑک پار کر کے سامنے بنے ہوٹل پر آ گئے ایک ہوٹل کے اندر آئے تو وہاں عجیب ہڑونگ مچی ہوئی تھی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔میں اسلم کو اس کی مرضی کا لنچ کروانا چاہتا تھا اسے اس ہوٹل کی کڑھائی بہت پسند تھی۔سارے رستے وہ اس کی تعریفیں کرتے کرتے ہلکان ہوگیا تھا میرا تو اس شور میں پانچ منٹ میں ہی برا حال ہوگیا میں نے ساتھ میکڈونلڈ میں چلنے کو کہا حالانکہ فاسٹ فوڈ سے مجھے کوئی رغبت نہیں مگر وہاں کا شور نا قابل برداشت تھا اسلم نے چیخ کے مجھے بتایا کہ برگر شرگر سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔خیر کھانا آیا میں نے اسلم کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر کہا۔اسلم وہ تمہارے مریض جو بظاہر پاگل ہیں اس ہوٹل میں بیٹھے لوگوں سے زیادہ مہذب نہیں ہیں؟ میرا خیال ہے ان سب لوگوں کو فاؤنٹین ہاؤس کی بالائی منزل کے پنجروں میں بند کر کے علاج کرنا چاہیے۔اسلم نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مرچوں کی شدت سے ناک سے بہتے پانی کو آستین کے کف سے صاف کرتے ہوئے الٹا سوال داغ دیا سرجی یہ بتائیں کڑائی کیسی ہے؟ اور میں اسلم کو ان نظروں سے دیکھنے لگا جن نظروں سے وہ اپنے پاگلوں کو دیکھتا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

House no 925 B. syed imran ali street
Ali Park : Lahore Cantt
Phone No 03004313566


## مکتبۂ صدف پٹنہ کی نئی سوغاتیں

| | |
|---|---|
| نام کتاب: بزم صدف ایک مشن<br>صنف: یادگاری مجلّہ ۲۰۲۳ء<br>ترتیب و تدوین : ڈاکٹر افشاں بانو ، ڈاکٹر نظام الدین احمد<br>سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، صفحات: ۸۸<br>قیمت: ۵۰۰/روپئے | نام کتاب: سوغات<br>(رباعیاں صفدر امام قادری کے لیے)<br>صنف: رباعیاں<br>مصنف: ظفر کمالی<br>سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، صفحات: ۷۲<br>قیمت: ۱۰۰/روپئے |
| نام کتاب: سرپٹ گھوڑا صنف: ناولٹ مصنف: شوکت حیات<br>مرتبہ: صفدر امام قادری سن اشاعت: ۲۰۲۲ء صفحات: ۱۶۰<br>قیمت: ۳۵۰ روپے (مجلد) | |
| Maktaba-e-Sadaf<br>☆ 202, Abu Plaza, NIT More, Ashok Rajpath, Patna 800006 Bihar | |

● بش احمد

# قبلہ رخ

انٹرنیشنل ایرپورٹ انتظار گاہ میں ایک بے آرام کرسی پر بیٹھے بدھومیاں اپنی غیر ملکی پرواز کی اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔ جوانی کی غلطیوں کی معافی بڑھاپے میں مانگنے کے بعد انہیں خاصی تسلی ہوگئی تھی۔ اب وہ پنجگانہ عبادت مکمل خشوع وخضوع سے ادا کرتے تھے۔ نماز کے ہر حصے کو مکمل سنجیدگی سے ادا کرتے۔ آہستہ آہستہ پڑھتے۔ زیر لب ہر عربی لفظ، تکبیر، فاتحہ، جملے، تشہد کا اردو ترجمہ اپنے ذہن میں رکھتے جاتے تو عبادت میں ان کو بہت سرور آتا۔ طبیعت سیر ہو جاتی۔ گورے چٹے ہونے کے ناطے انہیں گرمی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تو جہنم کی تپش کا ذِکر اور بھی بے چین کرتا۔ ترجمے کے ساتھ نماز و قرآن کی تلاوت اور مطالعہ سے اطمینانِ قلب پا جانے کے بعد انہیں اپنے رحیم وکریم وغفار خدا پر پکا یقین ہو گیا تھا۔ پھر بھی احساس رہتا، کچھ تشنگی محسوس ہوتی کہ ان کی اپنی شخصیت کچھ دوہری سی ہوگئی۔ ایک طرف تو انتہائی مسکینی عاجزی اختیار کر لی۔ اپنے آپ کو بدھومیاں کہہ کر پکارتے۔ دوسری طرف ذاتی نیکی کا احساس بڑھتا بڑھتا اس انتہا پر پہنچ گیا کہ انہوں نے اردگرد دوسرے لوگوں کی عبادت کے طریقے پر کڑی تنقیدی نظر رکھنی شروع کر دی۔ ''فلاں مسلک کا بندہ سینے پر ہاتھ ٹھیک نہیں باندھتا۔ فلاں مسلک ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا۔ فلاں بندہ نماز ٹھیک طرح نہیں پڑھتا، ٹکریں مارتا ہے۔ فلاں دکھاوے کی نماز پڑھتا ہے۔ فلاں مولوی نماز مختصر کر دیتا ہے''۔ یہ خیالات انہیں تنگ کرتے۔ داڑھی دو تین دفعہ رکھی مگر آئینہ دیکھتے الجھن ہوئی تو صاف کر دی یہ سوچ کر کہ فرض نہیں، محبت کا تقاضہ ہے۔ ابھی تو ابتدا ہی ہوئی ہے، اللہ توفیق دے دے گا۔

بنیادی سطح پر نیک آدمی بننے کی کوشش جاری تھی۔ ذِکرِ الٰہی کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ اپنی عبادت کے بعد بھی یہاں وہاں جب کبھی کسی کو نماز پڑھتے دیکھتے تو جہاں تک ہوسکتا، اپنے ذہن میں اس بندے کی حرکات کے ساتھ ساتھ زیرِ لب نماز کی تکبیرات رکعات وآیات کی قرأت کرتے جاتے تاکہ فضولیات سے بچے رہیں اور ثواب بھی شیئر کرتے رہیں۔ انہیں محسوس ہوتا وہ کائنات کے تھیٹر میں ایک عظیم آرکسٹرا کی پیش کردہ ہم آہنگ موسیقی کی سمفنی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ایسا کرنا اچھا عمل سمجھتے لیکن بعض اوقات ایک گمبھیر مسئلہ درپیش ہو جاتا۔ کسی بھی وجہ سے اگر وہ بندہ ان کی توقع کے مطابق تطبیق



وقت سے نماز نہ پڑھتا تو ان کا ذہن جھنجھلا جاتا۔ موسیقی بے ترتیب بے سری ہو جاتی۔ سکونِ قلب کے سمندر کی عمیق گہرائی میں زلزلے سے ٹیکٹونِک پلیٹس اتھل پتھل ہو جاتیں۔ دل کی دھڑکنیں سنامی کی صورت اختیار کر لیتیں۔ بلڈ پریشر بڑھ جاتا۔ بے ترتیبی کو واپس ترتیب میں آتے کچھ وقت لگتا۔ انہیں اپنی اس رُود حِسّی کا احساس تھا لیکن اپنی مدد آپ کرنا اپنے بس سے باہر سمجھتے تھے۔

جب تک صحت اور جسم نے ساتھ دیا شروع شروع میں خوب سجدے کیے۔ کھجور کی چٹائی پر اپنی بالا وکشادہ پیشانی خوب رگڑی تو دو کالے چراغ بھی مستقل روشن ہو گئے جنہیں آئینے میں دیکھنے سے انہیں خاصا سکون ملتا۔ کچھ تسلی ہوتی کہ عبادت کا ٹھپہ اَظہَر مِنَ الشمس ہو گیا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد گھٹنوں میں گٹھیا شروع ہوا۔ چٹائی پر سجدے کم ہوتے گئے لیکن پیشانی کے جُڑواں چراغ بدستور روشن رہے جسے وہ اللہ کا خاص کرم سمجھتے۔ گذشتہ ایک سال سے وہ کُرسی پر ہی نماز کی نیت باندھ لیتے اور اپنی ممکن ترین احتیاط کرتے کہ کُرسی قبلہ رُخ ہو، سامنے سے لوگوں کا گزر کم سے کم ہوتا کہ عبادت میں یکسوئی نصیب ہو۔

یہاں ایرپورٹ انتظار گاہ میں ان کی قبلہ رخ سیٹ کے کچھ دور سامنے ایک احاطہ نمازیوں کے لیے مخصوص تھا۔ فرشی قالین کے اوپر کھجور کے پتوں سے بُنی چٹائیوں کی صفیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے آنکھیں بند کیں۔ قصرِ نماز کی نیت کی اور اپنے ہاتھ باندھ کر عبادت کی جہت میں گم ہو گئے۔ سلام پھیرا۔ واپس آئے۔ آنکھیں کھولیں۔ کچھ شور وغل سا ہوا، کچھ ہلچل سی مچی۔ بدھو میاں نے نظر اٹھائی۔ پی آئی اے کی اندرونِ ملک چھوٹے جہاز کی پرواز نے انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچ کر اپنا بوجھ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ بیرونی گیٹ سے اندر دھڑ دھڑ کرتے کندھے سے کندھا ملاتے ہجوم کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ان لوگوں کی غیر ملکی پرواز دوبئ جائے گی۔ دور دراز کی پسماندہ بستیوں سے آئے، سادہ بھاری چپلیں پہنے، شکن آلود شلوار قمیص میں ملبوس تیس چالیس مزدور طبقہ لیکن خوبصورت نوجوان اپنے لیڈر یعنی مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے چلتے آرہے تھے۔ کچھ کی تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ انتظار گاہ میں بیٹھے بدھومیاں کے سامنے نماز کے لیے مخصوص جگہ پہنچے تو رک گئے۔ اکٹھے ہو کر اپنے مولوی صاحب کی ہدایت کا انتظار کرنے لگے۔ زندگی میں پہلی دفعہ ہوائی جہاز پر سفر کا تجربہ ان کے چہروں پر بیک وقت اڑتی ہوائیوں اور خیریت سے زمین پر واپس آجانے کی خوشی سے نمایاں تھا۔

غُسل خانے میں وضو کرنے والی جگہ کی طرف اشارہ کرتے مولوی صاحب نے ہدایات جاری کیں۔ یکے بعد دیگرے سب مقتدین نے وضو کرنے کے بعد مولوی صاحب کے پیچھے صفیں باندھ لیں۔ اِدھر اپنی قبلہ رُخ کرسی پر براجمان بدھومیاں نے ان سب باجماعت عبادت خواں نوجوانوں کے

ساتھ ساتھ حسبِ عادت خود بھی زیرِلب نماز دہرانی کر دی۔ فرض نماز کے بعد نوجوانوں نے جب نوافل ادا کرنے شروع کر دیے تو بدھومیاں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ انتہائی تیزی سے قیام و رکوع و سجود ادا کرنے میں نوجوان بہت آگے نکل گئے۔ بدھومیاں کی زیرِلب گردان اور نوجوانوں کی اٹھک بیٹھک ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ کائناتی آرکسٹرا کی سمفنی کا حظ اٹھانے اور ثوابِ دارین حاصل کرنے کی بدھومیاں کی کوشش بری طرح ناکام ہوگئی۔ سخت جز بز ہو کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ دل کی تیز دھڑکن نے ذہن کی چنگاریاں سلگا دیں۔ غصے میں آ گئے۔

نوجوانوں نے نماز ختم کی یا یہ کہنا چاہیئے کہ بدھومیاں کی کسوٹی پر نماز کا تیا پانچا کر دیا۔ دوبئی جانے والے جہاز کی روانگی کا انتظار کرتے نوجوانوں نے بدھومیاں کے اردگرد کرسیاں سنبھال لیں۔ جہاز پر پہلے سفر کے بعد واپس ٹھوس زمین پر آنے، ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے اور باجماعت عبادت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کے چہروں پر اڑتی ہوائیاں اب غائب ہو چکی تھیں۔ کچھ نماز کی برکت کچھ ملک سے باہر جانے کی خوشی، کھلی باچھوں سے ان کے چہرے روشن تھے۔ ان کے امام صاحب اتفاق سے آ کر بدھومیاں کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اپنی قبلہ رخ بے آرام کرسی پر کسمساتے تلملاتے بدھومیاں رہ نہ سکے۔ مولوی صاحب سے علیک سلیک کے بعد پوچھا، ''کہاں جا رہے آپ سب لوگ؟''

امام صاحب نے اپنی منزل کا بتایا۔ بدھومیاں اپنا غصہ ضبط کر کے لیکن ذرا سڑ کر بولے، ''بہت خوش لگ رہے ہیں یہ سب لوگ!''

امام صاحب بولے۔ ''روزی کمانے کا موقع ملنے کی خوشی اپنی جگہ۔ اُنہیں زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ عمرہ اور حج کرنا ممکن ہو جائے گا''

بدھومیاں بولے، ''معاف کیجیے گا۔ میری مدت سے عادت ہے کہ مَیں کسی کو نماز پڑھتا دیکھتا ہوں تو اپنے ذہن میں اور زیرِلب اس کے ساتھ ساتھ نماز کی تکبیرات آیات دہراتا ہوں۔ آج مَیں بری طرح ناکام ہو گیا کیوں کہ وہ نوافل بہت تیزی سے پڑھ رہے تھے۔ نماز اتنی تیزی سے کیسے پڑھ لی انہوں نے؟''

اپنی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے مولوی صاحب ذرا تأسف سے مسکرا کر بولے، ''بالکل چٹّے ان پڑھ معصوم ہیں یہ لوگ! ابھی انہوں نے صرف چار کلمے سیکھے ہیں۔ انہیں صرف چار کلموں کی نماز ادا کرنی آتی ہے، اٹھک بیٹھک کرتے بس وہی دہراتے رہتے ہیں۔ بسم اللہ۔



الحمدللہ۔ سبحان اللہ۔ اللہ اکبر!''

بدھومیاں کو یکدم سخت پسینہ تو کیا رونا آ گیا۔ تیزی سے اپنی سیٹ سے اٹھے۔ غُسل خانے میں جا کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر زور سے دو دو چانٹے لگائے تو کچھ آنسو نکلے۔ ذاتی نیکی اور برتری کے بچھو نے پہلے زور سے ڈنگ مارا پھر نمکین پانی بن کر بہہ گیا۔ بدھومیاں نے نیچے وضو کے پانی سے گیلے سنگِ مرمر کے فرش کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ ان کی پیشانی کچڑواں چراغ بجھ کر دو سینگوں کی صورت اگ آئے تھے۔ ایک دم سے زمین پھٹ گئی۔ آتش فشاں نے گندھک کا بدبودار سانس اگلا اور بدھومیاں پگھلتے لاوے میں گرتے ہی گئے۔

◂◂ ● ▸▸

bush@iprimus.com.au
Australia


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب: نظموں کا آبشار<br>صنف: نظم<br>مصنف: مرغوب اثر فاری<br>سن اشاعت: ۲۰۲۳ء<br>صفحات: ۲۴۰<br>قیمت: ۳۰۰/روپے<br>کتاب ملنے کا پتہ:<br>روڈ نمبر ۷ علی گنج، گیا | | نام رسالہ: دھنک<br>ترتیب وتہذیب: فارق مضطر<br>اشاعت جدید: نومبر ۲۰۲۲ء<br>صفحات: ۶۴<br>ملنے کا پتہ:<br>کتاب ملنے کا پتہ:<br>شہریار ''دبستان ہمالہ'' ہمالین کیمپس<br>وارڈ نمبر ۹ راجوری (جموں) |
| اردو ڈائرکٹوریٹ بہار پٹنہ کے ذریعہ چھپی کتابیں | | |
| نام کتاب: غلام سرور (سلسلہ ۲۴)<br>مصنف: پروفیسر احسان اشرف | | نام کتاب: شکیلہ اختر (سلسلہ ۲۵)<br>مصنف: پرفیسر قمر جہاں |
| نام کتاب: رشید النساء (سلسلہ ۲۶)<br>مصنف: ڈاکٹر نور السلام ندوی | | نام کتاب: راسخ عظیم آبادی (سلسلہ ۲۷)<br>مصنف: پرفیسر رئیس انور |
| نام کتاب: پیغام آفاقی (سلسلہ ۲۸) مصنف: سلمان عبدالصمد | | |

● نجمہ ثاقب

# آخری خواہش

خادم کو گانا گانے کی عادت تھی۔ مگر خالی خولی عادت سے کہاں کام چلتا ہے۔ گلے میں اگر سر نہ ہو۔ آواز کی لہروں میں محض سیٹیاں بجاتی ہوا بھری ہو تو گانا الٹا گانے والے کے گلے پڑ جاتا ہے۔ مگر خادم کو قدرت نے ایسی آواز بخشی تھی کہ جو ایک مرتبہ اس کا گانا سنتا، دوبارہ سننے کی خواہش کرتا اور جو بار بار سنتا وہ دیر تک اس کی آواز پہ جھومتا اور اش اش کرتا رہتا۔

مگر خادم کو نہ کسی کے جھومنے کی پروا تھی۔ نہ داد لینے ہی میں کوئی دلچسپی..... وہ کسی تعریف کے طمع میں گاتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو محض اس لیے گاتا تھا کہ اسے اس کے علاوہ کچھ آتا نہ تھا۔ اس نکمے پن کی وجہ سے اس کی ماں نے کئی مرتبہ اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

تمہاری عمر کے لڑکے صبح گھر سے نکلتے ہیں تو شام کو مٹھی بھر روپے لے کر واپس آتے ہیں۔ مائیں بلائیں لیتی ہیں۔ باپ فخر سے سینہ پھلا کے چلتے ہیں اور بہن بھائی خوشامد کی پھرکیاں چڑھاتے ہیں۔ مفت میں تو کوئی روٹی کا سوکھا ٹکڑا بھی نہیں دیتا۔ وقت پڑنے پہ اپنے پرائے سب منہ موڑ جاتے ہیں۔ مگر تمہیں اس سے کیا غرض..... تم بیٹھے گاتے رہو یا میرا جی جلاتے رہو۔

خادم کب ماں کو تکلیف دینا چاہتا تھا؟ مگر اسے کچھ آتا بھی تو ہو۔ کوئی ہنر..... ہاتھ کی صفائی..... کوئی مہارت..... سو وہ گانے کے سوا کسی شے میں نہ تھی۔

گھر سے نکل کر گلی میں آیا تو گورنمنٹ سکول کے بچے صبح کی اسمبلی میں دعا کہہ رہے تھے۔ صحن کی چار دیواریوں میں سے ایک پچھلی برسات میں ڈھ گئی تھی اور کچا احاطہ گلی سے بغل گیر ہو رہا تھا۔ وہ ایک ٹوٹی اینٹ پہ پاؤں رکھ کے کھڑا ہو گیا اور لڑکوں کی آواز میں آواز ملانے لگا۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

ماسٹر جی نے مانوس آوازوں میں اجنبی آواز کی گرہ لگتے دیکھی تو اس کی جانب متوجہ ہوئے اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر بلا لیا۔

''چلو جی! آج دعا تم کہلواؤ۔''



خادم نے دست بستہ کھڑے ہو کر دعا کہلوائی۔

ماسٹر صاحب بولے۔

''تم روزانہ صبح آیا کرو اور بچوں کو دعا کہلوایا کرو۔ یہ سب آہستہ آہستہ تم سے سیکھ جائیں گے۔''

یوں خادم کام سے لگ گیا۔ مگر اس کام کا معاوضہ کچھ نہ تھا۔ لہٰذا اس کی ماں مطمئن نہ ہو سکی۔ البتہ صبح کے اوقات میں وہ اس کی نگاہوں سے غائب ہو جاتا تو چپ رہنے لگی۔ عصر کے بعد لڑکے چراگاہوں میں بھیڑ بکریوں کو چرتا چھوڑ کر پرانے پیپل کے نیچے منڈلی جماتے۔ تاجا اور ہیرا دونوں سیلی سیلی زمین پر بارہ گوٹ کی لکیریں کھینچ کر نیم کی گنڈولیاں رکھتے۔ رامو نچلے ہونٹ میں انگوٹھا گھسیڑ کے گھڑی گھڑی سیٹیاں بجاتا۔ راجو اور علیا ایک طرف بیٹھ کے بولیاں گاتے۔ خام آتا تو سارے لڑکے اپنا اپنا دھندہ چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

خادم بائیں کان پہ ہتھیلی دھر کے تان لگاتا

آری اتے آری اے

اک دم یوسف دا

سارا مصر بپاری اے

آواز سرسا گر میں تیرتی لمبا سفر طے کرتی، اور ٹیوب ویل کی ہودی پہ جا کر بیٹھ جاتی۔ وہاں گاؤں بھر کی لڑکیاں بالیاں میلے کپڑوں کے گٹھڑ کھولے انہیں ڈنڈے سے دھنک رہی ہوتی تھیں۔ جونہی آواز ان کے کانوں سے ٹکراتی۔ یہاں بھی ایک لمحے کے لیے دھندہ رک جاتا۔

عذرا کان کے پیچھے چنی اڑس کر کہتی۔

''اشکے بھئی اشکے۔ آواز ہے یا انار کے شربت کا رسیلا گھونٹ، جو ایک ہی ڈیک میں حلق سے گزر جائے۔''

پروین جمن کمہار کی نک چڑھی بیٹی..... ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ ہونہہ کہہ کے پٹڑا نیچے پٹختی۔ پہلو میں ہاتھ ٹکا کے تنتنا کے کہتی۔

''سوائے سوہلے گانے کے اسے آتا ہی کیا ہے؟ نوٹنکی کہیں کا..... بھانڈ..... مراثی.....''

عذرا پلو کی گرہ کھولتی۔ اور معنی خیز مسکراہٹ پھینک کے کہتی۔

''تو کیوں کلیجہ ساڑتی ہے میری سہیلی؟ لے یہ باجری کھا..... گڑ کے شیرے میں گوندھ کے پکائی ہے۔''

سب کی سب دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھی کھی کرنے لگتیں۔

ایک روز خادم چائے والے کے بانکڑے پہ بیٹھا تنکے سے دانت کرید رہا تھا۔ کہ گلی سے مرزا کے لڑکے کی بارات گزری، دس دس، بارہ بارہ سال کے لڑکے ہجوم کے سامنے ناچتے، گاتے، جاتے تھے۔ خادم

کے دل میں کیا آئی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک ماہیے کا بول اٹھایا۔ دولہا کے یار نے اسے گھسیٹ کر مجمعے کے اندر کرلیا۔ دولہا کے ماموں نے جوش میں آ کر لال اور سبز نوٹ وارنا شروع کیے۔ جن پہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ محلے کے دو چار بچے، اگر ہشیاری سے کام نہ لیتے تو لوگوں کے پاؤں تلے روندے جاتے۔ علیا بھی اسی بارات کے پیچھے روپے چنتے چنتے دور نکل گیا۔ اور اسی شام چراگاہ کے قریب ایک جھنڈیا میں مردہ پایا گیا۔ اس کی گردن پہ گلا گھونٹنے کا نشان تھا اور آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔

بے چارہ علیا، بھولا بھالا، ناک کی سیدھ پہ چلنے والا پندرہ، سولہ سال کا لڑکا تھا جس کی اٹھان بلا کی تھی۔ دیکھنے میں اپنی عمر سے دو چار سال زیادہ کا ہی لگتا تھا۔ جب سہ پہر کو لڑکے پرانے پیپل کے نیچے جمع ہوتے تو علیا بھی اپنی بھیڑیں گھاس پہ پھیلائے درخت کے سائے میں کاڑا کیڑا کھیلتا۔ سب سے پہلے اسے نسیم اور تاجور نے دیکھا۔ یہ دونوں خادم کے چچازاد اور جوڑی دار تھے۔ دونوں محکمۂ جنگلات میں سرکاری مزدور تھے اور چراگاہوں سے ادھر درختوں کی چھنگائی کے کام پہ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک اور مزدور کو اطلاع کے لیے گاؤں کی طرف دوڑایا۔ اور خود شہتوت کی ہری چھمک سے لاش پہ آتی مکھیاں اڑانے لگے۔

علیے کی ماں سینے پہ دوہتڑ جماتی کرلاتے بین کرتی آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے گاؤں کی بہت سی عورتیں اور مرد تھے۔ وہ سب جھنڈیا کے پاس آئے اور لاش کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔

پولیس آئی۔ اس نے لاش اٹھوائی، اور ساتھ ہی خادم کو پکڑ کے حوالات میں بند کر دیا۔ پہلے روز جب وہ حوالاتی ہوا تو ایک سپاہی نے اسٹیٹلکی پہ لٹکا کے ادھیڑ ڈالا۔ پہلے وہ چیخا، چلایا۔ اونچی آواز میں رویا، کرلایا۔ پھر نڈھال ہو کر جو سسکا تو چرمیلے ہنٹر کی شائیں شائیں میں اس کی آواز پہلے دو اور پھر تین شاخی ہو کر حوالات میں پھیل گئی۔ جیل کے گیٹ پہ اس کے باپ نے دھرنا دے رکھا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے اندر گھسنے کی کوشش کی۔ تو پہرے پہ کھڑے سنتری بادشاہ نے اسے دھکیل کر پیچھے کھڑی ریڑھی میں ٹھونک دیا۔

''میرا بیٹا بیگناہ ہے سرکار۔'' وہ سپاہی کے قدموں میں گر گیا۔

''ایک مرتبہ مجھے اندر جانے دو۔ میں تھانیدار سے آپ بات کرلونگا۔ اس کی عمر قتل کرنے کی نہیں ہے۔ ابھی پچھلے سال تو وہ انیس کا ہوا ہے۔ اس نے کبھی کتے کا پلا تک نہیں مارا۔ وہ بندہ کیسے مار سکتا ہے۔'' سپاہی نے ٹھڈا مار کر اسے پرے کیا۔

''جوان اولاد کے منہ میں لگام نہیں دے سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو۔؟ اس کی مارنے کی عمر نہ تھی تو مرنے والے کی کیا مرنے کی عمر تھی؟..... ہیں.....؟ بتاؤ تو.....؟ کیوں جی.....؟'' سپاہی نے مونچھیں مروڑ کر قریب کھڑے ریڑھی بان اور فالودہ بیچنے والے سے پوچھا۔ دونوں نے کدو کے سے سر تائید میں ہلا دیے۔

پھر ملزم اور موقعے کے گواہان وغیرہ کے بیانات قلمبند ہوئے۔ کٹہرے میں کھڑے خادم نے اپنا بیان پڑھا۔



''میں اور علیا پکے یار تھے۔ سہ پہر کو وہ بھیڑیں لے کر چراگاہ میں جاتا تو ہم دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہاں محفل جماتے۔ وقوعہ کے روز مرزا کے لڑکے کی بارات میں وہ میرے ساتھ رہا۔ اس نے تقریباً ہزار روپیہ لوٹ لیا۔ اور ارادہ باندھا کہ شام کو دوستوں کے ساتھ دودھ جلیبیاں اڑائے گا۔ مجھے بھی اس نے جلدی چراگاہ میں آنے کو کہا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا اور شام سے پہلے اس کی سناؤنی آ گئی۔''

''تم اس وقت کہاں تھے؟'' جرح کے وکیل نے پوچھا

''میں بارات کا کھانا کھا کر گھر آ گیا تھا۔ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ سویا رہا۔ پھر چراگاہ کی طرف نکلا تو تھوڑی دیر کے لیے ٹیوب ویل کے قریب رک گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے جھنڈیا کی طرف سے شور کی آواز سنی۔ تو ادھر کو دوڑا۔ وہاں علیا زمین پر گرا پڑا تھا۔ اور میرے چچا کے لڑکے اس کے گرد کھڑے تھے۔''

خادم کے چچیرے بھائیوں نے گواہی میں کہا۔

''ہم چراگاہ کے پچھلی جانب درختوں کے جھانکڑ گرا رہے تھے۔ جب یہ دونوں آ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ چرواہے لڑکے ابھی بھیڑیں لے کر نہیں پہنچے تھے۔ چراگاہ میں سناٹا تھا۔ خادم سٹھنیاں گانے لگا۔ پھر اچانک آوازیں آنا بند ہو گئیں..... تھوڑی دیر کے بعد ہم نے گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ شاخوں کے اندر سے جھانک کے دیکھا تو علیا زمین پر گرا پڑا تھا اور خادم اس کے سینے پر سوار تھا۔ ہمارے نیچے اتر کر وہاں پہنچنے تک یہ گھاس الانگتا ٹیوب ویل کی طرف بھاگ گیا۔ ہم پہنچے تو علیا کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور اس کا منکا ٹوٹ چکا تھا اس بیان کو سنتے ہوئے خادم کی آنکھیں حیرت کی شدت سے کئی مرتبہ پھیلیں، کئی مرتبہ سکڑیں، اس کے ہونٹ بارہا کپکپا کر کھلے اور بند ہوئے اور بہت سی رندھی ہوئی بے معنی آوازیں اس کے حلق میں پھنس کے رہ گئیں۔''

خادم کے باپ نے اپنی حیثیت کے مطابق وکیل کیا۔ دس بیگھے زمین کے بدلے میں بھتیجوں سے صلح کی بات کی۔ جسے انہوں نے یہ کہہ کیرد کر دیا کہ خادم کے بعد دس بیگھے کیا، ساری اراضی ہماری ہے۔ یوں چند پیشیوں کے بعد عدالت نے مضبوط گواہیوں کو بنیاد بنا کر خادم کو سزائے موت سنا دی..... بستی میں جس نے بھی سنا۔ انگلی دانت تلے داب کے رہ گیا اس شام تاجا اور ہیرا پیپل تلے آئے ہی نہیں۔ رامو بکریاں ہانک کر شام سے بہت پہلے گاؤں چلا گیا۔ جمن کمہار کی لڑکی اس روز نہ سکھیوں سے لڑی۔ نہ بات، بے بات ناک بھوں چڑھائی..... پہلے تو ٹیوب ویل پہ کھڑے کھڑے بورائی آنکھوں سے جھنڈیا کی جانب تکتی رہی۔ پھر سرکنڈوں سے دھلے کپڑے اتار کر انہیں پٹڑے پہ پٹخ پٹخ کر دوبارہ کوٹنے اور دھونے میں لگ گئی۔ ادھر خادم کال کوٹھڑی میں راتیں کالی کرنے لگا۔

شروع دنوں میں جب وہ نیا نیا احاطے میں آیا۔ تو مشقتی چکی کے انچارج نے اس سے پوچھا۔

''کوئی کام دھام آتا ہے تجھے؟ کوئی ہنر.....؟ کسی کام میں مہارت.....؟ جس کے برتے پہ

تجھے بغیر سکھلائی کے ادھر کھپا دیا جائے۔''

اس نے کہنا چاہا کہ مجھے تو بس گانا آتا ہے۔خوشی کا گیت.....غمگین گانے.....معمول کے نغمے.....لوک گیت.....ماہیے، ٹپے اور بولیاں۔

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا اور نفی میں سر ہلا کے رہ گیا۔انچارج نے اسے سوت کی کتائی، بنائی کے سیکشن میں بھجوا دیا جہاں اس نے تھوڑے ہی عرصے میں چرخے پر کتائی، تانے پیٹے پہ دھاگا کسنا، رسیاں بٹنا اور چھوٹی موٹی دریاں بننا سیکھ لیا۔البتہ اپنا ازلی مشغلہ یعنی سر اٹھانا اور گیت گنگنانا یکسر بھلا دیا۔

وہ دن کا بڑا حصہ مشقتی چکی میں گزارتا۔اور رات کو کوٹھڑی میں لیٹ کر چھت پہ رینگتی مرگھلی چھپکلیوں کو دیکھتا رہتا۔کبھی کبھی جی میں کیا آتا کہ کوئلے سے دیوار پہ پنجابی ماہیے لکھنے بیٹھ جاتا۔

ساڈے بوہے اگے شاہ دولہ
دنے سانوں غم رہندے
راتیں آن کے مل ڈھولا

لکھتا جاتا، مٹاتا جاتا
مگر انہیں گانے کی کبھی خواہش کرتا نہ کوشش۔

عصر کے بعد ماشکی احاطے میں پانی کا چھڑکاؤ کرتا تو سنتری لوگوں کی نگرانی میں قیدی لاک اپ سے باہر نکلتے۔ہتھکڑیاں بجتیں، بیڑیاں آپس میں ٹکراتیں، قیدی اک دوجے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں سلام کرتے۔موقعہ دیکھ کر آپس میں کچھ کہہ سن لیتے، کوئی چھوٹی سی بات کوئی مدھم سرگوشی، سیلی سیلی فضا میں تحلیل ہوتی رہتی۔ٹہلتے ٹہلتے ایک دوسرے سے سگریٹ کا تبادلہ بھی ہو جاتا۔آنے والے دنوں کے حوالے سے کسی خود ساختہ خوش گمانی کا باہمی تذکرہ ہوتا، گھر سے آئے خطوط کے مندرجات بار بار دہرائے جاتے اور کسی متوقع ملاقات کے لیے دن گنے جاتے۔

وقت پورا ہوتا تو سب دوبارہ کوٹھڑیوں میں بند ہو جاتے۔اور دیواریں بجا بجا کر ایک دوسرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے.....کوئی اونچی آواز میں درود پڑھتا۔کوئی بھولے بسرے نغمے چھیڑ لیتا اور بعض تو ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر ہوا کے سپرد کرتے رہتے۔

خادم زیادہ تر خاموش رہتا۔ہانڈیوال اسے دیکھ کر دور سے نعرہ لگاتا۔

''بولا کر وڑ کے۔کہنے سننے سے آدھا دکھ دور ہو جاتا ہے۔'' پانچ نمبر کوٹھڑی کا اندھا قیدی کہتا۔

''ہم تو یہ جانتے ہیں کہ بندہ بندے کی خوراک ہے۔اکیلا رہ جائے تو جی نہیں پاتا۔جتنی دیر زندہ ہو ہنستے، بولتے رہا کرو۔اگلی دنیا میں جانے کیا ہو۔منہ سے بھاپ نکالنے کو بھی کوئی ملے یا نہ ملے۔''

خادم سب کی سنتا اور سن کر کبھی کبھی مسکرا بھی دیتا۔البتہ اس کی چپ نہ ٹوٹی۔یہاں تک کہ بیٹھے بٹھائے



ایک روز اس کے سیاہ وارنٹ آ گئے اور اسے موت کے تختے پہ لٹکائے جانے کی پکی خبر سنا دی گئی۔ایک مدت کے بعد احاطے میں ایسا واقعہ ہونے کو تھا۔سو سبھی کا سوگوار ہونا بنتا تھا۔ماحول نے یکدم پلٹا کھایا۔قیدی آتے جاتے کن انکھیوں سے اسے تکتے اور اس کی اٹھتی جوانی کے رل جانے پہ چچ چچ کرتے۔اندھے قیدی نے البتہ اب اسے نصیحت کرنا چھوڑ دی۔ہانڈیوال نے اس کے پیالے میں آدھا چمچ دال زائد ڈالنی شروع کر دیا۔کسی بھی ملاقات کی آمد پر اس کے لیے فروٹ اور سوغاتوں کا تگڑا حصہ علیحدہ کر کے پہلے اسے بھجوایا جاتا۔رات کو سوتے میں اچانک کسی قیدی کی آنکھ کھل جاتی تو اسے فوراً ہی خادم کا خیال آتا اور وہ اونگھتے اونگھتے بھی افسردہ ہو جاتا۔

گھر والے آخری ملاقات کو آئے۔ماں دیر تک اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر روتی رہی۔باپ بنا کسی بہانے کے کندھے سے انگوچھا اٹھا اٹھا کر اپنی آنکھیں پونچھتا رہا اور ادھر جمن کمہار کی لڑکی اس روز اماؤس کی رات بجھنے تک ان کے گھر کی دہلیز پہ بیٹھی ملاقاتیوں کے لوٹ کر آنے کا انتظار کرتی رہی۔

جیلر نے خادم سے اس کی آخری خواہش کے بارے میں پوچھا اور اس کا جواب سن کر پہلے تو بھچک سا گیا۔پھر ٹھٹھا مار کر بولا۔

''یہ بھی کوئی خواہش ہے بھلا؟ تیرا در فٹے منہ لڑکے تجھے تو خواہش پالنا بھی نہ آئی۔'' پھر اس نے دفتر میں آ کر ہیڈ محرر کو بلایا۔دونوں نے اپنے اپنے خیالات کو باہم گتھم گتھا کیا۔پھر ماشکی کو بلا کر مناسب ہدایت نامہ جاری کرنے کے بعد محرر بولا۔

''سرکار معافی دے دیتی۔ایسے اچھے ریکارڈ پہ تو کم عمر مجرموں کو رعایت مل جاتی ہے۔''

''معافی کیسی؟ اس کی تو اپیل بھی خارج ہو گئی۔''

''بیبا بچہ ہے سرکار۔جب آیا تھا تو بالکل بھیڑ کا مینڈھا معلوم ہوتا تھا۔جیل کے ماحول میں ایسے رہا جیسے پانی میں مچھلی رہتی ہے۔دو سالوں میں کیسا بھرپور جوان بن گیا ہے۔بدن اب بھی منحنی سا ہے تو کیا ہوا کڑیالے جیسا منہ تو نکال لیا ہے۔''

''مگر کل نہ مچھلی پانی میں رہے گی نہ کڑیالے جیسا منہ گردن پہ کھڑا رہے گا۔قتل کا جرم چھوٹا نہیں ہے۔جتنا بڑا گناہ، اتنی بڑی سزا۔''

''اللہ کی اللہ ہی جانے۔وہ تو اب تک اپنے آپ کو بے گناہ کہتا آیا ہے۔''

''الزام لگا.....حوالاتی ہوا.....مقدمہ چلا.....سزا سنائی گئی اور تم کہتے ہو کہ وہ بے گناہ ہے۔''

''خیر ادھر ادھر کی ہانکنا چھوڑو اور شام کی تیاری پکڑو۔اس کے بعد صبح کا انتظام بھی ایک نظر دیکھ لینا۔'' انتظام تو خیر پہلے سے مکمل تھے۔البتہ اس شام ماشکی نے احاطے میں چھڑکاؤ کے بعد معمول سے ہٹ کر کرسیاں اور سٹول رکھے۔سیلی سیلی زمین پر کئی پھٹی بدرنگی دری بچھائی۔اور عشاء کی نماز کے بعد تمام

قیدیوں کو بحکم سرکار احاطے میں جمع ہونے کا فرمان سنایا۔

سنتری اپنی اپنی پوزیشنوں پر چوکس کھڑے تھے۔ ایمرجنسی میں بج اٹھنے والے ہنگامی سائرنوں کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔ بیرونی دیواروں سے لٹکی تاروں میں تیز برقی رو جاری وساری تھی۔ اور احاطے کے گرداگرد پھیلی بارکوں کو درمیان سے کاٹتی پتلی گلیوں میں قیدیوں کے پاؤں گھسیٹ کر چلنے کی آوازیں پھیلی ہوئی تھیں۔

سب سے پہلے تمام قیدیوں کو قطار اندر قطار بٹھایا گیا۔ پھر چھوٹا موٹا عملہ آیا اور پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہو گیا۔ کچھ لوگ سٹولوں پہ ٹک گئے۔ سب سے آخر میں جیل وارڈن پہنچا۔ اس نے آتے کی ہیڈ محرر کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں احاطے کے داہنی کونپیں جا کھڑے ہوئے۔

''سب ٹھیک ہے ناں سمندر خان؟''

''سب فٹ ہے سرکار۔''

''جلاد؟''

''حاضر ہو جائے گا حضور!''

''ڈاکٹر.....سرکاری ایمبولینس؟''

''دونوں جھوٹی صبح کے ہوتے ہی پہنچ جائیں گے۔''

پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے خادم کی کوٹھڑی تک آئے۔ سنتری نے لاک کھولا۔ دروازہ ہلکی آواز میں چرچرایا۔ وارڈن خوامخواہ مونچھوں پہ تاؤ دینے لگا۔ خادم بیڑیاں بجاتا باہر نکلا۔ اس کا چہرہ معمول کی طرح سپاٹ تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا مجمعے کے قریب آیا۔ اور ہیڈ محرر کا اشارہ پا کر ایک خالی سٹول پر بیٹھ گیا۔

محرر کھنکارا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں وارڈن سے اجازت طلب کی۔ اور کہنے لگا۔

''تم سب جانتے ہو کہ آج خادم کی زندگی کی آخری رات ہے۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے اسے پھانسی کے تختے پہ لٹکا دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکا۔ وہ ایک لمحہ پتھریلے سناٹے میں تبدیل ہوا، یکا یک اچھلا اور ٹھک کر کے مجمعے کے بیچ جا گرا۔

محرر پھر بولا۔

''آج ہم سب یہاں خادم کی آخری خواہش کے احترام میں جمع ہوئے ہیں۔ خادم ہم سب کے سامنے آج کے دن اپنی زندگی کا آخری گیت گانا چاہتا ہے۔ یہی اس کی آخری خواہش ہے۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ خاموشی اور توجہ سے اسے سنیں۔ امید ہے کہ آپ تعاون فرمائیں گے۔''

یہ کہہ کر محرر خاموش ہو گیا اور منتظر نگاہوں سے خادم کو تکنے لگا..... مجمعے کی نگاہیں بھی اس وقت خادم پہ جمی ہوئی تھیں۔ خادم نے سرسری نگاہ ان سب پہ ڈالی۔ پھر سر پہ تنے نیم تاریک گدلے شامیانے



جیسے آسمان کو تکا۔ چاند مکمل طور پر غائب تھا۔ کہیں کہیں اکا دکا تارے ٹمٹما رہے تھے۔ جن کی دھندلی چھاؤں احاطے کے طول وعرض نے باہم بانٹ رکھی تھی۔ مجمعے کے سر کے عین اوپر ایک زرد رنگ کا مدقوق بلب جل رہا تھا۔ جس کی روشنی بیرک کی دیواروں پہ کسی صحرائی بیتال کی طرح لرز رہی تھی اور اس نے رات کے مہیب منظر کو مزید وحشتناک بنا دیا تھا۔

خادم نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

''میں آپ سب سے معافی کا طلب گار ہوں۔

پھر وہ ایک لمحے کے لیے رکا، اور دوبارہ بولا۔

''ایک ہی کھرلی پہ کھاتے، چرتے، سو باتیں دل آزاری کی ہو جاتی ہیں۔ مجھ سے بھی ہزار غلطیاں ہوئی ہونگی۔ میں نے بھی کسی کا دل دکھایا ہوگا۔ میری وجہ سے کوئی پریشان ہوا ہوگا مگر میری آپ سے التجاء ہے کہ اللہ رسول کے واسطے میرا کہا سنا معاف کر دیں۔''

مجمعے میں بیٹھے قیدیوں میں سے کسی ایک کی سسکی نکل گئی۔ بہت سے دوسرے، ساتھیوں سے نگاہیں بچا کر آستینوں سے آنکھیں پونچھنے لگے۔ یکدم خادم کی سریلی آواز ماحول میں جگہ بناتی ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں اداسی کی لہریں بناتی چار سو پھیل گئی۔ خادم آنکھیں موندے ہوئے گا رہا تھا۔

چھپ جاؤ تاریوں کر دیو ہنیر وے  اساں نئیں ویکھنی اج دی سویروے

اداسی بھرا سکوت ایک چھناکے سے ٹوٹا۔ اور درد کا آبلہ یوں پھوٹ کے بہا کہ سرسا گر کو اپنے اندر بہا لے گیا۔ روتے روتے قیدیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ خادم گائے چلا جاتا تھا۔ گائے چلا جاتا تھا۔ اور قیدیوں کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آنے والی صبح کو پھانسی اسے نہیں، ان سب کو ہونے والی ہے۔

◂◂ ● ▸▸

C/o.A.Waheed Saqib
Punjab Travels and Tours
Shoukat Plaza GT Road
Kharian, Gujrat.
Punjab .Pakistan.
Post code.50090
PH#.03338424144

● محمد یحیٰ ابراھیم

# ایک جھوٹی کہانی

'سنو!'

'ارے سنو'.....'رُکو تو!'

''جی میں جلدی میں ہوں۔''

'ایسی بھی کیا جلدی ہے.....دو منٹ رُک جاؤ.....بات تو سُن لو میری۔'

''سر! میں جلدی میں ہوں، چاٹ اور گول گپّے لینے نکلا تھا.....گھر پہ بیوی بچّے انتظار کر رہے ہیں میرا۔''

'غلط بول گئے تم.....تمہارا انتظار نہیں؛ گول گپّوں کا۔'

''ہاں.....ٹھیک ہے، ابھی مجھے جانے دیں۔''

''دو منٹ کے لئے رُک جاؤ۔ بات سُن لو میری۔ زیادہ نہیں روکیں گے۔''

''شاید آپ کو کچھ مدد چاہیے۔ یہ لیں، یہ پیسے رکھیں۔''

'نہیں نہیں.....مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں، پیسے ویسے نہیں چاہئیں مجھے، بس بات سُن لو میری۔''

''دیکھئے، میں جلدی میں ہوں۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اس پہ فون نمبر لکھا ہے میرا۔ آپ بات کر لیجئے گا۔ بلکہ ابھی سے آدھے گھنٹے بعد ہی فون کر لیجئے گا۔''

''میں فون نہیں رکھتا۔''

''افو! پھر بھی.....آپ یہ کارڈ رکھیں میر.....اس پہ ایڈریس لکھا ہے، آپ کل یونیورسٹی آ جائیں، ہم لوگ آرام سے ڈپارٹمنٹ میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''کل تو میں اس شہر سے چلا جاؤں گا، نقل مکانی فطرت اور قسمت دونوں ہے میری، تم ابھی بات نہیں سُن سکتے؟''

''ارے! آپ ہیں کون؟ کیوں اس طرح سے گلے پڑ گئے ہیں میرے؟''

''میں ایک کہانی کار ہوں اور تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔''

''کہانی!.....ارے نہیں نہیں، اس کا وقت نہیں ہے، آپ کو بتایا تو ہے کہ میں گول گپّے اور چاٹ



لینے آیا تھا۔ گھر پہ بیوی اور بچّے انتظار کر رہے ہوں گے میرا۔''

''مگر میری کہانی کو تمہارا زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ تھوڑی دیر رُک جاؤ اور میری یہ کہانی سُن لو۔''

''اُف! یہ آپ کا اسرار اور میرا نرم پڑتا ہوا کچوری چاٹ.....سنائیں، جلدی سنائیں.....لیکن زیادہ دیر نہ لگائیے گا۔''

''نہیں، نہیں، زیادہ وقت نہیں لوں گا تمہارا۔ بس آڑی ترچھی لکیروں کا ایک چھوٹا سا کولاج سناؤں گا تمہیں۔ آگے، پیچھے اور بیچ کے gaps تم خود fill کر لینا.....آؤ، سامنے بیٹھتے ہیں۔''

اور پھر وہ دونوں فوڈ کورٹ نام کے اس فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کے باہر پڑی پلاسٹک کی لال کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے دونوں شاپرس، جس میں ایک میں کچوری چاٹ اور دوسرے میں گول گپّے تھے، سامنے ٹیبل پر رکھ دیئے۔ کہانی کار نے اپنا اوور کوٹ ایڈجسٹ کیا۔ اپنا چشمہ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور اپنی برنارڈ شاء اسٹائل کی داڑھی میں ہاتھ پھیرتا ہوا اس سے مخاطب ہوا۔

''یہ بات ان دنوں کی ہے جب وہ گیارہ بارہ سال کا تھا۔''

''وہ کون؟''

''ارے بھئی میری کہانی کا ہیرو۔''

''نام نہیں رکھا اس کا۔''

اس نے کہانی کار کی آنکھوں میں گھورا۔ اسے دیر ہو رہی تھی اور یہ شخص اُسے خواہ مخواہ الجھائے ہوا تھا۔ گھر پہ بیوی بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ گول گپّے اور چاٹ اٹھائے اور گھر کی طرف روانہ ہو جائے۔ لیکن نہ جانے کیا تھا اس کہانی کار کی بوڑھی تجربہ کار آنکھوں میں۔ وہ اپنی کرسی سے لگ کر رہ گیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بات ان دنوں کی ہے جب وہ گیارہ بارہ سال کا تھا۔ اس کے باپ نے اسے ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول سے ہٹا کر ایک سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا تھا کیونکہ وہ اس پرائیویٹ اسکول کی فیس ادا نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ پرائیویٹ اسکول میں تھا تو ماہانہ کرائے والے ایک اسکول رکشے سے اسکول جایا کرتا تھا لیکن شاید اس کا باپ وہ بھی افورڈ نہ کر سکتا تھا اس لئے جب اس کا داخلہ سرکاری اسکول میں ہوا تو اس نے گھر سے اسکول تک پیدل پہنچانے والی ریلوے لائن کا راستہ اسے دکھا دیا اور وہ کئی سال تک اسی ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتا ہوا اسکول آتا جاتا رہا۔ اس کے باپ کے پاس مالی ذرائع کافی کم تھے۔ جہاں وہ نوکری کرتا تھا وہاں سات سات آٹھ آٹھ مہینے انہیں تنخواہ نہیں ملا کرتی تھی۔ مگر اکلوتا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والدین کا لاڈلا اور ان کے خوابوں کا مرکز تھا۔ ایک اچھے علمی

خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے اس کے باپ نے اس کی تربیت بہت بہتر طریقے سے کی تھی۔''

موبائل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کہانی کار کی طرف دیکھا۔ کہانی کار خاموش ہو گیا اور اس نے فون اٹھالیا۔

''ہاں بیٹا! آ رہا ہوں.....نہیں نہیں.....ابھی سینٹر پوائنٹ پر ہی ہوں۔ ایک جاننے والے انکل مِل گئے تو ان سے باتیں ہونے لگیں، میں بس آتا ہوں.....کیا کہہ رہی ہیں ممی؟.....اچھا اچھا.....ٹھیک ہے۔ میں آتے ہوئے تصویر محل کی طرف سے آؤں گا.....لے آؤں گا روٹیاں.....خدا حافظ۔''

''بہت پریشر میں تو نہیں ہو؟''

کہانی کار اُس سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

''نہیں، نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ اپنی بات مکمل کریں۔''

''تو پھر بیٹی سے جھوٹ کیوں کہا کہ ایک جاننے والے انکل مل گئے؟'

''آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں اپنی بیٹی سے بات کر رہا تھا؟''

''یہ کون سا مشکل کام ہے، 'بیٹا' آج کل جینڈر نیوٹرل (Gender Neutral) لفظ ہے۔ ان موبائیلوں نے زندگی بڑی دشوار کر دی ہے تم جیسوں کی۔ ہر وقت 'آپ کیمرے کی نظر میں ہیں' ٹائپ سے تم لوگ بیوی بچوں کے Under Scanner رہتے ہو.....خیر چھوڑو، کہانی سُن.....تمہیں جانا بھی ہے۔''

'ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حالانکہ اس کے باپ کے پاس زیادہ مالی وسائل نہیں تھے لیکن اکلوتا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والدین کے خوابوں کا محور اور ان کی زندگی کا مرکز تھا۔ جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو جس ریلوے لائن کو پکڑ کر اس کے کنارے سے چلتا ہوا وہ اپنے اسکول آیا جایا کرتا تھا اسی ریلوے لائن کو پکڑ کر وہ ملک کی ایک بڑی اور مشہور یونیورسٹی چلا گیا۔ وہاں اس نے بہت اچھا پرفارم کیا اور وہیں بحیثیت استاد اس کا تقرر ہو گیا۔ یونیورسٹی کے ہی ایک سینئر پروفیسر کی بیٹی سے اس نے شادی بھی کر لی۔ طالب علمی کے دوران چھٹیوں میں وہ ہمیشہ اپنے والدین سے ملنے چلا جایا کرتا تھا لیکن شادی کے بعد یہ سلسلہ کافی کم ہو گیا۔''

''تمہارا فون بج رہا ہے.....اٹھالو.....اس بار ضرور تمہاری وائف ہوگی فون پہ۔''

''جی! ہیلو.....ہاں میں آ رہا ہوں، بس پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں.....نہیں نہیں، آپ کا چاٹ بالکل ٹھیک ہے ذرا بھی نرم نہیں ہو.....ہاں ہاں، روٹیاں میں نے لے لی ہیں۔ بس ذرا زاہد کی دکان پر کھڑا ہو گیا.....اس سے دو باتیں کر لوں.....بس آتا ہوں.....ارے نہیں بابا!، سگریٹ نہیں پی رہا، تمہارے لئے میٹھے پان بنوا رہا ہوں.....ہاں میں آتا ہوں بس.....خدا حافظ۔''

''تم نے جھوٹ کیوں کہا؟ روٹیاں تم نے لی نہیں ہیں اور اب تو تمہیں پان بھی لے کر جانا پڑے گا۔''



''اگر میں یہ کہہ دیتا کہ میں اب تک فوڈ کورٹ کے پاس ہی بیٹھا ہوں تو وہ اور زیادہ ناراض ہوتیں۔ خیر، آپ یہ چھوڑیں، اپنی کہانی مکمل کریں۔''

''اگر تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔''

''نہیں نہیں.....آپ اپنی کہانی مکمل کریں.....بس ذرا جلدی کریں۔''

''اچھا سُنو! اس نے کئی دفعہ یہ کوشش کی کہ اس کے والدین اس کے ساتھ رہیں۔ کئی بار اس نے انہیں اپنے یہاں لایا۔ وہ کئی دفعہ آئے۔ وہ جب بھی آتے، بڑے شوق سے آتے، بڑے چاؤ سے رہتے۔ ہر بار ماہ دو ماہ بڑا اچھا گذرتا، پھر نہ جانے کیا ہو جاتا کہ وہ واپس جانے کی ضد کرنے لگتے اور اس کے لئے زندگی مشکل ہو جاتی اور پھر ہمیشہ ان کی ضد کے آگے ہار کر وہ انہیں واپس پہنچا دیتا اور ایک بار وہ ایسا گئے کہ پھر کبھی واپس نہ آئے۔ اس مرتبہ ان کے جانے سے وہ کچھ زیادہ ہی بد دِل ہو گیا۔ اس نے انہیں فون وون کرنا بھی تقریباً بند کر دیا۔ اس کے ابّا ہی اس کو رہ رہ کر فون کر لیا کرتے۔ کئی ماہ یوں ہی گذرے۔ بیچ میں دو ایک لمبی چھٹیاں بھی نکل گئیں۔ لیکن وہ ان سے ملنے نہیں گیا۔ اس کے باپ نے اس کے آنے کا پوچھا بھی مگر وہ اپنی مشغولیت کا کہہ کر ٹال گیا۔ اسے گھر گئے ہوئے اور اپنے والدین سے ملے ہوئے کئی ماہ گذر گئے۔ اس کا باپ سمجھ رہا تھا کہ ان کے درمیان کچھ پھنس سا گیا ہے، کچھ اٹک سا گیا۔ ایک روز فون پر اس نے اس سے کہا کہ وہ اور اس کی ماں اس کے پاس پھر آنا چاہتے ہیں۔ پہلے اس طرح کے سچویشن میں وہ بپھر جاتا تھا۔ جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالتا تھا اور پھر آہستہ سے کہتا تھا کہ ٹھیک ہے آپ لوگ تیاری کریں، میں فلاں تاریخ کو لینے آ جاؤں گا۔ لیکن اس بار نہ وہ بپھرا نہ غصہ ہوا، نہ کسی قسم کی بھڑاس نکالی، نہ چیخا چلّایا بس یہ بول کر فون رکھ دیا کہ کوئی ضرورت نہیں، بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ وہیں پڑے رہیں۔ اس کے اس جملے نے اپنے باپ کے ساتھ اس کے رشتے میں لگی پھانس کو کھول دیا اور وہ جلد ہی زندگی کے بندھن سے آزاد ہو گیا۔ اس کی ماں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔''

اتنا کہہ کر کہانی کار خاموش ہو گیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سامنے شاپرس میں پڑی کچوری چاٹ نرم پڑ چکی تھی۔ کہانی کار تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر اٹھا، اس کے شانوں پر دھیرے سے ہاتھ رکھا، اپنا اوورکوٹ ایڈجسٹ کیا۔ عینک پہنی اور اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتا یہ کہتا وہاں سے نکل گیا کہ:

''اس کہانی کے سبھی کردار فرضی ہیں اور کسی بھی شخص 'زندہ یا مردہ' سے اس کی مماثلت محض ایک اتفاق ہے۔''

◀◀ ● ▶▶

H.O.D Dept of English
Karim City College, Jamshedpur
(Jharkhand) Mob: 9431759629

# تبصرے

کتاب : شفیع مشہدی کے افسانے (تعارف وانتخاب)
مرتب : ڈاکٹر ہمایوں اشرف
اشاعت : ۲۰۲۲ء
صفحات : ۲۷۶ قیمت : ۳۵۰/روپے
مبصر : ڈاکٹر منظر اعجاز

ڈاکٹر ہمایوں اشرف جواں سال نقادوں اور محققوں میں امتیازِ خاص کے حامل اس لئے بھی قرار دئے جاسکتے ہیں کہ انہوں نے ترتیب وتدوین کے حوالے سے اپنے ہم عمر معاصرین کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ان کے اس نوعیت کے کام کی طویل فہرست بہت ہی طویل ہے جو فی الحال میرے تخمینے میں نہیں آسکتی۔ زیرِنظر کتاب اسی نوعیت کی ہے جس میں شفیع مشہدی کے تیس افسانوں کو انہوں نے ''شفیع نامہ'' کے زیرعنوان اپنے دیباچے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔اس دیباچے میں شفیع مشہدی کے سوانحی احوال وادبی کوائف کو بھی شامل کیا ہے۔''میں اور میرے افسانے'' کے عنوان کے تحت شفیع مشہدی کی ایک اہم تحریر بھی شامل کتاب ہے۔علاوہ ازیں شفیع مشہدی سے ایک ادبی گفتگو یعنی انٹرویو بھی ہے۔اور پھر ہمایوں اشرف نے ہر افسانے پر بہ اختصار چند اپنے ناقدانہ تاثرات بھی پیش کئے ہیں جو ''کچھ ان کہانیوں کے بارے میں'' کے تحت ان کے قلم سے وارد ہوئے ہیں۔اسی کے بعد تیس کہانیاں ترتیب دی ہیں جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| (۱) کرچیاں | (۲) شونار ہرین | (۳) جھاگ | (۴) سنیچر شاہ | (۵) بنتِ زلیخا |
| (۶) سبکدوش | (۷) طوطے کا انتظار | (۸) قہر درویش | (۹) ہوئے کیوں نہ غرق دریا | (۱۰) جھینی جھینی رے چدریا |
| (۱۱) دیمک | (۱۲) قصہ راما کاکا | (۱۳) سید کی حویلی | (۱۴) سبز پرندوں کا سفر | (۱۵) آہنی ہے پیرہن |
| (۱۶) انتقام | (۱۷) گرتی دیواریں | (۱۸) کافور کی خوشبو | (۱۹) سوئیٹ سلطان | (۲۰) روشنی کی آگ |
| (۲۱) کبوتر | (۲۲) آگ | (۲۳) میک اپ | (۲۴) بڑی سرکار | (۲۵) مٹی کی خوشبو |
| (۲۶) نیلے بادبان والی کشتی | (۲۷) جلدی کرو | (۲۸) بھٹوں کی فصل | (۲۹) سلوٹیں | (۳۰) پیاس |



زبان وادب سے متعلق شفیع مشہدی صاحب کی خدمات کئی جہتوں پر مشتمل ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور بہت اچھے شاعر ہیں۔انہوں نے ریڈیو اور ٹی.وی. کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ اسٹیجی ڈراموں سے بھی خاصی رغبت رہی ہے۔تحقیق اور ترتیب وتدوین کے کاموں سے بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کو خادمِ اردو قرار دیتے ہیں اور یہ غلط بھی نہیں کیوں کہ اردو زبان کے فروغ وارتقاء کی تحریک سے ان کی دیرینہ وابستگی رہی ہے اور اب بھی ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے کہا وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے تقریباً ایک سو افسانے لکھے ہیں اور جو کچھ لکھا ہے چھان پھٹک کر لکھا ہے۔ بیشتر کہانیاں واردات حقیقی اور سچے واقعات پر مشتمل ہیں۔میرے لئے تحیّر آمیز بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں ایک ہی نشست میں لکھے ہیں باوجود اس کے کسی افسانے میں جھول جھال یا ڈھیل ڈھال نہیں ہے۔

زیرِنظر افسانے کی فہرست میں کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جو رسائل وجرائد کے مطبوعہ تو ہیں ہی علاوہ ازیں پہلے کے منتخب افسانوی مجموعہ ''سنی حکایت ہستی'' میں بھی شامل ہیں۔ ویسے افسانہ نگاری میں ان کے بڑھتے قدم بڑھتے ہی جارہے ہیں۔سفر جاری ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آیئے اب زیرِنظر افسانوں سے متعلق مرتبِ کتاب ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے نقد ونظر اور تبصرے وتاثرات پر بھی تا حد امکان سرسری نظر ڈالتے چلیں۔شروع کرتے ہیں پہلے افسانہ ''کرچیاں'' سے۔ ہمایوں اشرف اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''عصر حاضر کی پُر پیچ زندگی، اس کے نشیب وفراز، فرد کی نفسی اور داخلی کیفیات، اس کی محرومی، محزونی، اس کی ایلی نیشن اور بیگانہ وشی، اس کی اجنبیت اور تنہائی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا منفی رویّہ، ذات کے گم شدہ حصّے کی تلاش، بے چہرگی اور بے سمتی کا کرب، زمین سے اجڑنے اور جڑوں سے اکھڑنے کا احساس، ماضی (ذاتی، تہذیبی) کی بازیافت، زندگی کی لایعنیت اور بے مقصدیت، قدروں کی ٹوٹتی بکھرتی کرچیاں، زندگی کی تہوں سے ابلنے والا احساس اور ایک نئی بصیرت کو جن افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیق کی اساس بنایا، ان میں شفیع مشہدی کا نام نمایاں طور پر قابل ذکر ہے''۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے جدیدیت کے رجحان کے امتیاز واختصاصات کی مجموعی کیفیت درج بالا اقتباس میں بیان کردی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس رجحان کے نمائندہ افسانوں میں شفیع مشہدی صاحب کا

افسانہ اپنی یافت کے لحاظ سے بھی نمایاں ہے۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اس عبارت میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔''کرچیاں'' پرانہوں نے الگ سے بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ''شفیع مشہدی کے نمائندہ افسانوں کی پہلی کہانی 'کرچیاں' ہے۔اس کا مرکزی تصوّر وجود کی ٹوٹتی بکھرتی کرچیاں ہیں''۔

اسی نوعیت کی دوسری کہانی ''شونار ہرین''یعنی سونے کا ہرن ہے۔لیکن فرق یہ ہے کہ یہ کہانی شعور کی رو،stream of consiusness کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔یہ کہانی تنقید وتبصرہ اور تجزیہ کے لئے علمی استعداد کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔علم نفسیات، مارکسزم، وجودیت Existensialism کے اثرات بھی نمایاں ہیں اور سب سے بڑھ کر اس میں متصوفانہ تصوّرات کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا نقطۂ عروج اسی تصوّر سے متعلق ہے۔اس پر ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا تبصرہ بعض پہلوؤں سے بے حد اہم ہے۔لیکن بعض مصطلحات جو علم نفسیات سے متعلق ہیں عام قاریوں کے لئے سنگ راہ ثابت ہوسکتی ہیں لیکن افسانے کے معیار کے مطابق ہے۔ وجودیت کا مسئلہ یہاں بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدیدیت میں نفسیات اور وجودیت چولی دامن کی طرح ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہے۔شفیع مشہدی صاحب کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ علم نفسیات کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے زوال آمادہ دور میں کیا۔اس کے بعد جدیدیت کا دور آیا لیکن انہوں نے کسی تحریک یا رجحان سے وابستگی اختیار نہیں کی البتہ ان سے متاثر ضرور ہوئے۔ان کے اثرات کی نشاندہی ان کے متعدد افسانوں سے ہوتی ہے۔ جہاں تک ''شونار ہرین'' کا تعلق ہے تو اس کا آغاز ہی نفسیاتی پیچیدگی کے اظہار سے ہوا ہے۔اس کے مرکزی تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے لکھا ہے:

''افسانہ 'شونار ہرین' کا مرکزی تصور بھی انسان کی محرومی ومحزونی ہے۔
کہانی کا بنیادی کردار محبت میں ناکامی کا منھ دیکھتا ہے اور اسے اپنے اردگرد کی دنیا تاریکی میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ خود کو ایک سرنگ کے بیچ معلق پاتا ہے جس کے نیچے گہری اتھاہ کھائی ہے اور اوپر کی اونچائی لامعلوم۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کی یاد آتی ہے۔ریزی ڈینسی میں محبوب کے ساتھ گھومنا، چار باغ، دل کشا، امام باڑہ وغیرہ میں سیر کرنا۔ پھر اسے وہ سیاہ گھوڑا یاد آتا ہے جو ریس میں منھ کے بل گر گیا تھا۔اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ سرنگ کی لامحدود گہرائیوں میں گرتا جا رہا ہے۔اس نے تاریکیوں میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو سیاہ گھوڑا اس کے پہلو میں مردہ پڑا تھا۔اس میں کردار کی نفسیات کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے''۔



مسئلہ یقیناً نفسیاتی ہے اور اس میں واقعی کردار کی نفسیات کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ کہانی کا بنیادی کردار محبت میں ناکامی کا منھ دیکھتا ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تو یہاں معرضِ بیان میں نہیں آیا ہے لیکن میرے ذاتی مطالعے کے مطابق اس کا بنیادی سبب معاشی بنیادوں پر طبقاتی کشمکش ہے۔محبوب کا جو Socio economic اور cultural status ہے، وہ عاشق زار کا نہیں۔ یہاں وہاں گھومنا اور سیر سپاٹے پر نکلنا ایک طرح سے اوقات گزاری کا مشغلہ ہے لیکن ایک موقع پر یہ عاشق بالواسطہ طور پر اپنی محبت کا اظہار یوں کرتا ہے کہ:''محبت کے بارے میں تمہارا خیال کیا ہے تو محبوب کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے اور کہتی ہے It is an obsessive phyconeurosis یعنی'' کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا''۔ذرا آگے بڑھ کر شعلۂ شوق اور بھڑکتا ہے اور عاشق، معشوق کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے تو وہ بجلی کے جھٹکے کی سی کیفیت میں ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور عاشق کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے:

اے دل نہ الجھنا تھا یوں سنگ سے آہن سے　　وہ جیسے تھے ویسے ہیں تو ٹوٹ گیا چھن سے

اور یہی کیفیت اسے ایسے نفسیاتی مرض میں مبتلا کر دیتی ہے جسے فراق گورکھپوری نے''کابوس'' سے تعبیر کیا ہے۔شفق کا ایک ناول''کابوس''ہی کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے لیکن''کانچ کا بازی گر''میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے اور یہی کیفیت احمد یوسف کے بعض افسانوں میں بھی ملتی ہے۔

اس میں مہا کال کے حوالے سے ایشور اور آدم کے مکالمے بھی ہیں۔اس میں واضح طور پر وجودیت کے مغربی مفکرین کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت غیر ضروری نہیں ہوگی کہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس یہی وجودی فکر وفلسفہ ہے جو تمام تر قنوطیت پسند ہے۔اس میں خدا کے وجود کا انکار پایا جاتا ہے لیکن اس افسانے میں خدا کا انکار بظاہر نہیں پھر بھی بالواسطہ طور پر دیکھیں تو خدا کے وجود کو فرضی قرار دے کر تمسخر اور مضحکہ سے کام لیا گیا ہے۔واضح رہے کہ یہ شفیع مشہدی صاحب کا نظریہ نہیں، کردار کے ذریعے وجودی فکر وفلسفہ کو بروئے کار لایا گیا ہے۔سیاہ گھوڑا جو ریس میں منھ کے بل گر گیا تھا اور بالآخر وہ مردہ پایا جاتا ہے۔ یہ تمنّاؤں، ارمانوں اور آرزوؤں کی موت کا استعارہ ہے جسے اس کہانی میں رابندر ناتھ ٹیگور کے''شونار ہرین'' سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ دراصل رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک گیت اسی عنوان سے ان کے سرمایۂ سخن میں شامل ہے۔رابندر ناتھ ٹیگور نے بطور علامت اسے رامائن کے ایک واقعہ سے اخذ کیا ہے۔ یہ دراصل متصوفانہ نکات پر مشتمل ہے۔ میں نے دو ڈھائی دہائی قبل لکھا تھا کہ''

تصوف، مذاہب کی روح ہے''۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ''شونار ہرین'' کے ذریعے اسی روح کونکھار کر پیش کرنے کی مستحسن کاوش کی ہے۔ سہانہ منظور نے رابندر ناتھ ٹیگور کے اس گیت کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس کی تشریح وتعبیر بھی پیش کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"There is a reference to Sita's yearing for the golden dear during her exile in the poem, an episode which led to her kidnaping byRavana in Ramayana".

رامائن کے اس episode کا واقعہ یہ ہے کہ بن باس کے زمانہ میں سیتا جی نے دیکھا کہ ایک سونے کا ہرن چوکڑی بھرتا سامنے سے گزر گیا۔ انہوں نے شری رام کو آواز دی اور یہ واقعہ سنایا اور گزارش کی کہ سونے کے اس ہرن کو پکڑ کر لے آئیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ سونے کا ہرن نہیں ہوتا۔ یہ چھلاوا ہے، مایہ ہے لیکن سیتا جی کی خواہش کے مطابق انہیں ہرن کی تلاش میں جانا ہی پڑا۔ ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو سیتا جی نے لکشمن جی کو ان کی تلاش کے لئے دوڑایا۔ لکشمن جی نے ایک ریکھا کھینچ دی اور کہا کہ اس سے باہر نہ نکلئے گا اور وہ چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی راون سادھو کے بھیس میں آیا اور بھکشا مانگی۔ سیتا جی نے ریکھا کے اندر ہی سے اسے کچھ دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر دینا ہی ہے تو ریکھا سے باہر آ کر دو۔ لامحالہ سیتا جی کو ایسا ہی کرنا پڑا۔ اور راون انہیں اغوا کر کے لے اڑا۔

رامائن کے اس واقعہ کے ذریعہ جو عالم انسانی کے لئے پیغام نشر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

''Remain yourself under the limitation'' یعنی اپنی خواہشوں کو حد سے آگے بڑھنے نہ دو۔ اس کو محدود اور قابو میں رکھو۔ یہ دنیا جو دکھائی دیتی ہے، بظاہر بہت حسین ہے لیکن بباطن بہت قبیح ہے۔ یہ تصوف کا نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور یہی بات قرآن مجید میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے تصوف کو مذاہب کی روح قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے کوئی تفصیلی تجزیہ پیش نہیں کیا ہے کیوں کہ یہاں اس کی گنجائش بھی نہیں تھی لیکن جتنا کچھ اس افسانے کے بارے میں لکھ دیا ہے، وہ کم نہیں ہے۔ انہوں نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ دوسرے افسانوں کی بھی روح نچوڑ کر ہدیۂ قارئین کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی، ادبی حلقے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی اس کاوش قلم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور دور تک اور دیر تک اس کی پذیرائی ہوتی رہے گی۔

◂◂ ● ▸▸



''شہر ذات''.....ایک بے حد اہم ناول

تبصرہ نگار: عبدالصمد

مصنف: شاہد اختر

پچھلے آٹھ دس برسوں کے درمیان اپنے وطن عزیز کی ہواؤں اور فضاؤں نے جو کچھ دیکھا، جھیلا، برتا اور محسوس کیا ہے، وہ سب برسہا برس میں بھی شاید تب یہاں کی سرزمین کو دیکھنا نصیب ہوا ہو۔ اس صورت حال سے سب سے زیادہ نقصان انسانیت ہی کو پہنچا، صرف انسان ہی ان کا شکار ہوا۔ جاری وساری زمانے میں ایسے بے شمار موضوعات نے جنم لیا جن پر قلم اُٹھانا، اپنے آپ کو گویا دکھوں کے ایک ایسے سمندر سے گزارنے کے مترادف ہے جو آگ سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ لکھنے پڑھنے کے شوقین نے اس سمندر سے چلو بھر آگ لے کر اپنے آپ کو اور اپنے پڑھنے والوں کو جلانے کی کوششیں بھی کی، اس کوشش میں وہ کتنے کامیاب ہوئے، یہ ایک الگ بحث ہے، مگر یہ بات تو طے ہے کہ آگ کے اس سمندر میں اتنے نت نئے موضوعات نے جنم لئے ہیں کہ انتخاب کرنا، بہت مشکل ہے۔ شاہد اختر نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ اُن کا ناول ''شہر ذات'' بظاہر ایک مختصر سا ناول ہے، مگر انہوں نے کوزے میں سمندر کو بھرنے کی کوشش کی ہے۔

ایسا نہیں کہ انہوں نے موضوعات کے جم غفیر کو صرف ہاتھ لگا کے چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے اس ڈھنگ سے اپنے موضوع کو تشکیل وترتیب کی ہے کہ قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ تقریباً سارے موضوعات ایک موضوع میں سمٹ سمٹا کر اُس کے سامنے آ گئے۔ اس سے ناول نگار کا اپنے فن پر مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا گٹھا ہوا مربوط بیانیہ ہے جس میں ترمیم وتنسیخ کی گنجائش معدوم ہوگئی ہے۔ اس فن پارے کی تراش وخراش اس ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ چند جملے بھی حذف کر دئے جائیں تو اُن کی کمی فوراً کھٹکنے لگے گی۔ داخلی اور خارجی سطح پر ذہن وسوچ کے تعلق سے جو توڑ پھوڑ ہو رہی ہے، اس کی انہوں نے نہایت دردمندی اور خلوص سے تصویر کشی کی ہے۔ ایسی تصویر کشی نہیں کہ نگاہیں صرف اس پر ٹکی رہیں بلکہ ایسی کہ قاری کے اندرون صرف ایک تصویر نہیں بلکہ بے شمار تصویریں نقش ہوتی چلی جائیں، جن کو مٹانا ممکن نہیں رہے۔ یہ تصویریں اس کو ہمیشہ ٹیس پہنچاتی رہیں۔

شاہد اختر نے ناول میں جو بیانیہ اپنایا ہے، وہ بہت دور اور دیر تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُن کا انداز علامتی نہیں ہے، مگر قدم قدم پر علامتوں کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ حالات کا اُن کا جو فنی تجزیہ ہے، اس سے قاری خود کو مکمل طور پر وابستہ محسوس کرتا ہے۔ بلکہ ناول کا مطالبہ کرتے ہوئے اکثر جگہوں پر جانی انجانی سطح پر قاری خود اس کا کردار بن جاتا ہے۔ کسی بھی تحریر کا یہ بڑا کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو پوری طرح

Involve کردے۔اور شاہد اختر کی تحریر نے یہ کمال کر دکھایا ہے۔اُن کے یہاں ایک خاص قسم کا بہاؤ ہے۔ قاری اُن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ناول نگار نے قاری کے قدموں کو اتنی مضبوطی اور اپنائیت سے پکڑ رکھا ہے کہ وہ کہیں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے پناہ محسوس نہیں کرتا۔سفر کی راہ کٹھن ہے، اسے پار کرنا آسان نہیں۔مگر ناول نگار ان راستوں سے، اس کے نشیب و فراز سے، کٹھنائیوں اور مشکلوں سے کما حقہ واقف ہے، اس لئے قاری بھی ان راستوں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔اسے سارا راستہ جانا بوجھا محسوس ہوتا ہے۔

ناول میں ماحولیات کی تبدیلی کا ذکر شاید کچھ لوگوں کو عجیب محسوس ہو، مگر ناول کے موضوع سے اس کا گہرا تعلق ہے، ناول نگار نے ایک معنی خیز علامت کے ذریعہ منظر نامے کے اُتار چڑھاؤ کو ایک نئے انداز میں روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول اگر چہ اپنے خاص موضوع کے مرکز ہی کے اردگرد گھومتا ہے، مگر ایک موضوع کے اندر لاتعداد موضوع چھپے ہوئے ہیں۔ناول نگار نے اپنے جذبات پر پورا قابو رکھا ہے۔ورنہ موضوع کا بہاؤ اتنا تیز اور تند ہے کہ سینکڑوں صفحات بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوتے۔ ناول نگار کے شعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ تاریخ نہیں۔ناول لکھ رہا ہے۔اور ناول میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے کی اہمیت ہوتی ہے۔ناول نگار ان کی حرمت سے واقف نہیں ہوتا تو یہ موضوع بہت آسانی سے ہاتھوں سے پھسل سکتا تھا۔

فکشن کا قاری، فکشن نگار کی آنکھوں اور شعور سے اپنے زمانے کو دیکھنا چاہتا ہے۔ماضی کی ٹیس وہ ہمیشہ محسوس کرتا رہے گا، مگر ماضی کی بند مٹھی سے کیا کیا چیزیں نکل گئیں اور کیا کیا ہم سے چھن گیا، کیا کیا ہم نے کھو دیا، اُن کا نوحہ ہمیں فائدہ نہیں پہنچاتا، بلکہ ہماری ہمت کو پست کرتا ہے۔جو حال ہماری آنکھوں کے پردے پر کھڑا ہے، جسے ہم دیکھنے کے ساتھ ساتھ برت بھی رہے ہیں۔اس کی جسمانی اور روحانی تکالیف کے سامنے ہمیں ماضی دھندلا نظر آتا ہے۔حال کی سفاکی، سنگ دلی اور بے رحمی نے ہمارے ہاتھوں سے ماضی کی ریشمی ڈور چھین لی ہے۔حال سے آنکھیں چُرانے کی ہماری لاشعوری کوشش ہمیں راہ فرار ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہے۔شکر ہے کہ شاہد اختر نے ثابت قدمی کے ساتھ حال سے آنکھیں ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔

ناول میں ایک بہت اہم کمی مجھے کھٹک رہی ہے، دراصل میرا ایقان ہے کہ ایک جنونی فکشن نگار کے جادوئی قلم میں صرف سیاہ روشنائی نہیں بھری ہوتی۔چاروں طرف گھپ اندھیرا ہو تب بھی اس کے قلم کی نب میں ایک پتلی سی روشن لکیر ضرور چھپی ہوتی ہے، یہ نہ ہو تو ایک لکھنے والے کا منصب بھی خطرے میں پڑ جائے۔کبھی کبھی حالات اتنے گمبھیر ہو جاتے ہیں کہ ہر چہار طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آنے لگتی ہے۔ایک



فنکار کو ناامیدی اور مایوسی کے سیاہ بادل میں ایک ایسے ستارے کی تلاش ضرور کرنا چاہئے جو اپنی ہلکی سی چمک سے اندھیرے کے غرور کو چکنا چور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

''شہر ذات'' ایک ایسا ناول ہے جو آج کے تناظر میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ: سہ ماہی عالمی فلک (تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان، کتابی سلسلہ-۱۲-۱۱، شموئل احمد نمبر)

مدیر اعزازی: ڈاکٹر سرور حسین

مدیر: احمد نثار

معاون مدیر: آفرین فاطمہ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ: عالمی فلک، کڈس کیمپس، محمد علی روڈ، سیٹی کالونی،

پوسٹ 'بی' پولی ٹکنیک، دھنباد، جھارکھنڈ (انڈیا) ۸۲۸۱۳۰

صفحات: ۲۳۰ قیمت: ۳۰۰/ہندوستانی روپے

رابطہ: ۸۴۰۹۲۴۲۲۱۱

مبصر: اقبال حسن آزاد

شموئل احمد اپنے ہم عصر فکشن رائٹرز سے ممتاز اور منفرد تھے۔ان کا ایک خصاص یہ بھی ہے کہ وہ کبھی ''شب خون'' میں نہیں چھپے۔وہ ایک خود دار شخص تھے اور انہیں خوشامد اور چاپلوسی سے سخت نفرت تھی۔ انہیں اپنے قلم پر پورا بھروسہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ نہایت اعتماد کے ساتھ لکھا۔ان کی شناخت عالمی سطح پر تھی۔افسانوں اور ناولوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے اور دوسری زبانوں کے ادب پاروں کا ترجمہ بھی کیا۔اردو کے علاوہ ان کی تحریریں ہندی، انگریزی، پنجابی اور پشتو میں بھی شایع ہوئیں۔ان کے افسانوں پر ٹیلی فلم بھی بنی اور ڈرامے بھی اسٹیج کیے گئے۔انہیں بہار اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی کے ساتھ ساتھ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر سے بھی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ان کی حیات ہی میں ہند و پاک کے کئی موقر و معتبر رسالوں میں ان پر متعدد گوشے ہو چکے تھے جن میں ''چہار سو'' (راولپنڈی)، ''مژگاں'' (کولکاتا)، ''نیا ورق'' (ممبئی) اور ''ثالث'' (مونگیر) شامل ہیں۔علاوہ ازیں ہندی رسالے ''سمبو دھن'' میں بھی ان پر گوشہ آ چکا ہے۔

''سہ ماہی عالمی فلک'' نے نہایت قلیل عرصے میں ادبی رسائل کی بھیڑ میں اپنا مقام مستحکم کر لیا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی مجلس مشاورت میں پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، احمد

صغیر، اختر آزاد اور محمد غالب نشتر جیسی قد آور شخصیتیں شامل ہیں۔ اس رسالے کا ''شموئل احمد نمبر'' نہایت شان اور طمطراق کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔ شموئل احمد کی قد آور تصویر سے ان کی قد آور شخصیت جھلکیاں مار رہی ہے۔ اتنے خوبصورت اور معنی خیز سرورق کے لیے مدیر کو اضافی مبارکباد۔

شمارے کی ابتداء مخمور سعیدی کی حمد اور شکیل بدایونی کی نعت سے ہوتی ہے جو ایک نیک فال ہے۔

احمد نثار کا تحریر کردہ اداریہ نہایت پُر مغز اور تفصیلی ہے۔ اس میں انہوں نے شموئل احمد کی حیات اور خدمات کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ اداریہ میں وہ رسالے کی اشاعت میں ہوئی تاخیر کا سبب بھی بتاتے ہیں۔ بقول شاعر:

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں اردو رسائل کا نکلنا ہی کسی معجزے سے کم نہیں۔ دیر سویر ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ ہر دم یہ خدشہ بنا رہتا ہے کہ نہ جانے کب کون سا رسالہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ بہر کیف! اداریہ کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں ''گلہائے عقیدت'' کے عنوان سے اردو کے مایہ ناز ادیب غضنفر کی شعری تخلیق پڑھنے کو ملتی ہیں۔ غضنفر نے اپنی نظم میں شموئل احمد کے ساتھ ساتھ تمام ''ہم نفسان رفتہ'' کا ذکر کیا ہے جو اردو شاعری میں ایک نیا تجربہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ معراج احمد معراج کی چار رباعیاں بھی شامل اشاعت ہیں۔ یہ رباعیاں سیدھے سبھاؤ انداز میں لکھی گئی ہیں اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

اس کے بعد شموئل احمد کا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے جسے یقیناً نہایت محنت و مشقت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ شموئل احمد پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ مشعل راہ کا کام کرے گا۔

''نقش ہائے رنگ رنگ'' کے تحت چار خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ ''نیم دروں نیم بروں'' (مشتاق احمد نوری)، ''ایک زندہ دل انسان'' (احمد صغیر)، ''یادوں کے آئینے میں'' (شاہد اختر) اور ''مجموعۂ کمالات'' (ڈاکٹر شاہد جمیل) مشتاق احمد نوری نے اپنے خاکے میں بہت ساری ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جنہیں اگر وہ نہ لکھتے تو بہتر تھا۔ شاید ان کے دل میں تھوڑی کڑواہٹ بچ رہی ہے۔ ڈاکٹر شاہد جمیل کا خاکہ محبت اور عقیدت کے شیرے میں ڈوبا ہوا ہے جبکہ بقیہ دونوں خاکے متوازن ہیں۔

''رو بہ رو'' کے عنوان سے ڈاکٹر سرور حسین اور محمد غالب نشتر نے شمائل احمد کے انٹرویو لیے ہیں جنہیں پڑھ کر شموئل احمد کی بیباکی اور صاف گوئی کی داد دینی پڑتی ہے۔ وہ جیسے اپنے افسانوں اور ناولوں میں نظر آتے ہیں ویسے ہی اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی تھی۔ تصنع، بناوٹ اور ریاکاری ان سے کوسوں دور تھی۔

''سفر قصہ نگری کا'' کے عنوان سے شموئل احمد کی افسانہ نگاری پر دس مضامین شایع کیے گئے ہیں۔ ''شموئل احمد کی تحریروں میں احتجاج کی لے'' (ڈاکٹر عشرت بیتاب)، ''شموئل احمد کی تحریر کا انوکھا



پن'' (پروفیسر اسلم جمشید پوری)، ''شموئل احمد اور القمبوس کی گردن'' (اقبال حسن آزاد) ''شموئل احمد کے افسانے: تفہیم و تجزیہ'' (ڈاکٹر ہمایوں اشرف)، ''شموئل احمد کی افسانہ نگاری'' (ڈاکٹر اقبال واجد)، ''شموئل: جنس اور جمالیات (ڈاکٹر سرور حسین)، ''افسانے کے ایک دور کا خاتمہ'' (محمد غالب نشتر)، ''شموئل احمد کے افسانوں میں سائنسی اصطلاحات'' (ڈاکٹر شہناز رحمٰن)، ''شموئل احمد کے سنگھاردان کا بافتی نظام'' (عظیم اللہ ہاشمی) اور ''شموئل احمد کا افسانوی امتیاز'' (شاہ نواز عالم) یہ سبھی مضامین شموئل احمد کے افسانوں کی پرتیں کھولنے میں معاون و مددگار ہیں۔

''تجزیاتی مطالعے'' کے تحت شموئل احمد کے تین مشہور افسانے ''ظہار''، ''منرل واٹر'' اور ''سنگھار دان'' پیش کیے گئے ہیں جن کا تجزیاتی مطالعہ بالترتیب ڈاکٹر کہکشاں پروین، ڈاکٹر سید اشہد کریم اور ڈاکٹر نزہت پروین نے پیش کیا ہے۔ عرصہ قبل ڈاکٹر وہاب اشرفی کے رسالے ''مباحثہ'' میں سنگھاردان پر مشتاق احمد نوری کا تجزیہ شایع ہوا تھا جو قدرے بہتر تھا۔

اس شمارے کا اگلا حصہ ''رقص حیات'' کے نام سے سامنے آتا ہے جس میں شموئل احمد کے ناولوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس حصے میں کل گیارہ مضامین شامل ہیں۔ ''گرداب'' پر عبدالصمد اور سلیم انصاری نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ''چمراسر'' کے سلسلے میں سب سے زیادہ پانچ مضامین سامنے آئے ہیں۔ پروفیسر انتخاب حمید، سید احمد قادری، صابرہ خاتون حنا، شکیلہ نگار اور رومانہ تبسم نے اس سیاسی ناول کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سید احمد قادری کا مضمون سب سے عمدہ ہے۔ ''مہاماری'' بھی ایک سیاسی ناول ہے۔ یہ ناول ''مباحثہ'' میں قسط وار شایع ہوا تھا اور کافی مقبول ہوا تھا۔ اس ناول پر اظہار خضر اور شبیر احمد نے اچھے مضامین تحریر کیے ہیں۔ ''ندی'' ایک نیم رومانی، نیم جنسی ناول ہے جس پر شعیب نظام اور رقیہ نبی نے طبع آزمائی کی ہے۔ دونوں مضامین دلچسپ ہیں۔

شمارے کا آخری مضمون شموئل احمد کی منفرد تخلیق ''پاکستان .....ادب کے آئینے میں'' ڈاکٹر آصف سلیم کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور خوب ہے۔

آجکل تقریباً ہر رسالے میں نئی پرانی کتابوں پر تبصرے بھی شایع کیے جاتے ہیں۔ اس شمارے میں بھی تین تبصرے شامل ہیں۔ ''رات کی بات'' (خورشید اکرم/عشرت ظہیر)، ''خموشی چیختی ہے'' (امتیاز احمد دانش/معراج احمد معراج) اور ''مظفر حنفی: حیات و جہات (انجینئر فیروز مظفر/معراج احمد معراج)

اور سب سے آخر میں گزشتہ شمارے پر عشرت ظہیر، سلیم انصاری اور ڈاکٹر احسن عالم کے تبصرے دیے گئے ہیں۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سہ ماہی عالمی فلک کا شموئل احمد نمبر ایک جاندار، شاندار اور یادگار شمارہ ہے جو تشنگانِ ادب کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے اور ہر باذوق قاری کے لیے اس مطالعہ ناگزیر ہے۔ اردو کتب ورسائل خرید کر پڑھئے اور زبان کو زندہ رکھنے میں اپنا کردار ادا کیجئے۔

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب: اس شہر میں (تین رودادی ناولٹ)
مصنف: غیاث الرحمٰن سید
صفحات: ۱۷۶ قیمت: ۳۰۰/روپے
رابطہ: ۹۸۱۸۳۰۳۱۳۶
مبصر: اقبال حسن آزاد

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ علی گڈھ کو فکشن سے ایک خاص نسبت ہے۔ قاضی عبدالستار سے لے کر سید محمد اشرف، طارق چھتاری، غضنفر، ڈاکٹر افشاں ملک، انجم قدوائی، نسترن احسن فتیحی اور غیاث الرحمٰن سید تک اردو کی ایک شاندار روایت قائم ہے۔

غیاث الرحمٰن سید اردو ادب کا ایک جانا مانا نام ہے۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں، ناول بھی اور ناولٹ بھی۔ ساتھ ہی ساتھ تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی۔ اس کے علاوہ ٹی وی سیریل، اسکرین پلے، ریڈیائی انٹرویو بھی ان کی حصولیابیوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی کتابیں ہندی میں بھی شایع ہوئی ہیں۔

''اس شہر میں'' تین ناولٹ کا مجموعہ ہے جسے مصنف نے رودادی ناولٹ کا نام دیا ہے۔ آپ انہیں سوانحی ناولٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے تین شخصیتوں کی نہایت عمدہ اور جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں اور وہ ہیں قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار اور سنجیدہ یا سجو آپا۔ قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار تو اردو ادب کی قد آور شخصیتیں ہیں لیکن سجو آپا ایک گمنام کردار ہے جسے غیاث الرحمٰن سید نے اپنے جادو نگار قلم سے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ان تین مرکزی کرداروں کے علاوہ بہت سارے ضمنی کردار بھی دوران قصہ ہمیں نظر آتے ہیں جو سب کے سب کسی نہ کسی حوالے سے نہایت اہم ہیں۔ مثلاً قرۃ العین حیدر کے باب میں قیصر نقوی، پروفیسر ساجدہ زیدی، پروفیسر زاہدہ زیدی، آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر صغرا مہدی، صالحہ عابد حسین، امیر عارفی، سید محمد اشرف اور طارق چھتاری کے قلمی چہرے نہایت فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

پہلا ناولٹ قرۃ العین حیدر کی شخصیت پر ہے۔ اس ناولٹ میں وہ ایک فرمانبردار شاگرد کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جبکہ پروفیسر ساجدہ زیدی اور قرۃ العین حیدر ایک مشفق استاد اور سرپرست کے طور پر نظر آتی



ہیں۔ چونکہ وہ ان دونوں سے بہت قریب رہے لہٰذا ان دونوں کے کردار کی کئی تہیں ہمارے سامنے کھلتی نظر آتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر بظاہر خود کو بہت لیے دئے رہتی تھیں لیکن غریب شاعروں اور ادیبوں کی مالی امداد دل کھول کر کرتی تھیں۔ بینک اور پوسٹ آفس کے کام خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتی تھیں۔ اس حصے میں حقیقت بیانی اس قدر ہے کہ ہم اسے فکشن کے بجائے ایک تفصیلی خاکہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

دوسرا ناولٹ قاضی عبدالستار کے تعلق سے ہے۔ اسے بھی ہم ایک عمدہ خاکہ کہہ سکتے ہیں۔ اس ناولٹ یا خاکے میں قاضی عبدالستار کی زندگی کے کئی گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ یار باشی، گھر کے تعلق سے احساس ذمہ داری، اپنے گاؤں کے لوگوں سے بے تکلفی اور ادبی حلقوں میں ان کی بردباری اور تحمل..... یہ ساری تصویریں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس حصے میں سید محمد اشرف اور طارق چھتاری کے علاوہ اس میں ابوالکلام قاسمی، آشفتہ چنگیزی اور اسد بدایونی کے تذکرے آجاتے ہیں۔ اس حصے کا سب سے مزیدار اور دلچسپ واقعہ وہ ہے جس میں قاضی صاحب ایک چائے خانے کے باہر اپنی قیمتی شیروانی بھول جاتے جس میں اچھی خاصی رقم بھی موجود تھی۔ شیروانی کی یاد آنے کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ حصہ خاص طور سے ایک بہترین افسانہ ہے جس میں عصری آگہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اس مجموعہ کا تیسرا ناولٹ ''اس شہر میں'' کے عنوان سے ہے۔ اور یہ دراصل اس کتاب کی جان ہے۔ اس میں فکشن کا رنگ اس قدر نمایاں ہے کہ یہ کہیں پر سے بھی روداد معلوم نہیں ہوتا۔ تجسس اور تحیر سے اس کی معنویت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ دراصل سنجیدہ عرف سجو نام کی ایک لڑکی کی کہانی ہے۔ ناول نگار آغاز جوانی میں فلموں میں فلمی دنیا میں بحیثیت کہانی کار اپنی قسمت آزمانے گیا تھا جہاں کئی اہم فلمی شخصیات مثلاً دلیپ کمار، سائرہ بانو، سلمیٰ صدیقی، مجروح سلطان پوری اور قادر خاں سے ہوتی ہے۔ اسے کچھ کام بھی ملتا ہے، پیسے بھی ملتے ہیں مگر شناخت نہیں ملتی۔ لہٰذا وہ ممبئی چھوڑ کر علی گڈھ واپس آجاتا ہے۔ ممبئی میں دوران قیام اس کی ملاقات سنجیدہ سے ہوتی ہے۔ پہلے وہ اسے کوئی لڑکی سمجھتا ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق تیسری صنف سے ہے۔ سجو کا کردار اس قدر جیتا جاگتا اور متحرک ہے کہ اس نے ناولٹ اعلیٰ فن پارے کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ بیانیہ بھی خوب ہے۔ اس ناولٹ کو پڑھتے وقت کرشن چندر کی یاد آجاتی ہے۔ سجو کے علاوہ سکندر کا کردار بھی خاصہ جاندار ہے۔ ناولٹ کے اختتام پر قرۃ العین حیدر کا طویل افسانہ ''قلندر'' ذہن کے پردے پر جھلملانے لگتا ہے۔ بیکل اتساہی، دلیپ کمار اور سائرہ بانو کا تذکرہ بھی اسی ناولٹ میں ہے۔

یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپی ہے اور خوب چھپی ہے۔ کتابت وطباعت معیاری ہے۔ قیمت مناسب ہے۔

◂◂ ● ▸▸

نام رسالہ: سہ ماہی فکر وتحریر، کولکاتا (پیئر ریویوڈ جرنل) جنوری تا مارچ ۲۰۲۳ء
جلد نمبر: ۱۰، شمارہ نمبر ۳۵
مدیر اعزازی: ڈاکٹر نعیم انیس
صفحات: ۱۱۲
زر تعاون، فی شمارہ: ۵۰ روپے
خصوصی تعاون: ۱۰۰۰ روپے
رابطہ:
94,RiponStreet,BlockB-2,5thFloor,Kolkata-700016(WB)
Mob:9830088153/9831772474
Email:fikrotahreersahmahi@gmail.com

مبصر: اقبال حسن آزاد

سہ ماہی ''فکر وتحریر'' کولکاتا ان معدودے چند اردو رسائل میں سے ایک ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے لگاتار شایع ہو رہے ہیں۔

اداریہ میں دیگر باتوں کے علاوہ ڈاکٹر نعیم انیس اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آج کی بھاگ دوڑ والی مصروف زندگی میں قارئین کے پاس رسالے کے نام خط لکھنے تک کا وقت نہیں بچا ہے حالانکہ سوشل میڈیا کے توسط سے رسید دے دی جاتی ہے لیکن خط اور تبصرے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔

زیر نظر شمارے میں مضامین کا کالم نہایت وقیع ہے۔ اس میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ اور یہ سب کے سب لائق مطالعہ ہیں۔

۱۔ منفرد فکر ونظر کا شاعر: شہود عالم آفاقی (ڈاکٹر ہمایون اشرف)
۲۔ افسانہ ''چوتھا فنکار'' (ڈاکٹر ریاض توحیدی)
۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا افسانہ 'سوار' دہلوی تہذیب کا بیانیہ (محمد افضل حسین)
۴۔ محسن اردو منشی نول کشور (ابوالبشر)
۵۔ میر کا ایک شعر: کچھ مباحث (سید سبط حسن نقوی)
۶۔ سر سید احمد خان اور ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (ڈاکٹر راحیلہ پروین)
۷۔ اکیسویں صدی میں اردو افسانہ (مبینہ بی)
۸۔ علی گڑھ تحریک میں سر سید کے رفقا کا کردار (محمد عرفان رضا)



اس رسالے میں ''ایک افسانہ نگار، دو افسانے'' اور'' شاعر اور کلام شاعر'' کے عنوان سے ایک مستقل کالم شامل ہوتا رہا ہے۔ اس شمارے میں توصیف بریلوی کا تعارف اور ان کے دو افسانے اور ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی کا تعارف اور ان کی آٹھ غزلیں شامل ہیں۔ یہ ایک اچھا اقدام ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کو ایک نیا پلیٹ فارم ملے گا اور ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

مذکورہ بالا مشمولات کے علاوہ نغمہ جاوید ملک کا ایک افسانہ اور ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، مجسم ہاشمی، سراج الدین نیر، رضا مرشد آبادی، نجف مرشد آبادی، ڈاکٹر تنویر گوہر، عارض مرزا، مہتاب سلیم، سید ذیشان علی میرزا اور بلال صابر کی غزلیں اور احمد کمال حشمی، محمد انس فیضی اور اطہر آفاق مرزا کی نظمیں شامل ہیں۔

علاوہ ازیں دو نئی کتابوں پر تبصرے بھی شایع کیے گئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنے رسالوں میں زیادہ سے زیادہ افسانوی ادب کو شامل کرنا چاہیے اور نہ صرف شامل کرنا چاہیے بلکہ ان کے معیار پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

رسالے کی کتابت وطباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

**اقبال حسن آزاد**
کے افسانوں کی
**کلیات**
**بہت جلد منظرِ عام پر**

# ''ثالث'' پر تبصرے

**● سلیم انصاری جبل پور**

ثالث مونگیر (جلد ۸۔۱ شمارہ ۳۲ تا ۶۲) کا ضخیم عالمی افسانہ نمبر رسلور جوبلی نمبر پیش نظر ہے۔اس تاریخ ساز ادبی کارنامے کے لئے آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کو سلام کرتا ہوں۔۴۶۶ صفحات پر مشتمل اس شمارے میں اردو افسانہ اور اس کی تقریباً تمام جہتوں پر تحریریں شامل کی گئی ہیں، جس کا سارا کریڈٹ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی محنت اور ریاضت کو ہی جاتا ہے۔اس پایہ کا نمبر نکالنا واقعی ایک بڑا پروجیکٹ ہے جسے آپ نے نہایت عرق ریزی سے دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ مجھے ثالث کے اداریہ میں یہ بات اچھی لگی کہ آپ نے افسانہ ایونٹ کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے یہ وضاحت کردی ہے کہ ''سانجھے کی ہانڈی بیچ چوراہے پر پھوٹتی ہے اور ایک فورم کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور بدمزگی جو ہوتی ہے سو الگ۔'' آپ نے ان لوگوں کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے جنہوں نے ۲۰۲۱ میں سوشل میڈیا پر منعقد افسانوی ایونٹ اور ثالث کے زیرِ نظر شمارے میں کسی نہ کسی سطح پر تعاون کیا ہے۔آپ کی اس صاف گوئی سے مصلحت پسند لکھاریوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔

''ثالث'' کے اس شمارے میں حمد و نعت کے بعد نصیر احمد ناصر کی دو نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ان کی دونوں نظمیں بڑے کینوس کی نثری نظمیں ہیں۔میرے نزدیک موجودہ عہد میں نثری نظمیں تخلیق کرنے والے چند بہت اچھے شعرا میں نصیر احمد ناصر سرِ فہرست ہے اور نثری نظموں میں حشو زوائد اور non compactness کے الزامات کے پیشِ نظر ان کی نظمیں، نثری نظموں کی تخلیق کا جواز و اعتبار فراہم کرتی ہیں۔

''ثالث'' کے اس خصوصی شمارے میں سب سے پہلے ارشد عبدالحمید کی تحریر ''کھلا ہے بابِ سخن'' کو شامل کیا گیا ہے۔ان کی یہ تحریر عالمی افسانہ ایونٹ ۲۰۰۱ کے حوالے سے ایک اہم ردعمل کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔انہوں نے اپنی تحریر میں کئی کارآمد باتیں لکھی ہیں۔مثلاً:

۱۔ یہ اصول نہیں بنایا جاسکتا کہ کہ حقیقت نگاری پر مبنی افسانہ ہر حال میں اچھا ہوگا۔

۲۔بطور فنکار کسی ایک اسلوب میں مہارت حاصل کرنا ایک الگ بات ہے اور اپنے پسندیدہ اسلوب کے علاوہ باقی اسالیب کو رد کرنا دوسری بات۔اور یہ دوسری بات مناسب نہیں۔

۳۔اگر افسانے کا مجموعی تاثر خوبصورت نہیں تو محض بیانیہ، محض کردار یا محض تکنیک کا عمدہ ہونا



کچھ خاص معنی نہیں رکھتا۔

ارشد عبدالحمید کی زیادہ تر باتوں سے شعرا اور ادبا کے عدم اتفاق کی کوئی وجہ نہیں۔روایتی اور علامتی افسانے کی بحث سے الگ، افسانے کی مجموعی کامیابی اس کے تھیم، پلاٹ، آرٹ، اسلوب اور کرافٹ یعنی کہانی کہنے کے فن پر منحصر ہے۔لہٰذا افسانے کے فن پر روایتی مباحث سے آگے ڈسکورس جاری رہنا چاہیے۔

اس کے بعد ثالث کے مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا مضمون ''فنِ افسانہ نگاری..... چند اہم باتیں'' شامل ہیں جسے نئے افسانہ نگاروں کو توجہ سے پڑھنا لازمی ہے۔اپنی تحریر میں مضمون نگار نے افسانہ نگاری کے فن پر بہت عمدہ باتیں لکھی ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر ہماری نئی نسل کے افسانہ نگار اپنے فن میں مزید نکھار اور پختگی پیدا کر سکتے ہیں۔اپنے مضمون میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے افسانہ نگار میں ضروری خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک اچھے افسانہ نگار کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے اور اس کی نظر ملکی اور غیر ملکی حالات پر گہری ہونی چاہیے۔یعنی ضروری ہے کہ ایک افسانہ نگار کو اپنی مادری زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں تخلیق کیے جانے والے افسانوں کے موضوعات، اسلوب اور تکنیک کا خاطر خواہ علم ہونا چاہئے۔یہی نہیں ایک افسانہ نگار کو موضوعات اور تکنیک کی سطح پر بھی نئے نئے تجربات کرتے رہنا چاہیے۔ نئے افسانہ نگاروں کے لیے اپنے تربیتی اور معلوماتی مضمون میں مضمون نگار نے افسانوں کی تخلیق کے حوالے سے تفصیلی know how اور dos and dont کے علاوہ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔اس کے علاوہ افسانے کی جزیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے موضوعات اور عنوان کے انتخاب، پلاٹ، اسلوب، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ پر بھی خاصا تفصیلی بیان دیا ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اپنے مضمون ''علامتی افسانہ.....تخلیقی مضمرات'' میں افسانے میں علامتوں کے استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا موقف پیش کیا ہے کہ افسانوں میں خاص خاص لفظوں کا استعمال ایسی معنوی وسعت اختیار کر لیتا ہے کہ ان میں علامتی افسانے کی شان از خود پیدا ہو جاتی ہے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس رائے کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کئی بار افسانوں میں غیر شعوری طور پر استعمال کیے گئے الفاظ نہ صرف علامتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں بلکہ اس کی ترسیل و تفہیم میں بھی نئی معنوی جہات پیدا کر دیتے ہیں۔مضمون نگار کے مطابق تخلیق کی کامیابی کا انحصار تخلیقیت (creativity) پر ہوتا ہے اور علامتی اظہار کا تعلق بھی تخلیقی زرخیزی سے جڑا ہوا ہے۔میرے نزدیک افسانوں یا پھر شاعری میں علامت نگاری ایک غیر شعوری عمل ہے جس کا تعلق تخلیق کار کی ذہنی صلاحیتوں سے ہوتا ہے۔فاضل مضمون نگار نے زور دیا ہے کہ علامتی اسلوب کے لئے علامتوں کا صحیح اور واضح تصور اور ادراک قاری اور تخلیق کار کے ذہن میں ہونا ضروری ہے۔مضمون نگار کے اس بیان سے

عدم اتفاق کی گنجائش موجود ہے۔ضروری نہیں کہ قاری کے ذہن پر علامتوں کی ترسیل وتفہیم روشن ہو، کئی بار تو تخلیق کار بھی علامتوں کا واضح ادراک نہیں رکھتا۔

اسی قبیل کا ایک اور مضمون ''علامت کیا ہے'' بھی اس خصوصی شمارے میں شامل ہے جسے سیدہ آیت گیلانی نے تحریر کیا ہے۔مصنفہ نے علامت کے مفہوم کی ترسیل کے لئے کئی غیر ملکی ناقدین کی آرا کا سہارا لیا ہے مگر سب سے واضح تعریف ڈاکٹر انیس ناگی نے کی ہے ان کے مطابق علامت سے مراد وہ بیان ہے جس کے ذریعے جو کہا جائے، اس سے کچھ زیادہ اور کچھ الگ معنی مراد لیے جائیں۔صاحبِ مضمون نے اس رائے کی روشنی میں بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ علامت ہمارے ذہن کو معانی کی کئی جہتوں کی طرف منتقل کرتی ہے۔دراصل میرے نزدیک کامیاب علامتی تخلیق وہی ہے جو ایک سے زیادہ معنوی جہتوں میں منعکس ہونے کے ساتھ قاری کے ذہن و دل کو آسودگی فراہم کرے۔یہاں یہ بات بھی عرض کرنی ضروری ہے کہ اردو میں علامت نگاری کو ادب کے مشرقی نظامِ تخلیق کی حدود میں سمجھنا ضروری ہے۔

ثمینہ سید نے اپنے مضمون ''جدید افسانہ کے خدوخال'' میں لکھا ہے کہ جدیدیت کا دور جہاں سارے ادب پر اثر انداز ہوا ہے وہاں اردو افسانہ بھی اس کے اثر سے باہر نہیں۔اس ضمن میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اردو ادب پر جدیدیت کا اثر بڑی تاخیر سے ہوا، اور اتنی تاخیر سے کہ جب دنیا کی دیگر زبانوں سے جدیدیت کے اثرات ختم ہو چکے تھے۔بلکہ یوں کہا جائے کہ جب دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب میں مابعد جدیدیت کے اثرات قائم ہو چکے تھے تب اردو میں جدیدیت کی تحریک نمایاں ہوئی۔ثمینہ سید کے مطابق اردو افسانے کی واضح تعبیر اور خدوخال کو اگر دیکھا جائے تو ترقی پسند افسانے میں ہی نظر آتا ہے۔مگر اپنے ہی مضمون میں آگے انہوں نے متضاد بیان دیا ہے کہ افسانوی ادب کو دیکھا جائے تو زیادہ تجربات جدید دور میں ہی سامنے آئے اور افسانے کو نت نئے تجربات سے ہم کنار ہونا پڑا۔

نوشی قیصر کا مضمون ''افسانے میں علامت کیا ہے؟'' قدرے واضح ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ لفظ سمبل symbol یونانی لفظ symbolon سے مستعار ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا ٹکڑا جسے جب دوسرے ٹکڑے کے ساتھ رکھا جائے تو اس کی اصل مفہوم کو زندہ کر دے یا یاد دلا دے جس کا وہ شناختی نشان ہے۔مضمون نگار نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ داستانوی افسانہ، علامتی افسانے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔نیز یہ بھی کہ علامت ہمارے لاشعور کو تمثیلی پیرایے ہی کے ذریعہ راس آتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ دراصل کسی بھی تخلیق میں علامت نگاری کا تعلق تخلیق کار کے لاشعور سے گہرا ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے مضمون میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ جدید علامتی افسانے کی تحریک کو اس وقت مزید فروغ ہوا جب پاکستان میں آمرانہ حکومتوں میں حقیقت پسندانہ انداز سے اور کھل کر بات کہنے پر قدغن



تھی۔لہٰذا پاکستانی افسانہ نگاروں نے سیاسی جبر اور گھٹن کا اپنا مافی الضمیر اشاروں اور کنایوں میں بیان کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر علامتوں کا تعلق تخلیق کاروں کے لاشعور سے ہے تو پھر کیا سیاسی جبر اور گھٹن کا اظہار شعوری نہیں ہوا؟

افسانوں میں ابہام کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ساجد ہدایت نے عمدہ بات یہ لکھی ہے کہ اگر افسانہ میں قطعی ابہام در آئے گا تو اس کی تخلیق تشکیک و اہمال کے دائرے میں داخل ہو جائے گی اور ایسے قطعی ابہام کے افسانے مصنف کی بے جا مشقِ قلم، پراگندہ ذہنی یا اس کے ذاتی کتھارسس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوں گے۔مصنف کے مطابق ایسے بے شمار قطعی ابہام کے حامل افسانے لکھے گئے ہیں جنہیں علامت نگاری یا تجریدیت کے نام پر خلق کیا گیا ہے۔مگر مضمون نگار شاید یہ بتانا بھول گئے کہ آیا کسی تخلیق میں ابہام کا تعلق تخلیق کار کی شعوری کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔

اس خصوصی نمبر میں ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی کا مضمون ''عالمی گاؤں میں معاصر اردو افسانے کی فکری اساس'' بھی شامل کیا گیا ہے جو قدرے تفصیلی اور self explanatory ہے۔مصنف نے رواں صدی کے کئی سارے افسانوں کے اقتباسات کی مدد سے افسانوں کی تکنیک، پلاٹ اور ٹریٹمنٹ پر اپنا موقف بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

رسالے کے مدیر نے ۲۰۲۱ میں فیس بک پر منعقد عالمی افسانوی ایونٹ پر موصول تاثرات کا انتخاب بھی شامل کیا ہے جس سے عصری افسانوں کی صورتِ حال اور سمت و رفتار سے آگاہی ہوتی ہے۔اس ایونٹ پر عشرت ظہیر، شعیب افضل، فرحین جمال، رویندر جوگلیکر، فارحہ ارشد، اسماء حسن، سلیم سرفراز، ڈاکٹر فریدہ بیگم، نعیم بیگ، غازی جی حسین، ڈاکٹر عائشہ فرحین، امجد جاوید، فوزیہ مغل، محمد شاہد اقبال اور سمیرا عابد وغیرہ کے تاثرات کو پڑھ کر ایک بار پھر عالمی فسانوی ایونٹ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ایونٹ کے آخر میں حسین الحق نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس نشست کے متنوع ہونے کی تائید کی جس سے نئے اور ناپختہ کار افسانہ نگاروں کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

''ثالث'' کے اس مخصوص عالمی افسانہ نمبر میں سب سے پہلے نعیم بیگ کا افسانہ ''نیا عالمی چیپٹر'' شامل کیا گیا ہے۔اس افسانے کا فکری اور معنوی کینوس عالمی اور وسیع ہے اور میرے نزدیک اسے کسی حد تک سائنس فکشن کے زمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔کہانی کا مرکزی کردار مڈل کلاس معاشرے کا ایک با اخلاق اور مہذب انسان ہے اور ایک مغربی ملک میں ''عالمی معیشت کا نیا چہرہ'' جیسے حساس موضوع پر ڈاکٹریٹ کا اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہے۔آخر کار عالمی ادارے کو جوائن کرنے کا فیصلہ لیتا ہے اور جیسے جیسے مالی منصوبوں اور ان کی شماریات کے درو بست میں داخل ہوتا جاتا ہے اس پر گریٹ گیم، انڈر ورلڈ کارپوریٹ اور گلوبل امور ٹائزیشن جیسی خفیہ اصطلاحات کے معنی روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔بعد میں اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک خطرناک انسانیت دشمن عالمی خفیہ ادارے کے جال میں بری طرح پھنس چکا ہے۔ایک ایسا ادارہ جو دنیا میں وائرس پھیلانے کی سازش میں بھی

ملوث ہے۔ چونکہ افسانے کا مرکزی کردار اندر سے انسانیت دشمن نہیں اس لئے وہ اس عالمی ادارے سے چنگل چھڑانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ انسان ہوتے بھی سرمایے کا غلام بن چکا ہے۔ مگر خفیہ ادارے کو چھوڑنے کی سزا کا علم ہونے کے باوجود اسے اتنا اطمینان ضرور ہے کہ پہلا غدار چینی نکلا۔ اس افسانے کے موضوعات میں خطرناک سازش اور خطرات کے باوجود ایسے جملے بھی مل جاتے ہیں ''بچوں کو مارنے سے محلے کے پرندے اڑ جاتے ہیں اور جس محلے میں پرندے نہ ہوں وہاں رزق میں کمی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

''بارِ زیست''، محمد جاوید انور کا ایک عام فہم، سادہ اور بیانیہ افسانہ ہے جس میں ایک مڈل کلاس فیملی کو زندگی کے مسائل و مصائب سے نبرد آزما دکھایا گیا ہے۔ جس میں دین محمد کی ایک چھوٹے سے قصبے میں معمولی سی کریانہ کی دوکان ہے، اور اسی کریانہ دوکان سے اس کے گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ عبداللہ دین محمد کا اکلوتا بیٹا ہے اور باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس دوران قصبہ ترقی کر کے شہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کی دوکان کی شکل وصورت بھی ماڈرن ہو جاتی ہے مگر اب اس کی دوکان زیادہ نہیں چلتی۔ اس کی ماں کی خواہش ہے کہ عبداللہ کے بہت سارے بیٹے ہوں تا کہ گھر میں اکلوتی اولاد کی رسم ختم ہو مگر خدا کو یہ منظور نہیں۔ لہٰذا کسی صورت نو مولود بچے کا انتظام کر کے عبداللہ کی بیوی کی گود میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ نو مولود بچہ بھی کسی physical disorder کا شکار ہوتا ہے۔ اس دوران عبداللہ کی بیوی شگر اور بلڈ پریشر کا شکار ہو کر آخر کار دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اب عبداللہ اور شاہد دنیا میں اکیلے رہ جاتے ہیں اور زندگی کے مسائل و مصائب سے جوجھتے ہوئے آخر کار ایک دن اپنی ماں کی قبر سے لپٹ کر ایک طویل خامشی اور سناٹے میں زور سے چیختا ہے۔ اس طرح دیکھیں تو محمد جاوید انور کا یہ افسانہ دراصل انسانی معاشرے میں زندگی سے جدوجہد کا اعلامیہ ہے جسے بیانیہ اسلوب میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے جس کی تفہیم براہِ راست قاری تک ہو جاتی ہے۔

''تازہ ہوا کے شور میں''، حسن امام کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انسانی رشتوں کے کھٹے میٹھے تجربات کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار رضیہ ایک خوبصورت لڑکی ہے جسے امید ہے کہ اس کے لئے کسی اچھے لڑکے کا رشتہ ضرور آئے گا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ آخر کار تھک ہار کر رضیہ کا باپ اس کا رشتہ ایک بد صورت لڑکے سے کر دیتا ہے۔ اور پھر پہلی رات کے بعد رضیہ اپنے گھر آ جاتی ہے اور پھر شوہر کے پاس نہیں جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا باپ شراب پی کر اسے پیٹتا ہے۔ اس کی ماں بھی اسے طعنہ دیتی ہے۔ رضیہ ایک بار پھر اپنے شوہر کے پاس جاتی ہے اور دوبارہ بھاگ کر اپنے مائیکے واپس آ جاتی ہے۔ اس کا باپ شراب پی ایک دن جب اسے پیٹنے کی نیت سے گھر آتا تو وہ بھاگ کر پڑوس میں اپنی دوست نجمہ کے گھر چلی جاتی۔ نجمہ کے بھائی کے انتقال کے دوسرے دن رضیہ کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اس کے بعد رضیہ کا باپ زہر کھا لیتا ہے اور گاؤں میں یہ سرگوشی چھوڑ جاتا ہے کہ رضیہ کا باپ شرابی تھا بے غیرت نہ تھا۔ دوسرے دن جب رضیہ کے باپ کا دوست اس کے



گھر مزاج پرسی کے لئے آتا ہے تو وہ شام کے جھٹپٹے میں اس کا شوہر سلامت نکلتا ہے۔ اس طرح دیکھیں تو اس افسانے کا کلائمکس چونکاتا ہے اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ''کووڈ کے ماتم دار'' میں ذکیہ مشہدی نے کرونا کرفیو کے دوران عام لوگوں کو ہونے والی تکالیف کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار پھولن ایک پریس میں کام کرتا ہے اور جب کرونا کرفیو کے دوران اس کی نوکری چھوٹ جاتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کی بیوی کے زیور فروخت ہو جاتے ہیں اور آخر میں وہ بکری بھی بک جاتی ہے جو اس کے سسرال سے مفت میں ملی تھی اور جو بہلا تھی۔ بکری سے اس کے گھر والوں یعنی کاجل اور سونا کے جذباتی رشتوں کی شدت کو افسانہ نگار نے بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ذکیہ مشہدی کا یہ افسانہ زندگی اور زمینی حقائق کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

ہما فلک کا افسانہ ''ادھورے'' دراصل ایک علامتی افسانہ ہے۔ میدان میں لوگوں کا ازدہام دراصل روزِ جزا کا منظر پیش کر رہا ہے۔ سفید و سیاہ اعمال ناموں والے گروہ علاحدہ کر دیے جاتے ہیں جبکہ وہاں ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کے ہاتھوں میں سنہرے اعمال نامے ہیں اور یہ گروہ ادھورے لوگوں پر مشتمل ہے یعنی یہ لوگ جسمانی طور پر اپاہج ہیں اور اپنی سزا دنیا میں ہی کاٹ چکے ہیں لہٰذا انہیں سفید اعمال ناموں والے لوگوں کے ساتھ کر دیا جاتا ہے جو خوشی اور آسودگی کے حقدار ہیں۔ ہما فلک کی کا یہ افسانہ مختصر اور compact ہے اور ڈکشن اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بھی منفرد ٹھہرتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کا افسانہ ''رکشہ والا'' اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے منفرد ہے۔ افسانہ نگار نے ہمیں اس حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب کوئی شہر ترقی کرتا ہے تو اپنے ہاتھوں سے کام کرنے والے کس طرح بیکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شرفو جو پیڈل رکشہ چلا کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتا ہے، ای رکشہ اور اسکولوں کے لئے وین اور آٹو وغیرہ آجانے کے بعد کتنی مالی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ شرفو معاشرے کے ایک ایسے شخص کو represent کرتا ہے جو اپنے ہاتھوں سے کام کرتا ہے، ایسا نہیں کہ وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے میں اسے کوئی پریشانی ہے، دراصل شرفو ای رکشہ سیکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے مگر سیکھنے کے دوران اچانک ایکسیڈنٹ کر بیٹھتا ہے اور پھر ڈھاک کے وہی تین پات، یعنی اس کا وہی پیڈل والا رکشہ اس کی زندگی کی گاڑی کھینچتا ہے۔ جب کہ اس کا چھوٹا بھائی راجو اپنا پرانا رکشہ بیچ کر ای رکشہ چلانا سیکھ لیتا ہے اور بینک لون کی مدد سے ای رکشہ خرید کر اپنی روزی روٹی کے لئے بہتر مواقع پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح دیکھیں تو اس افسانے میں نئے اور پرانے کی یعنی روایتی اور جدید طرزِ زندگی کشمکش برقرار رہتی ہے۔ افسانے کی زبان صاف ستھری اور متاثر کن ہے اور اس میں کئی ایسے جملے یا مکالمے بھی شامل کیے گئے ہیں جو بے حد معنی خیز اور افسانہ نگار کے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''یادیں خواہ صاحبِ زر کی ہوں یا کسی غریب کی، وہ اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔'' یا پھر صرف انسان ہی نہیں مرتے، تہذیبیں اور زبانیں بھی مرتی ہیں اور پیشے اور روزگار بھی۔''

''سرنگ کے راستے'' سبین علی کا ایک ایسا افسانہ ہے جو عورت کے اردگرد گھومتا ہے۔ سبین علی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کی زندگی کا سفر ایک ایسی سرنگ سے ہو کر گزرتا ہے جہاں اس کی اپنی پہچان دھند میں گم ہو جاتی ہے۔ کبھی محبت کے نام پر، کبھی رنگ اور نسل کے نام پر مگر سرنگ کے دوسرے سرے پر روشنی اور نئی صبح اس کی منتظر ہے۔

شاکر انور کا افسانہ ''ایک دوپہر'' ایک عام سے پلاٹ کو بیانیہ اسلوب میں بیان کرتا ہے اور اس کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں موجود واقعات کے اعتبار سے یہ افسانہ غیر ضروری طوالت کا شکار ہو گیا ہے جو ذہن پر گراں گزرتا ہے۔ مگر اس افسانے میں لکھا گیا یہ مکالمہ توجہ طلب اور معنی خیز ہے کہ ''آدمی کبھی اکیلا نہیں مرتا زین! وہ اپنے ساتھ اپنے سارے خواب اور دوسروں کو لے کر مرتا ہے یا مار دیتا ہے۔''

احسان قاسمی کا افسانہ ''تم'' مرکزی کردار کے لئے اپنے کیریر کی جدوجہد سے لے کر urban naxal تک کا سفر معلوم ہوتا ہے۔ افسانے کی نسوانی کردار یعنی ''تم'' ایک ابھرتی ہوئی فٹ بال کھلاڑی ہے ''میں'' بھی ایک شہر کا مانا ہوا فٹ بال کھلاڑی تھا جو ایک بس ایکسیڈنٹ کے بعد فٹ بال کھیلنے کے قابل نہ رہا۔ ''میں'' کا والد مہوا اور چاول کی شراب کشید کرتا تھا، اور ماں ایک مقامی ہسپتال میں صفائی کرم چاری۔ والدین کے فوت ہونے کے بعد ''میں'' نے بھی اپنے ہاتھ میں وائپر سنبھال لیا۔ ''میں'' نے ''تم'' سے شادی کر لی مگر نسوانی کردار کے پھیپھڑے کافی خراب ہو گئے اور وقت نے افسانے کے مرکزی کردار کو ''اربن نکسل'' مان کر عقوبت خانے میں ڈال دیا ہے۔ افسانے کا ڈکشن اور ٹریٹمنٹ معمولی اور سادہ ہے اس کے علاوہ افسانے کا کلائمکس بھی متاثر کن نہیں ہے اور افسانے کو کسی نئے جہت میں منعکس نہیں کرتا۔ عشرت ظہیر کا افسانہ ''در پردہ'' دراصل ایک ایسی لڑکی فائزہ کی کہانی ہے جو ذہنی مریض ہے اور رفتہ رفتہ ڈپریشن کی طرف جا رہی ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اسے سارے لوگ مردہ نظر آتے ہیں دراصل یہ لڑکی اپنے والد کو تلاش کرتے ہوئے نامعلوم طور پر ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچتی ہے جو در پردہ طور پر فائزہ کا باپ ہی ہے۔ افسانہ اپنی لینتھ کے اعتبار سے مناسب اور متاثر کن ہے۔ ''مقدس سکہ'' محمد شاہد محمود کا ایک مختصر افسانہ ہے جو اپنے اندرون میں بڑے کینوس پر پھیلی ہوئی ایک ایسی کہانی کو بیان کرتا ہے جو بظاہر داستانوی اور اساطیری فضا میں شروع ہو کر درمیان میں سائنس فکشن اور تجسس سے گزرتے ہوئے تجزیاتی کلائمکس پر اختتام پزیر ہوتا ہے اور یہ سوال بھی قائم کرتا ہے کہ جس سکے کو ڈھالنے میں دس ہزار انسانوں کی لاشیں نذر کی گئی ہوں وہ سکہ مقدس کیسے ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ جملہ نئی صدی کے تجزیاتی ذہن اور سائنسی اور عقلی سوچ کا مظہر ہے۔

فرحین جمال کی کہانی ''میری دلاری'' ٹھیٹھ گھریلو قسم کی کہانی ہے، جس میں اماں نے اپنی بیٹی کو کام کاج اور رہن سہن کے تمام گر سکھائے، جسے سیکھتے سیکھتے بیٹی اکتا بھی گئی اور اماں پر اکثر جھنجھلاتی بھی دکھائی گئی ہے۔ اماں نے تو یہاں



تک سکھا دیا کہ روز نہایا کرو، بدبودار بدن مرد کو نہیں بھاتا۔ اس کے علاوہ بھی اماں نے ہر ہر چیز سکھا دی مگر شادی ہونے کے بعد کچھ بھی کام نہ آسکی کیونکہ وہ اپنے اذیت پسند اور نفسیاتی مریض شوہر کو اماں کی تعلیمات سے رام نہ کر سکی۔ اور سوچتی ہی رہ گئی کہ اماں نے نشست و برخاست اور گھر گرہستی کے تمام گر سکھائے لیکن زندگی جینے کا ہنر سکھانا بھول گئیں۔ اسرار گاندھی کا افسانہ ''مفاہمت کا عذاب'' نئے زمانے کا ایک رومانی افسانہ ہے جس میں جنسی تلذذ بھی شامل ہے۔ مگر افسانے کی ہیروئن اس پر یگینیسی سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتی ہے اور آخر اپنا ابارشن بھی کرا لیتی ہے، افسانے کے مرد کردار کی اس پیشکش کے باوجود کہ اس کی کمائی سے گھر چل جائے گا۔ مگر افسانے کی ہیروئن ایک الٹرا ماڈرن سوسائٹی میں جینے والی لڑکی تھی۔ اس افسانے میں اسرار گاندھی نے نئے اور روایتی اقدار کے مابین جاری کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ صادقہ نواب سحر کا افسانہ ''تحفوں کی تھیلی'' زندگی کی زمینی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ پرائیویٹ ہسپتالوں میں ٹیسٹ اور ٹریٹمنٹ کے نام پر ہونے والی کرپشن کو افسانہ نگار نے عمدگی اور ہنرمندی سے ڈیل کیا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے ان کا یہ افسانہ بیانیہ کے ذیل میں آتا ہے اور براہِ راست قارئین کے ذہن و دل پر دستک دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔

کنول بہزاد کا افسانہ ''راجدھانی'' دراصل زمین داروں کے طرزِ زندگی کو بیان کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار چودھری امداد علی، اپنے والد کی موت کے بعد حویلی کا مالک بن جاتا ہے، اس کی بیوی پروین اس کے والد چودھری کرم داد کی بھانجی ہے، جس سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ ایک دن جب چودھری امداد علی شکار سے لوٹا تو اس کے ہمراہ ایک لڑکی تاجور بھی تھی جسے اس نے اس نے اپنی بیوی بتایا، اور حویلی کے ملازمین کو ہدایت دی کہ اس کی بیوی کے عیش و آرام کا پورا خیال رکھا جائے۔ چودھری کو امید تھی کہ تاجور اسے حویلی کا وارث دے گی مگر ایسا نہیں ہوا، اس کی دوسری بیوی بھی بانجھ نکلی۔ چودھری نے فیروزہ نامی لڑکی کو اپنی تیسری بیوی بنا کر حویلی میں لے آیا جس سے سب سے زیادہ تکلیف تاجور کو ہوئی مگر ظاہری طور پر اس نے فیروزہ کے عیش و عشرت اور آرام کا پورا خیال رکھا مگر ایک دن پتہ چلا کہ فیروزہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ دراصل تاجور نے چودھری کو نشہ آور دوائیں دے کر فیروزہ سے لاتعلق کر دیا تھا اور اس کے طلاق نامے پر چودھری کے دستخط بھی لے لیے تھے۔ ہوا یوں کے تاجور نے فیروزہ کو دلاور کے ساتھ بھگا دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ دلاور فیروزہ سے نکاح کر لے۔

فارحہ ارشد کا افسانہ ایک معنی خیز علامتی افسانہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے مجسمہ، مجسمہ ساز، سانپ، کبوتر اور مٹی وغیرہ فظوں سے فکر انگیز علامتیں تراشنے میں کامیاب ہے اور آخر میں یہ کہنے میں حق بجانب بھی ہیں کہ ''تمہاری آنکھ تو دریا ہے، دریا کا دروازہ بند کر دو ورنہ شہر سیلاب میں بہ جائے گا۔ م ص ایمن کا افسانہ ''تعویذ'' قدرے طویل مگر دلچسپ افسانہ ہے جس میں پیر صاحب اور سائل کے مابین علم الاعداد اور ساعات وغیرہ کے موضوع پر خاصی گفتگو دکھائی گئی ہے۔ ریاض کے ساتھ پیر صاحب کے پاس گئے سائل کا علم دیکھ کر پیر صاحب سائل کو ہی تعویذ لکھنے یعنی پیر بننے کا مشورہ دیتے ہیں۔ معاشرے میں موجود کمزور مذہبی عقیدہ لوگوں کی نفسیاتی

کمزوریوں کا فائدہ اٹھانے والے پیر صاحب کے حوالے سے یہ کہانی بڑی عمدگی سے آگے بڑھائی گئی ہے۔ ''نیلو، ایفروودتی اور ایک خواب'' میں معظم شاہ کا ایک مختصر افسانہ ہے جس میں نیلو سے جنسی تلذذ حاصل کرنے کے بعد کہانی کا مرکزی کردار عورت کے بدن سراب سے گزر کر آخر کار اپنے بچے کھچے ایمان کے سہارے روحانی شخصیت بن جاتا ہے اور لوگوں کے روحانی علاج میں مصروف ہو جاتا ہے۔ افسانے کا کلائمکس غیر متوقع اور چونکانے والا ہے۔

مکرم نیاز نے اپنے افسانے ''سوکھی باؤلی'' میں انسانی بستیوں میں پانی کی قلت اور سرکاری نلوں سے حصول آب کے لئے بستی والوں کی جدوجہد کے مسئلے پر اچھا افسانہ لکھا ہے۔ افسانہ نگار نے افسانے کی جزیات نگاری بڑی ہنرمندی سے کی ہے اور اس میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ ہمیں آئے دن اپنے آس پاس رہنے والے لوگوں کے درمیان نظر آتی ہیں یہ ایک ایسا بیانیہ افسانہ ہے جس کا پلاٹ بہت بڑا نہ سہی یہ خوبی تو ہے کہ اس کی ترسیل و تفہیم کے لئے قاری کو ذہن پر زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ جب کہ سیدہ آیت گیلانی کا افسانہ ''داستاں ایک شجر کی'' ایک مکمل علامتی افسانہ ہے جو بے حد مختصر ہے مگر اس کا پلاٹ بڑا ہے۔ اس افسانے میں شجر بذاتِ خود ایک علامت ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے کئی معنی خیز اور گہری معنویت سے بھرپور جملے تراشے ہیں۔ مثلاً ''اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ'' کلمۂ وقت قرار پایا تو انہوں نے اشارے ایجاد کر لیے، صدیوں کے بعد ضرورت کے باعث خدا یاد آیا تو بولنا ناگزیر ہوا۔ تو زبان کی تلاش جاری ہوئی۔'' بظاہر یہ ایک گنجلک اور پیچیدہ جملہ ہے مگر یہ ایک ایسے صارفی سماج کی کہانی ہے جو خود غرض بھی ہے اور مطلب براری کے لئے اپنے اپنے خدا تراشنے کے ہنر سے بھی واقف ہے۔ دراصل یہ کہانی ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف احتجاج کی کہانی ہے۔ مگر وقت کی سفاکیوں کے سامنے محبت اور مروت کی کونپلیں مرجھا جاتی ہیں۔ جب شجر کی جڑوں کی کاٹ کاٹ کر کئی منقسم روپ دے کر نئے بیج لگائے گئے جن کی پھوٹ سے نکلی شاخوں نے دماغوں کو امربیل کی طرح چاٹ لیا تو پھر شجر اپنے دفاع کے لئے اپنے ابراہیم کی تلاش میں نکل پڑا۔ پورا افسانہ اسی طرح کے معنی خیز فکری انداز سے آگے بڑھتا ہے۔ گل ارباب کا افسانہ ''باغی'' ایک ایسے نوجوان جوڑے غازی خان اور پشمینہ آفریدی کی کہانی ہے جو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور نکاح بھی کرنا چاہتے ہیں مگر پارک میں سفاک ایس ایچ او نور محمد کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اس افسانے میں جہاں ایک طرف سسٹم کی سفاکی کا ذکر ہے وہیں اسی سسٹم میں موجود اچھے لوگوں کی موجودگی کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ ثمینہ سید کا افسانہ ''بندھن کا بوجھ'' ایک سیدھا سادہ بلکہ گھریلو قسم کا افسانہ ہے جس میں میاں بیوی کے درمیان ہونے والی نوک جھونک بھی ہے اور کھٹے میٹھے رشتوں کی مہک بھی۔ یہ ایک نیم علامتی قسم کا افسانہ ہے اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا خوبصورتی سے اختتام پزیر ہوتا ہے۔ اسی طرح کا ایک مختصر افسانہ اقبال مٹ کا ''درد جب حد سے گزرتا ہے'' ہے۔ جس میں مانوس علامتوں کے مدد سے افسانہ نگار نے اپنے مافی الضمیر کو پیش کیا ہے۔

نشاط پروین کا افسانہ ''بڑے گھر کی بہو'' ایک متاثر کن افسانہ ہے، اس میں ایک مڈل کلاس فیملی میں ہونے وائے واقعات و واردات کا بیان کیا گیا ہے۔ اس گھر کا بڑا لڑکا حالانکہ شہر میں ایک پرائویٹ کمپنی



میں اچھی سی جاب کرتا ہے مگر اپنا دل گھر میں کام کرنے والی نوکرانی کو دے بیٹھتا ہے۔ اور والدین کے منع کرنے کے باوجود گھر کی نوکرانی جوہی سے چپکے سے نکاح کر لیتا ہے۔ جوہی جسکا والد مسلمان اور ماں بنگالن ہندو ہے۔ آخر کار ایک دن وہ جوہی کو لے کر گاؤں آتا ہے مگر اس کے والدین جوہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس دوران رضی اور جوہی کو ایک بیٹی بھی پیدا ہو جاتی ہے، جسے رضی کے گھر والے تو قبول کرتے ہیں اور خوب پیار بھی کرتے ہیں مگر جوہی کو گھر والے اب بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ پھر ایک دن جب رضی کی ماں رقیہ بیگم پھسل کر گر پڑتی ہیں اور ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور انہیں داخلِ ہسپتال کرنا پڑتا ہے، تو یہی بہو جسے اب تک گھر والوں نے قبول نہیں کیا تھا اپنی ساس یعنی رقیہ بیگم کی تیمارداری اور خدمت کرتی ہے۔ نشاط پروین کا یہ افسانہ متاثر کرتا ہے اپنے کہانی پن، پلاٹ اور سیدھے سادے اسلوب کے سبب۔

''ثالث'' کے اس سلور جبلی نمبر میں کئی اور اچھی کہانیاں شامل ہیں جن پر طوالت کے سبب فرداً فرداً تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی نگۂ انتخاب نے اس نمبر کو یادگار اور دستاویزی بنا دیا ہے۔ جو یقینی طور پر ریسرچ اسکالرز کے لئے رہنما ثابت ہوگا اور برسوں تک حوالوں میں روشن رہے گا۔ زویا حسن کا افسانہ ''گمشدہ آوازوں کا تعاقب''، روندر جوگلیکر کا ''لاش نامہ''، طارق شبنم کا ''سونے کا پیالہ''، امین کنجاہی کا ''یوٹوپیا''، محمد ارشد کسانہ کا ''زقوم کی جانب'' اور نعیم یاد کا افسانہ ''فریب'' اس شمارے کے اہم افسانے ہیں اور تبصروں کے متقاضی بھی۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر ابرار رحمانی کی خود نوشت کا ایک حصہ ''بہار کی بہار'' کو بھی شامل کیا گیا ہے جس کی مدد سے ان کی زندگی کے ابتدائی تعلیم اور اہم ادبی و شخصی واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہے خصوصاً پٹنہ اور مظفر پور کے حوالے سے انہوں نے کئی اہم واقعات کو درج کیا ہے۔ انہوں نے اپنی اس سوانحی تحریر میں اپنے ادبی اور تخلیقی سفر نیز اپنی کتابوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہے۔

''معاصر اردو فکشن: مسائل و امکانات'' کے عنوان سے پروفیسر صفدر امام قادری کا ایک ایک مضمون شامل ہے جس میں انہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد کے ادب پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انہوں نے یہ concern بھی ظاہر کیا ہے کہ ''معاصر افسانہ نگاروں کے سلسلے سے مستند نقادوں کی جو بے اعتنائی ہے اس کا شاید یہ بھی سبب ہے کہ اکثر نقادوں کی پرورش اردو کے شعری ماحول میں ہوئی اور وہ شعری ڈھانچے میں سوچنے کے عادی رہ گئے۔'' ان کی یہ بات صد فی صد سچ معلوم ہوتی ہے کہ آج کے فکشن کے احتساب کے راستے میں یہ بھی رکاوٹ ہے کہ بیشتر تخلیق کار آزادانہ طور پر اپنے احتساب کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔

''اکیسویں صدی میں اردو افسانہ..... بہار کے پس منظر میں'' ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا ایک اہم مضمون ہے جس میں انہوں نے ۱۹۸۰ کے آس پاس فکشن کا سفر شروع کرنے والے افسانہ نگاروں پر عمدہ گفتگو ہے۔ یہی

نہیں انہوں نے اپنی گفتگو کا فوکس اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں پر بھی رکھا ہے۔انہوں نے اویناش امن کے علاوہ کئی ایسے فکشن نگاروں پر بھی گفتگو کی ہے جنہیں واقعی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔فیاض احمد وجیہ کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نئی صدی میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے ان کے موضوعات میں فکروفلسفہ کے ساتھ گہری نفسیات ملتی ہے۔مجموعی طور پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بہار کے نئے اور پرانے افسانہ نگاروں پر ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے جو یقینی طور پر مستحقِ پزیرائی ہے۔اسی طرح کا ایک اور مضمون ''اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد'' بھی اس شمارے میں شامل ہے جسے ڈاکٹر ارشد رضا نے تحریر کیا ہے۔ڈاکٹر جگ موہن سنگھ کا ایک مضمون ''پاکستان کے ماہرِ فن قلم کار: محمد نعیم یاد'' بھی شامل کیا گیا ہے جس میں مصنف نے کئی اقتباسات اور غزلوں کے اشعار کے نمونوں کی مدد سے نعیم یاد کی فنی صلاحیتوں کا محاسبہ کیا ہے ان کے مطابق ان کی غزلیں جدید اور مابعد جدید شاعری کی حدود کو ضرور چھوتی ہیں لیکن اپنی غزلوں میں وہ بڑی خوبی سے تغزل کو بھی برتتے ہیں۔

اس خصوصی نمبر میں ڈاکٹر شاہد جمیل کا افسانہ ''منتظر آنکھیں'' شامل ہے۔ڈاکٹر شاہد جمیل کے زیادہ تر افسانے بیانیہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور قدرے طویل بھی۔ان کے افسانوں کے موضوعات زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں اور فنی اعتبار سے بھی چست درست ہوتے ہیں۔پروفیسر اسلم جمشید پوری کا فسانہ ''ایک تھا بادشاہ'' ملک کے موجودہ سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ایک بہترین افسانہ ہے۔ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ بہت کم لفظوں میں ہی ایک بڑے موضوع کو سمیٹ کر قاری کر ذہن و دل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔اس سلور جبلی نمبر میں ڈاکٹر نسیم نگہت کا ''بے چہرگی''، امین سدرالدین بھایانی کا ''ماموں میاں کا گھرانہ''، اسحاق وردگ کا ''نور گل کے حصے کی قیامت'' اور شاہد اختر کا ''بازگشت'' جیسے افسانے شامل ہیں جو قاری سے سنجیدہ مطالعے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

''ثالث'' پر تبصروں کے کالم میں سب سے تفصیلی تبصرہ ڈاکٹر شاہد جمیل کا ہے جس میں انہوں نے ثالث کے گزشتہ شمارے کے ہر ہر پہلو پر گفتگو کی ہے جس کی ایک وجہ شوکت حیات سے ان کی قربت بھی ہے۔اس کے علاوہ عشرت ظہیر، ڈاکٹر احسان عالم، رفیع حیدر انجم، فخرالدین عارفی، کامران غنی صبا وغیرہ کے تبصرے بھی شامل ہیں جن کے مطالعے سے ثالث کے گزشتہ شمارے کے مشمولات کی فکری نہج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس ضخیم نمبر میں کتابوں پر تبصروں کا کالم بھی بدستور قائم ہے۔آٹھ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جن میں سے چار کتابوں پر تبصرے خود مدیر نے کیے ہیں جب کہ بقیہ کتابوں پر پروفیسر منظر اعجاز، ڈاکٹر توصیف بریلوی، ڈاکٹر منصور خوشتر اور بینام گیلانی کے تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔مجموعی طور پر ثالث کا یہ ضخیم شمارہ ایک دستاویزی شمارہ ہے اور فکشن سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔اس نمبر کے لئے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کے حوصلوں اور استقامت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

◂◂ ● ▸▸



**● ڈاکٹر احسان عالم، دربھنگہ**

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان رسالہ ''ثالث'' جلد نمبر ۸۔۱۰، شمارہ ۲۳۔۲۶ عالمی افسانہ نمبر اور سلور جوبلی نمبر ہے۔یہ رسالہ اقبال حسن آزاد کی ادارت میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔اس رسالہ کے کئی نمبر اور گوشے منظر عام پر آچکے ہیں جس کی وجہ سے یہ رسالہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔موجودہ رسالہ بھی کافی اہم ہے۔

اپنے اداریہ میں اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں کہ الحمدللہ! ''ثالث'' کا عالمی افسانہ نمبر اور سلور جوبلی نمبر منصۂ شہود پر آ گیا۔یہ ایک بڑا پروجیکٹ تھا اس لیے اس کے مکمل ہونے میں اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا لیکن دیر آید درست آید۔اس نمبر کی داغ بیل اسی وقت پڑ گئی تھی جب میں نے فیس بک پر ''ثالث افسانوی نشست ۲۰۲۱ کا انعقاد کیا تھا۔

مرغوب اثر فاطمی کی حمدیہ شاعری سے رسالہ کا آغاز ہوا ہے۔رؤف خیر نے اپنی نعت پاک سے رسالہ کو مزین کیا ہے۔نصیر احمد ناصر کی نظم کے بعد ضیاء فاروقی، خالد جمال، ڈاکٹر ذکی طارق، شاہد اختر، فردوس گیاوی کی غزلوں نے شعری کائنات میں اضافہ کیا ہے۔

ثالث عالمی افسانوی نشست کے مضامین کے تحت ''کھلا ہے باب سخن'' (ارشد عبدالمجید)، ''فن افسانہ نگاری۔چند اہم باتیں'' (اقبال حسن آزاد)، ''بیانیہ میں راوی کی مداخلت'' (خالد سعید/مکرم نیاز)، ''علامتی افسانہ.....تخلیقی مضمرات'' (ڈاکٹر ریاض توحیدی)، ''علامت کیا ہے؟'' (سیدہ آیت گیلانی)، ''جدید افسانہ کے خد وخال'' (ثمینہ سید)، ''افسانے میں علامت کیا ہے؟'' (نوشی قیصر)، ''عالمی گاؤں میں معاصر اردو افسانے کی فکری اساس'' (عظیم اللہ ہاشمی)، ''افسانہ میں مسئلہ ابہام'' (ساجد ہدایت) شامل مضامین کافی عمدہ اور توجہ طلب ہیں۔

ثالث عالمی افسانوی نشست کے بہت سے افسانے بھی ''ثالث'' کے اس شمارہ میں شامل ہیں۔وہ افسانے ''نیا عالمی چیپٹر'' (نعیم بیگ)، ''بارزیست'' (محمد جاوید انور)، ''تازہ ہوا کے شور میں'' (حسن امام)، ''کووڈ کے ماتم دار'' (ذکیہ مشہدی)، ''ادھورے'' (ہما فلک)، ''کھیپ'' (شاہین کاظمی)، ''رکشہ والا'' (اقبال حسن آزاد)، ''افسانہ ہائے خواب'' (سید کامی شاہ)، ''سرنگ کے راستے'' (سبین علی)، ''اندھیرے میں'' (دلشاد نسیم)، ''ایک دوپہر'' (شاکر انور)، ''تم'' (احسان قاسمی)، ''در پردہ'' (عشرت ظہیر)، ''عکس بر عکس'' (شفقت محمود)، ''مقدس سکہ'' (محمد شاہد محمود)، ''میری دلاری'' (فرحین جمال)، ''مفاہمت کا عذاب'' (اسرار گاندھی)، ''تحفوں کی تھیلی'' (ڈاکٹر صادقہ نواب سحر)، ''راجدھانی'' (کنول بہزاد)، ''سرنگ کی دوسری طرف'' (کوثر جمال)، ''دنا نیر بلوچ'' (فارحہ ارشد)، ''تعویذ'' (م۔ص۔ایمن)، ''ریختہ'' (ریحان کوثر)، ''نیلو، ایفر ووتی اور ایک خواب'' (معظم شاہ)، ''سوکھی باؤلی'' (مکرم نیاز)، ''مجھے گھر نہیں جانا'' (سارا احمد)، ''مٹی کی چڑیاں'' (شہر یار قاضی)، ''خسارہ'' (سلیم سرفراز)، ''دو پیاسے'' (رفیع حیدر انجم)، ''ڈیٹنشن کیمپ'' (مقصود حسن)، ''داستاں ایک شجر کی'' (سیدہ آیت گیلانی)، ''باغی'' (گل ارباب)، ''بندھن کا بوجھ'' (ثمینہ سید)، ''درد جب حد سے گذرتا

ہے''(اقبال مٹ)،''بڑے گھر کی بہو''(نشاط پروین)،''گمشدہ آوازوں کا تعاقب''(زویا حسن)،''لاش نامہ''(روندر جوگلیکر)،''سونے کا پیالہ''(طارق شبنم)،''بلورین''(راجہ یوسف)،''یوٹوپیا''(امین کنجاہی)،''زقوم کی جانب''(محمد ارشد کسانہ)،''ٹائم ٹیبل''(آسیہ رئیس خان)،''فریب''(نعیم یاد)ہیں۔

سلور جوبلی نمبر کے تحت کئی مضامین بھی ''ثالث'' کے اس شمارہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ''بہار کی بہار'' کے عنوان سے ہے۔ جسے ڈاکٹر ابرار رحمانی نے قلمبند کیا ہے۔ اس مضمون میں مظفر پور اور پٹنہ کی یادیں سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر ابرار رحمانی لکھتے ہیں کہ میری زندگی کسی بلا سے کم نہیں، بلکہ اگر ہم کہیں کہ میری آوارگی روزنت نئی بلا کو تخلیق کرتی رہتی ہے اور اس طرح ہم بلاؤں کے ہجوم میں جیتے رہے۔ اب ہم روز مرتے ہیں اور مرنے کی آرزو میں روز جیتے ہیں۔ کاش کوئی روز روز کے اس مرنے جینے کی کشمکش سے آزاد کرا سکتا۔ میں روز اپنی آزادی کے لئے دست بہ دعا رہتا ہوں، کاش میں اپنے اس خیال سے خود کو آزاد کرا سکتا، افسوس انسان اپنی دو روزہ زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے۔

پروفیسر صفدر امام قادری نے ''معاصر اردو فکشن: مسائل و امکانات'' کے عنوان سے ایک عمدہ مضامین تحریر کیا ہے۔ اپنے مضمون میں موصوف لکھتے ہیں کہ 'معاصر' اور 'ہم عصر ادب' کی اصطلاح بھی اگرچہ 'جدید' کی طرح پرانی نہیں مگر اسے بھی ہمارے یہاں آزمانے کا چلن کم وبیش اب نصف صدی کا قصہ ہے۔ اردو میں جدیدیت کا زور ذرا کم ہونے لگا، ٹھیک اسی وقت جدیدیت سے مختلف ادبی منظر نامے کی تلاش میں ادبی مورخین، نظریہ ساز اور نقاد سرگرم ہوئے۔ پہلا سوال تو یہی تھا کہ جدیدیت کا اختتام یا اس کے اختتامی آثار کب سے تسلیم کیے جائیں؟ اردو افسانے کے مورخین کے ہاں بالعموم یہ رائج ہے کہ سریندر پرکاش، بلراج مین را کی نسل جس نے تجریدی افسانوں پر خاص توجہ دی تھی، ان کے فوراً بعد ایک ایسی نسل آئی جو کھلی تجریدیت سے خود کو علاحدہ کر کے اپنی نئی پہچان کے لیے کوشاں تھی۔ سلام بن رزاق، شوکت حیات، حسین الحق اور بہت سارے اس زمانے کے نئے لکھنے والے اولاً جدید حلقے میں شامل ہوئے مگر پھر ایک وقفے کے بعد اس سے الگ پہچان کے تمنائی ہوئے۔ شوکت حیات تو مرتے دم تک ''سن ستری'' کی عمومی پہچان کے لیے کوشاں رہے۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ''اکیسویں صدی میں اردو افسانہ: بہار کے پس منظر میں'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ اپنے مضمون میں موصوف لکھتے ہیں: ''صدی کا بدلنا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اس صدی کے موضوعات گذشتہ صدی سے بالکل مختلف تھے، لیکن گذشتہ صدی کے آخری چند برسوں میں وقوع پذیر ہونے والے بڑے واقعات وحادثات کا اثر واضح طور پر نئی صدی پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔''

''افسانوی ادب کا ایک روشن ستارہ: عطیہ پروین'' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان کا ایک مضمون ''ثالث'' کے اس شمارہ میں شامل ہے۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں:



''ان کا اصلی نام سیدہ امت الزہرا اور قلمی نام عطیہ پروین ہے اور اسی نام سے وہ برصغیر ہند و پاک کے افسانوی ادب میں مشہور و معروف رہی ہیں۔ ضلع ہردوئی کا قصبہ بلگرام عرصہ دراز سے مردم خیز رہا ہے۔ اس سرزمین میں ملک کی کئی اہم ادبی، مذہبی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے جنم لیا۔ یہاں کی کئی نابغۂ روزگار اور عظیم المرتبت ہستیوں کی مختلف میدانوں میں اعلیٰ وارفع خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عطیہ پروین کی ولادت بھی ایک سادات گھرانے میں، اسی قصبے بلگرام میں ہوئی۔''

ڈاکٹر ارشد رضا نے ''اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد'' کے عنوان سے اپنا بہترین مضمون لکھا ہے۔ اپنے مضمون میں انہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد اردو افسانہ کے عروج وزوال پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اردو افسانہ بیسویں صدی کے آغاز کی پیداوار ہے۔ لیکن افسانے کے ارتقاء کی تاریخ کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ کون سا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک پریم چند کا افسانہ ''دنیا کا انمول رتن'' کو اولین افسانہ سمجھا گیا۔ بعض لوگ سرسید کے ''گزرا ہوا زمانہ'' کو پہلا افسانہ مانتے ہیں۔ احتشام حسین اور دوسرے لوگ سجاد حیدر یلدرم کے افسانہ ''نشے کی پہلی ترنگ'' کو پہلا افسانہ مانتے ہیں۔

ڈاکٹر جگ موہن سنگھ نے ''پاکستان کے ماہر فن کار: محمد نعیم یاد'' پر قلم فرسائی کی ہے۔ محمد نعیم یاد کے سلسلے میں موصوف لکھتے ہیں کہ محمد نعیم یاد پاکستان کے نئے لیکن معتبر افسانہ نگار، شاعر اور مصور کی حیثیت اے اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ شعر وادب کے علاوہ انہیں انسانیت اور انسانی قدروں سے بھی عشق ہے۔ اپنی شاعری میں وہ جدید ترین افکار وخیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن افسانوں میں اپنے آس پاس کے ماحول اور معاشرہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہیں مذہب اور اخلاقیات سے بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ابھی حال ہی میں خط ثلث، خط دیوانی اور خط النسخ میں کلام پاک کا نسخہ ۵۰ دن میں تیار کر کے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ محمد نعیم یاد سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ سیاسی اور سماجی آلودگی سے خود کو دور رکھتے ہیں۔

''ثالث'' ادب کی معتبر آواز'' کے عنوان سے نیاز اختر نے ایک مضمون تخلیق کیا ہے۔ اس کے بعد سلور جوبلی نمبر کے افسانوں کے تحت ''منتظر آنکھیں''(ڈاکٹر شاہد جمیل)،''ایک تھا بادشاہ''(پروفیسر اسلم جمشید پوری)،''بے چہرگی''(ڈاکٹر نگہت نسیم)،''ماموں میاں کا گھرانہ''(امین صدر الدین بھایانی)،''نور گل کے حصے کی قیامت''(اسحاق وردگ)،''بازگشت''(شاہد اختر)،''نقب زن''(فرحین چودھری)،''بے نشاں''(انجم قدوائی) اور ''ٹھوکر''(نسترن احسن فتیحی) افسانے شامل ہیں۔

ثالث پر مشاہیر ادب کے ذریعہ تحریر کئے تبصرے بھی اس سلور جوبلی نمبر میں شامل ہیں۔ ان تبصروں میں ڈاکٹر شاہد جمیل، عشرت ظہیر، سلیم انصاری، ڈاکٹر احسان عالم، رفیع حیدر انجم، فخر الدین عارفی، کامران غنی صبا، ڈاکٹر احسان تابش، صابر رضا رہبر، ڈاکٹر شاذیہ کمال، ڈاکٹر وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر خالدہ ناز،

مظفر نازنین، محمد مرشد، ڈاکٹر توصیف احمد ڈار، ڈاکٹر آفتاب عالم اطہر گیاوی، شبنم پروین، محمد معتصم باللہ، محمد ولی اللہ قادری اور جرنلسٹ اقبال کے تبصرے شامل اشاعت ہیں۔ دیگر تبصروں میں ''آبیاژہ (غضنفر کے ناول) (مبصر اقبال حسن آزاد)، دربھنگہ ٹائمز (مبصر اقبال حسن آزاد)، سب رنگ (اقبال حسن آزاد) تیرہ افسانے (اقبال حسن آزاد)، شفیع مشہدی کے افسانے (مبصر پروفیسر منظر اعجاز)، جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی (مبصر ڈاکٹر توصیف بریلوی)، معاصر اردو افسانہ: فکری جہات اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (مبصر ڈاکٹر منصور خوشتر)، محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم (مبصر بینام گیلانی) وغیرہ شامل ہیں۔

مکتوبات کے تحت ضیاء فاروقی، شبیر احمد، مرغوب اثر فاطمی، اصغر شمیم، معتصم باللہ، نوشاد احمد کریمی، ابرار رحمانی، ڈاکٹر احسان تابش، اویناش امن کے خطوط شامل ہیں۔

اس طرح ''ثالث'' کا افسانہ نمبر اور سلور جوبلی نمبر یقینی طور پر دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے لئے اقبال حسن آزاد صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان کی جفشی پذیرائی ہو کم ہے۔ اخیر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے۔

◀◀ ● ▶▶

**● ڈاکٹر اسلم جمشیدپوری، میرٹھ**

ثالث، مونگیر سے شایع ہونے والا ایسا رسالہ ہے، جو اپنے خاص شماروں کے لئے مشہور ہے۔ خاص کر اس رسالے نے اردو فکشن کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ویسے آج کے زمانے میں اردو رسالہ مسلسل نکالنا، جوئے شیر نکالنے سے کم نہیں۔ اردو والے رسالہ خرید کر پڑھنے میں کم یقین رکھتے ہیں۔ تحفتاً کتاب یا رسالہ لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں بغیر سرکاری امداد کے رسالہ نکالنے والوں کو میں سلام کرتا ہوں۔

ثالث، نے اپنے خاص نمبروں سے ہمیشہ چونکایا ہے۔ اس کے مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد اس بار ایک مشترکہ شمارہ (۲۳ تا ۲۶) لے کر آئے ہیں۔ یہ شمارہ 664 صفحات پر مشتمل ہے۔ اور یہ شمارہ افسانے پر ہے۔ یہ شمارہ پورے عالم کے اردو افسانے کی سمت و رفتار بتاتا ہے۔ اس میں افسانہ نگاری، اس کے فن مختلف افسانہ نگاروں کی افسانوی فن اور تجزیوں اور افسانوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ مضامین، تجزیے اور افسانے عالمی سطح پر افسانے کے عصری منظر نامے کو پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک طرف اکیسویں صدی کے افسانوں کا دستاویز ہیں تو دوسری طرف اردو افسانے کے مستقبل کا بھی ضامن۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ شمارہ کافی انتظار کے بعد مشترکہ شمارے کی شکل میں آیا ہے۔ لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ دیر آید درست آید، کے مصداق اپنی پیش کش، مواد، خوبصورتی کے معیار کے لحاظ سے اپنے ہم عصر کسی بھی رسالے سے بہتر ہے۔ اس شمارے کے تخلیق کاروں کو بے حد مبارک باد۔ سب زیادہ مبارکباد



کے مستحق جناب اقبال حسن آزاد ہیں، جنہوں نے اس شمع کو نہ صرف روشن رکھا ہے بلکہ ہر آنے والے شمارے کو نئی چمک اور آب وتاب عطا کرتے ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ آمین۔

◀◀ ● ▶▶

**● ڈاکٹر عرفان رشید، کشمیر**

اردو ادب کی ترقی واشاعت میں رسائل وجرائد کا اہم رول ہے جس کو رائیگاں نہیں کیا جاسکتا۔ انہی رسائل و جرائد کی بدولت آفاقی ادب پروان چڑھتا گیا۔ انہوں نے کبھی رومانیت اور حقیقت کے گیت گائے، کبھی ترقی پسند تحریک کے سکہ بند اصولوں کی پیروی کی، تو کبھی جدیدیت کی فیشن پرستی کو من وعن تسلیم کیا۔ اس طرح سے انہوں نے کبھی مواد تو کبھی فارم کا ڈھنڈورا پیٹا۔ لیکن حقیقت کچھ اور بھی ہے کیوں کہ یہی ایک آلہ ہے جس کی بدولت ادیب اور قاری روبرو ہوتے ہیں۔ ادب کو پروموٹ کرنے کا صحیح وسیلہ یہی رسالے ہیں۔ زیر تبصرہ رسالہ عصر حاضر کا نمایاں رسالہ ہے جس نے اپنا سفر ۲۰۱۳ء میں شروع کیا ہے۔ اس رسالے نے کچھ ہی مدت میں ایک مقام بنایا ہے جس کی وجہ سے اسے یو جی سی کیر لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔ اس رسالے کا مدیر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد ہے جو بیک وقت افسانہ نگار، شاعر، صحافی اور ایک بہترین ترجمہ کار کی حیثیت سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کا یہ تازہ شمارہ ''عالمی افسانہ نمبر'' پر مبنی ہے۔ زیر بحث شمارہ ۶۶۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالہ جلد ۱۰۔۸ جون۔جلائی ۲۰۲۳ء، شمارہ ۲۶۔۲۳ کے تحت حال ہی میں چھپ کر آیا ہے۔ اس شمارے میں برصغیر کے ممتاز افسانہ نگاروں کی نگارشات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ نگاروں پر بہترین افسانے لکھے گئے ہیں۔ اردو ادب کی تازہ شدہ تصانیف پر تبصرے بھی شامل ہیں۔

زیر بحث شمارہ اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ یہ شمارہ خاص طور پر ان ریسرچ اسکالر کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا جو اردو افسانے پر کام کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعا گو ہیں کہ یہ رسالہ ہمیشہ اردو ادب کو زندہ اور متحرک بنانے میں کوشاں رہے۔ آمین

◀◀ ● ▶▶

کتابی سلسلہ استفسار (جے پور)

جنوری۔جون ۲۰۲۳ء

بیاد: نیر مسعود

مدیران: شین کاف نظام، عادل رضا منصوری

# مکتوبات

- عالمی افسانہ نمبر رسلور جوبلی نمبر موصول ہو گیا تھا۔لیکن کچھ گھریلو ذمہ داریوں اور دیگر ادبی و نیم ادبی مصروفیات ے سبب فوری جواب نہ دے سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔
''ثالث'' شمارہ اول ہی سے ایک ممتاز ومنفرد مقام رکھتا ہے جس کے مشمولات یقیناً قارئین کی بصیرت میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔زیرنظر شمارہ بھی جہاں آپ کی غیر معمولی محنت اور ذہانت کا ثبوت ہے وہیں یہ عالمیا فسانہ نمبر،افسانہ نویسی پر ایک مکمل دستاویز ہے جو آئندہ افسانہ پر کام کرنے والوں کے لیجو الے کا کام کرے گا۔
ارشد وبدالحمید،خالد سعید،مکرم نیاز،ڈاکٹر ریاض توحیدی،سیدہ آیت گیلانی،ثمینہ سید ،نوشی قیصر،ساجد ہدایت اور عظیم اللہ ہاشمی نے اپنے موضوع کے تحت بحث کرتے ہوئے افسانوی ادب کو جس نئی جہت سے ہمکنار کیا ہے وہ ان ادباء کی تنقیدی بصیرت اور جوہر شناسی کی دلیل ہے۔فن افسانہ کے حوالے سے آپ نے ''چند اہم باتیں'' کے عنوان سے جو گفتگو کی ہے وہ بھی یقیناً نہایت اہم اور کارآمد ہے اور قاری کو سوچ اور فکر کی دعوت دیتی ہے اور یہ نئے افسانہ نگاروں کے لیے چراغ راہ کا کام کرے گی۔
آپ کے انتخاب کی بھی داد دینی پڑے گی کیونکہ جو افسانے اس نمبر میں شامل کیے گئے ہیں وہ عمدہ اور دلچسپ ہیں جن میں بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی ،دیہات اور قصبوں کی معصومانہ تہذیب کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی ہمارے افسانہ نگار کرتے نظر آرہے ہیں جو سبھی فکری اور فنی اعتبار سے بھی انفرادیت کے حامل ہیں۔
افسانوی نشست 2021 کی مکمل فہرست اور خطبۂ صدارت قارئین کے لیے بھی حوصلہ افزا ہیں کہ مشاعروں کی طرح افسانہ نویسی پر بھی نشستیں کی جا سکتی ہیں ۔میرے شہر غازی آباد میں ''کتھارنگ'' کے عنوان سے ہر ماہ ایک نشست ہوتی ہے



جس میں کہانیاں پڑھی جاتی ہیں اور یہ بے حد کامیاب ہے۔
''شوکت حیات نمبر'' پر ہمارے دانشوروں نے جو جامع تبصرے کیے ہیں وہ بھی ان کے مخصوص نظریہ اور ان کی فن پر سنجیدہ اور معلوماتی گفتگو قاری کے لیے اہم ہے۔
ڈاکٹر ذکی طارق (غازی آباد، یوپی، انڈیا)

◂◂ ● ▸▸

- ادبی مجلّہ ''ثالث'' کا تازہ ترین شمارہ جولائی ۲۰۲۲ تا جون ۲۰۲۳ موصول ہوا۔ رسالہ کی ورق گرانی سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ثالث کے اس ضخیم عالمی افسانہ اور سلور جوبلی نمبر میں شامل ہر تحریر اقبال حسن آزاد کی محنتوں اور کاوشوں کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ ثالث نے ادبی صحافت میں اپنا ایک معیار اور وقار قائم کیا ہے۔اقبال حسن آزاد صاحب کی مدبرانہ صلاحیتوں پر اردو پڑھنے لکھنے والوں کو ناز ہے۔اِس موقر اور ضخیم شمارہ میں احقیر کے مضمون بعنوان ''پاکستان کے ماہر فن قلم کار: محمد نعیم یاد'' کو بھی زینت بخشی گئی ہے۔جس کے لیے میں ادارہ ثالث کا بے حد ممنون ہوں۔ ڈاکٹر جگ موہن سنگھ (جموں)

◂◂ ● ▸▸

- قابل احترام اقبال حسن آزاد صاحب (انڈیا) کی زیر ادارت شائع ہونے والے ادبی میگزین 'ثالث' کے عالمی افسانہ نمبر/ سلور جوبلی نمبر کا پاکستان سے اجرا اس لیے خوش آئند ہے کہ ایک ضخیم تاریخی دستاویز کتابی صورت میں ہمارے پاس آ چکی ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک بذریعہ کراچی ہم تک پہنچ جایا کرتا تھا مگر پھر ہم نے آن لائن ہی استفادہ کیا۔ اتنے اہم اور تاریخی نمبر میں میرا افسانہ 'دنانیر بلوچ' شامل کرنے کے لیے ثالث انتظامیہ کی سپاس گذار ہوں۔ فارحہ ارشد (پاکستان)

◂◂ ● ▸▸